قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق

مشاہدات عرفانی

جلد اوّل

یعنی

حضرت والد صاحب قبلہ شیخ یعقوب علی تراب احمدی عرفانی کا سیاحت نامہ یورپ و بلاد اسلامیہ

جسکو

خاکسار ابو الخیر محمود احمد (مجاہد مصری) ناظم ادارہ احمدیہ بکڈپو قادیان دار الامان نے
انقلاب سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر تراب منزل قادیان سے شایع کیا

بار اوّل ۔۔۔ قیمت فی جلد ۔۔۔ عہ

خاکسار عرفانی کا قادیان سے لندن کا رستہ
(نوٹ) (۱) خشکی کے رستہ کی علامت
(۲) بحری رستہ کی علامت
شمال
مغرب
مشرق
جنوب
پیرس
فرانس
بحیرہ روم
یونان
دمشق
عراق عرب
افغانستان
ایران
بلوچستان
عرب
مصر
مدینہ
مکہ
عدن
قادیان
دہلی
ہندوستان
بمبئی
بحیرہ عرب
بحر ہند
افریقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

عرضِ حال

میں جب یورپ اور بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے لئے نکلا تھا۔ تو میرے خیال میں کسی سفرنامہ کی ترتیب تک بھی نہ تھی۔۔۔ بلکہ میں خاموشی کے ساتھ دیکھنا اور سوچنا چاہتا تھا۔ البتہ یہ خیال تھا۔ کہ اپنے سفر کے نتائج کو میں اکابرانِ ملت کے غور و فکر کیلئے ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کر دوں۔ لیکن جبکہ میں لنڈن میں تھا تو میں نے قاضی اکمل صاحب کو ایک پرائیویٹ خط لکھا جس کے بعض پیراگراف انہوں نے ریویو میں اشاعت کے لئے دیدیئے اس کو دیکھ کر مجھے ندامت اور شرم دامنگیر ہوئی۔ کہ میں اپنی سیاحت کے حالات کو پبلک نہیں کرتا۔ اور دماغی تعیش میں مبتلا ہوں۔ اسکے بعد میں نے مشاہداتِ عرفانی کے عنوان سے الفضل میں اور "دانشمند مشرق مغرب میں" کے عنوان سے ریویو میں اور سیاحتِ عرفانی کے عنوان سے پیسہ اخبار میں۔ اور مختلف عنوانات سے جرائد ایران میں ایک سلسلہ لکھا۔ جنکو بہت ہی پسند کیا گیا۔ اور مجھے متواتر خطوط پہنچے۔ کہ کتابی صورت میں شائع ہوں۔ واپس آکر میں نے مناسب سمجھا۔ کہ اپنے مشاہدات کو پبلک کر دوں۔ یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلہ میں دو یا تین جلدیں انشاء اللہ ادا ہونگی جن میں سے ایک مخصوص بلادِ اسلامیہ پر ہوگی۔ اور ایک مخصوص لنڈن پر اور ایک دیگر بلادِ یورپ پر۔ یہ میری سرسری تقسیم ہے بہت ممکن ہے کہ لنڈن اور بلادِ یورپ کی ایک ہی جلد ہو۔ بہرحال خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں پہلی جلد شائع کرنے کے قابل ہوتا ہوں میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میری یہ کوشش پسند کیجائیگی یا نہیں لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے اپنے نقطۂ خیال سے اپنے مشاہدات کو لکھا ہے۔ غور اور فکر سے اسمیں بہت کچھ ملیگا۔ ایک مقصد ہے جسکو زیرِ نظر رکھکر میں نے اسے ترتیب دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کتاب میں فوٹوز کا انتظام کر سکوں۔ ابھی تک میں اس قابل نہیں ہوا۔ لیکن اگر احباب نے قدر کی۔ تو ممکن ہے آئندہ یہ موقعہ مل جائیگا۔ گو دوسرے حصص کی اشاعت مادی اسباب کے نقطۂ خیال سے احباب کی توجہ اور مساعدت پر موقوف ہے۔ لیکن اصل چیز خدا تعالیٰ کی تائید اور توفیق ہے اور میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں کہ جس نے میرے جیسے ایک ہیچمیرز انسان کو اتنے بڑے سفر کا موقعہ اور توفیق دی وہ اس سفر کے حالات کی اشاعت کے سامان بھی پیدا کر دیگا۔ اور یہ امر اللہ تعالیٰ کے فضل کے سامنے مشکل نہیں۔

یہ کتاب بعجلت لکھی گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسمیں بہت سے نقص اور اغلاط رہ گئے ہیں۔ لیکن اپنے دوستوں سے میں توقع کرتا ہوں کہ وہ نقص مضمون اور مقصدِ اشاعت کو مدِ نظر رکھیں گے اور ہر طرح اسکی اشاعت میں کوشش۔ والسلام

کنجِ عافیت واقعہ تراب منزل قادیان دار الامان ۲۰ دسمبر ۲۴ء

بنی نوع انسان کا ادنیٰ خدمتگذار خاکسار یعقوب علی عرفانی ایڈیٹر الحکم

حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی
سیاح یورپ و بلادِ اسلامیہ

Lion Press, Lahore

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشاہدات عرفانی

(میرا سفر یورپ و بلاد اسلامیہ)

۱۹۵۸ء میں مجھ کو یورپ اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا خیال پیدا ہوا میں ان ایام میں امرتسر میں مقیم تھا۔ اور اخبار نویسی کو ایک مستقل شغل کے طور پر شروع کر چکا تھا۔ اگرچہ ان ایام میں اخراجات کے لحاظ سے سفر نہایت آسان تھا مگر میرے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ میں اس قدر لمبے سفر پر نکل سکوں۔ ایک دوست نے جو ان ایام میں عازم مصر ہو چکے تھے بجد اصرار کیا۔ کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ اور اخراجات سفر کے لئے جو تجویز انہوں نے پیش کی وہ عملی اور سود مند تھی مگر میں نے اس وقت اپنے ارادہ کو کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کر دیا۔ ہاں مجھے یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں اپنے ارادہ کو پورا ہوتا ہوا دیکھ لوں گا۔ اس وقت کے التوا نے بعد میں مجھ کو بعید روحانی و ایمانی برکات سے مالا مال کیا۔ اور اب میں سمجھتا ہوں۔ کہ اگر اس وقت میں اس سفر کیلئے نکل کھڑا ہوتا۔ تو ان برکات سے محروم رہ جاتا۔

۱۸۹۶ء کے آخیر میں میری شادی ہوگئی۔ اور اکتوبر ۱۸۹۷ء میں میں نے الحکم جاری کیا اور اسی اکتوبر میں خدا تعالےٰ نے مجھے پلوٹھا بیٹا محمود احمد سلمہ اللہ الاحد عطا فرمایا۔ اور ۱۸۹۸ء کے آغاز میں میں ہجرت کرکے قادیان چلا گیا۔ اور قادیان کی اقامت اور سکونت نے جن **برکات** کا مجھے وارث کیا میرے قلم زبان اور زبانِ قلم میں طاقت نہیں کہ بیان کرسکوں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھ کو وہ کچھ دیا۔ جب کا میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فالحمدُ للہِ علےٰ ذالِکَ۔

الحکم جو سلسلہ کا سب سے پہلا خادم ہے۔ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا کہ مجھ کو **عربی** زبان میں اخبار جاری کرنے کا خیال آیا۔ اور پرانے شوق نے پھر گدگدی کی اور میں نے **البشریٰ** کے نام سے ایک اعلان کیا۔ اور اس میں مصر اور دیگر **بلادِ اسلامیہ** کی سیاحت کے خیال کا اظہار کیا۔ مگر اب میں **یقین** کرتا ہوں کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ مجھ کو خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیات میں قادیان رہنے کی **عزت** اور شرف عطا کرنا تھا۔ جو میری اخلاقی اور روحانی تکمیل کے لئے ازبس ضروری تھا۔ انہی ایام میں اخبار **وطن** لاہور کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں صاحب نے (جو میرے قیام امرتسر کے زمانہ کے بے تکلف دوست تھے۔ جبکہ وہ اخبار وکیل کے ایڈیٹر تھے) **وطن** میں ایک **وظایف فنڈ** جاری کیا جس سے وہ **مصر** میں جانے کے لئے بھی وظائف دیتے تھے میں نے ان سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ **وظیفہ** ہم ضرور دیدیں گے مگر میری دوستانہ رائے یہ ہے کہ آپ کسی انجمن کے وظیفہ پر نہ جائیں۔ جب جائیں تو اپنے خرچ پر جائیں۔ مجھ کو ان کا مشورہ بہت پسند آیا۔ اور میں نے اپنے ارادہ کو پھر کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کردیا۔ اگرچہ اس وقت الحکم کی ایسی حالت تھی۔ کہ وہ میرے اخراجات سفر نکال سکتا تھا لیکن **مصلحت** ازلی نے مجھے موقعہ نہ دیا۔ آخر ۱۹۰۸ء کا سال آگیا۔ جو سلسلہ میں ایک **انقلاب** پیدا کرنے والا تھا۔ حضرت **مسیح موعود** علیہ السلام کا وصال ہوگیا۔ اور سلسلہ **نبوت** سلسلہ خلافت میں تبدیل ہوگیا۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا **نورالدین** خلیفہ **اوّل** ہوئے رضی اللہ عنہ ان کے عصر خلافت میں کارخانہ الحکم پر مالی ابتلا آیا۔ اور بہت سخت آیا۔ قریباً **بارہ ہزار** روپیہ کے اس کو مختلف صورتوں میں

نقصان اور خسارہ ہوا۔ یہ بہت بڑا ابتلا تھا جو مجھ پر اور میرے متعلقین پر آیا۔ ایک طرف کنبہ بہت بڑا ہو گیا۔ دوسری طرف زیرباری اتنی بڑی کہ کوئی صورت اس سے عہدہ برا ہونے کی بظاہر نظر نہ آتی تھی لیکن میں اس امر کا اظہار تحدیث بالنعمتہ کے طور پر کرتا ہوں۔ اور میرے دوست واحباب اور قادیان کے اس وقت کے رہنے والے جانتے ہیں۔ کہ ان مصائب اور مشکلات کی وجہ سے نہ تو میرا حوصلہ پست ہوا۔ اور نہ میں رنج وغم کا شکار ہوا۔ قلب میں ایک سکینت تھی۔ جو ہر وقت خوش رکھتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں حضرت اولوالعزم عازم حج و مصر ہوئے۔ اور میرے دیرینہ جوش میں پھر ایک تحریک ہوئی۔ اور میں مصر اور بلاد اسلامیہ کے لئے تیار ہو گیا۔ بلکہ اخبار میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔ میری حالت اس وقت ایسی تھی۔ کہ چہ خور د بامداد فرزندم کا معاملہ تھا۔ اور دوسری طرف اتنے بڑے سفر کا عازم۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت بھی مجھے یقین تھا۔ کہ میں اگر جاؤں گا۔ تو سامان سفر ضرور ہو جائے گا۔ یہ یقین اس قدر مضبوط اور قوی تھا کہ مجھی ذرا بھی تردد نہ تھا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے میں نے استصواب کیا۔ اور اجازت چاہی۔ آپ نے ایسے قیود کے ساتھ اجازت کو مشروط کیا۔ کہ میں چل ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اوّل مدیون کا فیصلہ کرو۔ اخبار غیر حاضری میں باقاعدہ جاری رہے۔ اس کا انتظام کرو۔ بیوی بچوں کے اخراجات کا انتظام ہو۔ اس کے بعد حضرت اولوالعزم کے ہمراہ چلے جاؤ میں نے ان شرائط اور قیود کو دیکھا۔ اور اپنے سفر کے لائحہ پر نظر کی۔ اور یہ کہکر بیٹھ گیا۔

عرفت ربی بفسخ العزائم

مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرے سفر کا ابھی وقت نہیں۔ اور بعد کے واقعات نے بتایا کہ فی الحقیقت وہ وقت نہ تھا غرض حضرت اولوالعزم اپنے سفر پر گئے۔ اور واپس آئے۔ اور میں دیکھتا رہ گیا۔ لیکن بایں مجھے یقین تھا۔ کہ میں جاؤں گا۔ اور اللہ تعالے مجھے موقعہ دے گا۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت ختم ہو گیا۔ اور آپ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ حضرت اولوالعزم خلیفہ ہوئے۔ اور جماعت میں ایک نیا انقلاب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے

اپنے فضل سے اس انقلاب کے وقت مجھے متزلزل نہ ہونے دیا۔ اور نہ ثابت قدم رکھا۔ اور اپنے محض فضل سے خدمت کا موقعہ دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ؛

مالی مشکلات اس وقت تک حد سے گذر چکے تھے۔ لیکن میں سمجھتا اور یقین کرتا تھا۔ کہ

اب نصرت الٰہی قریب ہے

چنانچہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل اور رحم سے ہاں محض رحم سے حضرت اولوالعزم کی دعاؤں کے طفیل ایسے سامان پیدا کر دئے۔ کہ ایک مفلس کو حلال اور طیّب رزق دیکر ہاں مِن حیث لا یحتسب دیکر غنی کر دیا۔ اور اس کو اس پہلو سے ایک اور ابتلا میں ڈالا۔ اور آپ ہی بچا لیا۔ مال کی محبت کو مفلسی کے ایام میں سلب ہی کر دیا تھا۔ اور اب ملا تو اس کا کچھ بھی اثر طبیعت پر نہ تھا۔ غرض میں ان مشکلات سے نکل گیا۔ اور اب پھر وہ پرانا جنون سر پر سوار ہوا مگر ایسے طور پر کہ ایک دھیما سا خیال آتا تھا بالآخر ۱۹۲۲ء میں عزیز محمود احمد سلمہ اللہ الاحد کو مصر جانے کا حکم ملا۔ اب خدا تعالیٰ نے مجھے موقعہ اور سامان دیا تھا۔ کہ میں اسکو روانہ کر سکوں۔ چنانچہ میں نے اس کو بھجوا دیا اور خیال کیا کہ

پدر نتواند پسر تمام کند

مگر بایں مجھے یقین تھا۔ کہ نہیں مجھے خود جانا ہوگا۔ چنانچہ وہ وقت آگیا ۱۹۲۴ء میں لنڈن میں ایک مذہبی کانفرنس کی بنیاد پڑی۔ اور اس میں حضرت خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ بھی مدعو ہوئے۔ جماعت میں یہ سوال ایک معرکہ کا سوال تھا۔ حضرت اولوالعزم نے حسب معمول مشورہ کیا۔ مقامی اور بیرونی احباب سے مشورہ لیا گیا۔ میں خود اوّلاً اسی فریق کا گویا لیڈر تھا۔ جو حضرت اولوالعزم کے اس سفر لنڈن کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ حضرت صاحب کو یہ سفر نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اہمیت میری نظر میں خفیق تھی سلسلہ کی مرکزی ضروریات اور حضرت کی موجودگی اور سلسلہ کی مالی حالت کو مدنظر رکھ کر اس کے خلاف رائے رکھتا تھا۔ مگر میں یہ تسلیم کرتا تھا۔ کہ حضرت کو ایک سفر ان ممالک کا کرنا چاہئے۔ جہاں تبلیغ و اشاعت کے بڑے بڑے مرکز آپ کو قائم کرنا ہے اور میں اس سفر کو اپنے خیال میں قبل از وقت کہتا تھا۔ خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ حضرت خلیفہ

ثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز بھی اوّلاً بعض مالی مشکلات اور حالات کے ماتحت باوجود اس سفر کی اہمیت کے اسی طرف مائل تھے لیکن بعد میں جماعت کی عام رائے نے بدلدیا اور میں خود بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوا۔ اور احباب نے حضور کے خدام سفر میں اس خاکسار کو بھی بحیثیت جوائنٹ سیکرٹری منتخب کیا فالحمد للہ علےٰ ذالک۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ یورپ اور بلاد اسلامیہ کا سفر کر لیتا۔ تو میں اس عزت اور مقام کو نہ پا سکتا۔ اس سفر کا تمام حصہ ثواب اور ایک اجر عظیم اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ محض خدا تعالیٰ کا نام بلند کرنے کے لئے تھا۔ اور لاکھوں انسانوں کی دعائیں ساتھ تھیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ارادہ سفر کو اس وقت تک ملتوی ہونے دیا تا کہ میں اس کے فضل کو پا سکوں ثم الحمد للہ علیٰ ذالک۔

غرض وہ سفر نومبر ۱۹۲۴ء میں ختم ہو گیا۔ اور مصر اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت بھی ایک حد تک ہو گئی۔ لنڈن سے واپسی کے وقت میرے دل میں خیال تھا۔ کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ شرف مجھے بخشا لیکن ایک مرتبہ خود آکر بھی آزادی اور فرصت سے ان ملکوں کو دیکھنا چاہئے۔ اور میرا وہ یقین بدستور قائم تھا۔ کہ میں ضرور آؤں گا۔ چنانچہ میرے احباب سفر جانتے ہیں۔ اور لنڈن کے بعض احباب کو بھی معلوم ہے۔ کہ میں ان سے کہہ گیا تھا۔ کہ اگلے سال انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔

وطن پہنچکر پھر وہی کاروبار کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور مالی مشکلات پیدا ہو گئے۔ اپنی حالت تو یہ ہے کہ

قرار در کف آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

باوجود اس حالت کے بھی سفر جا سکنے کا یقین تھا۔ میرے بمبئی کے ایک نہایت ہی معزز اور سلسلہ میں تیس برس کے رفیق نے بمبئی پہنچتے ہی اپنے کسی بھی خیال کے اظہار کے باوجود کہا کہ تم کو واپس جانا ہو گا۔ مجھے تو یقین تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس سفر کے سامان غیب سے کرنے ہیں۔ اس لئے میں نے اس کو ربانی تحریک سمجھا۔ اور منظور کر لیا۔ لیکن بعد میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے

اسکو مئی سے اکتوبر پر ملتوی کرنے کی تحریک کی بلکہ میں اس سے قطعی ناواقف تھا کہ خدا تعالیٰ نے میرے لئے اس سال ہی یہ سفر مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ کچھ ایسے سامان ہوئے کہ میرے وہم وگمان سے بالاتر ہے۔ اور میں پھر ۲۰ جون ۱۹۲۵ء کو یورپ روانہ ہو گیا فالحمد للہ علیٰ ذالک۔*

اب میں لنڈن ہی میں بیٹھ کر آج (۱۰ فروری ۱۹۲۶ء) اس سفر کے حالات قلمبند کرنے کا عزم کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

میں اس سفرنامہ میں اپنے مشاہدات اور خیالات کا اظہار کروں گا۔ اسکو اس سفرنامہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جو حضرت خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے ساتھ میں نے گذشتہ سال کیا ہے۔ وہ الگ چیز ہے میں نے کوشش کی ہے۔ کہ میں اپنے مشاہدات کو ان نتائج کے ساتھ جو میرے خیال میں آئے پیش کر دوں۔ اگرچہ یہ تاریخ وار قلمبند کیا گیا ہے مگر اسکو محض ڈائری ہی نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال جو کچھ میری سمجھ میں آیا۔ اور جو کچھ میں نے دیکھا اسے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سمجھ کر پیش کر دیا ہے میں اپنی ذات کے لئے اس سفر کو چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایک نشانِ رحمت سمجھتا ہوں۔ اس لئے بھی میں نے ضروری سمجھا۔ کہ میں اسکو حوالہ قلم وکاغذ کر دوں۔

آغاز کردہ ام تو رسانی بہ انتہا

گنج عافیت

واقع تراب منزل قادیان دارالامان

۳۰ نومبر ۱۹۲۶ء

عرفانی

* نوٹ۔ میں نے عطیات کے نام کا ایک ماہوار رسالہ قادیان سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور اسکے ایک حصہ میں مشاہدات کے مسلسل چھاپنے کا ارادہ تھا لیکن وہ رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ اور اب میں قادیان دارالامان میں آکر اسکو لکھ رہا ہوں۔

(عرفانی)

۱۱ جون ۱۹۲۵ء روانگی از قادیان (یوم جمعرات)

میری روانگی یکایک ہوئی ہیں نے ۱۰ جون ۱۹۲۵ء کو حضرت اولوالعزم سے ملاقات کی۔ اور حالات عرض کئے۔ میرے لئے یہ ایام مختلف قسم کے ہموم و غموم کے ایام تھے۔ اور میں انہیں ایام ابتلا سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا یقین تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان ایام ابتلا کو اپنے فضل سے جلد یا بدیر تبدیل کر دے گا۔ حضرت کے حضور میری پہلی درخواست کسی وجہ سے نہ پہنچ سکی۔ دوبارہ عرض کرنے پر حضور نے فوراً حاضری کا موقعہ دیا۔ اور اپنے فطرتی رحم اور توجہ سے میری گذارش کو سنا مجھ کو وہ وقت کبھی نہیں بھولیگا جب کہ میں اس کمرہ میں آپ کے سامنے باچشم گریاں بیٹھا تھا۔ جہاں حضرت مخدوم الملتہ مولانا عبد الکریم رضی اللہ عنہ رہا کرتے تھے میرا دل چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں مگر ایکدوسرے شخص کی موجودگی نے مجھے روکا۔ تاہم میں ضبط نہ کرسکا۔ کچھ کہا اور کچھ پی گیا میں نے عرض کیا کہ دل میں مال و دولت کی محبت نہیں اور قادیان کی فاقہ کشی میں بھی راحت معلوم ہوتی ہے۔

لیکن جب سلسلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے تحریک ہوتی ہے۔ تو پاس نہ ہونے کی صورت میں دل میں درد پیدا ہوتا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کوئی موقعہ دیدے۔ غرض عرض حال کے بعد آپ کی دعا لیکر گھر آیا۔ اور زاد راہ کا جو روپیہ تھا۔ وہ خرچ کر چکا تھا۔ اس لئے کہ ایک دوسری جگہ سے مجھے روپیہ مل جانے کی توقع تھی۔ جب اُدھر سے مایوسی ہوئی۔ تو پھر حضرت کو لکھا۔ آپ نے ازراہ کرم میرے اس عارضی سفر کے لئے جو میں اس وقت ایکہفتہ کا سمجھتا تھا زاد راہ بھیجدیا۔

گھر والے سب میرے گرد جمع تھے۔ اور مختلف خیالات اور جذبات کے ساتھ وہ مجھے اور میں انکو دیکھتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی نہایت ہی مخلصہ رفیق اور غمگسار بیوی کو جسکو میں ہمیشہ اپنی محسنہ سمجھتا ہوں) اپنی وصیّت کے کاغذات حوالے کئے۔ اور چند ضروری اور وقتی ہدایات دیں۔ بچوں کو محبت اور پیار کے جذبات کے ساتھ دیدہ بوسی کی۔ بڑوں کو سلسلہ کی اہمیت اسکی صداقت اس کے ساتھ پوری وابستگی اور اخلاص و

قربانی کی وصیت کی، اور دل پر ایک قسم کا جبر کرکے نہ تھمنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ اور یکہ پر سوار ہو کر بٹالہ کی طرف روانہ ہو گیا اس سفر میں حیدر آباد تک میرے رفیق سفر مسٹر نور محمد تھے۔ اور امرتسر تک پنڈت موہن لال صاحب (جو عرصہ تیس سال سے باوجود ہندو ہونے کے میرے ساتھ محبت رکھتے ہیں) بھی ساتھ آئے۔

امرتسر سے میں نے سیکنڈ کلاس کی ایک سیٹ ریزرو کرالی تھی۔ اس لئے سفر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی مختلف خیالات اور جذبات کے ہجوم میں ۱۰ بجے رات کے بمبے میل روانہ ہوئی۔ میاں احمد دین صاحب ڈنگوی آخر وقت تک سٹیشن پر موجود رہے اور انکی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا۔ اللہ تعالےٰ انکی جزا ہو۔ بابو رحمت اللہ صاحب (جو امرتسر ہی کے اسٹیشن پر اس وقت مامور تھے) بھی موجود تھے اور انہوں نے نشست وغیرہ کے متعلق مناسب انتظام میں پوری مدد کی فجزاہ اللہ احسن الجزاء

(۱۲-۱۳ جون ۱۹۲۵ء جمعہ)

صبح کو گاڑی دہلی پہونچی۔ اور سارا دن اور رات دوڑتی رہی۔ ۱۳ جون ۱۹۲۵ء (ہفتہ) کو ساڑھے بارہ بجے ہم منماڑ سٹیشن پر پہنچے۔ جہاں سے حیدر آباد کو این جی ریلوے کی ایک شاخ جاتی ہے چنانچہ اس پر سوار ہو کر حیدر آباد کو روانہ ہوا۔ موسم نہایت اچھا اور خوشگوار ہے۔ اگرچہ بارش کا دن نہیں ہے مگر ہوا سرد چلتی ہے۔

انگریزی فیشن کی غلامی

میں جس کمرہ میں سوار تھا اسی راستہ میں ایک سٹیشن پر ایک مجسٹریٹ صاحب علاقہ نظام بھی آکر سوار ہوئے آپ کے ٹھاٹھ اور ساز و سامان کا کیا کہنا۔ پاندان پانی پینے کی صراحی۔ آموں کی ٹوکری کھانے کی ٹوکری۔ لوٹے گلاس۔ ایک دو ہینڈ بیگ اور رائٹنگ کیس۔ غرض ایک اچھا خاصہ سامان آپ کے ساتھ تھا۔ میں اس نقشہ کو بیان نہیں کر سکتا جس آن بان کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ کو رخصت کرنے والے سرکار سرکار کہتے ہوئے منہ

خشک کر رہے تھے۔ غرض جب گاڑی کی روانگی کا وسل ہوا۔ تو سٹیشن پر فرشی سلاموں کا ایک عجیب نظارہ تھا۔ گاڑی تھوڑی دُور چلی ہوگی۔ کہ آپ نے بالوں کی آرائش وغیرہ کا کام شروع کیا۔ میں انکو دیکھتا تھا اور حیرت زدہ ہوکر اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

مختلف قسم کے کنگھے اور برش استعمال کئے گئے۔ اور جب کہیں مانگ پٹی ان کے حسب منشا ہو چکی۔ تو آپ کی جان میں جان آئی۔ اور پھر آپ نے سگار کا ایک بکس نکال کر اسے سلگایا۔ اور نہایت ہی پندارانہ طریق پر اس کے دہوئیں اُڑانے شروع کئے۔ میں ایک درویشانہ رنگ میں بیٹھا ہوا تھا۔ انکو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ بلکہ گونہ بیزاری ہوتی تھی۔ کہ یہ کون ہے۔ جو میری واحدا جارہ داری میں شریک سفر ہو گیا ہے۔ مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ لمبا سفر اور درجہ میں دوسرا آدمی نہیں کہ ان سے باتیں کرتے مجبوراً میری طرف ہی خطاب کرنا پڑا۔

مجسٹریٹ۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

میں۔ حیدرآباد جا رہا ہوں۔

مجسٹریٹ۔ آپ حیدرآبادی تو نہیں معلوم ہوتے؟

میں۔ ہاں مجھے یہ عزت حاصل نہیں ہے۔

مجسٹریٹ۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

میں۔ پنجابی ہوں۔

مجسٹریٹ۔ ہاں میں آپ کی وضع قطع سے ایسا ہی خیال کرتا تھا۔

میں۔ وضع قطع سے بھی کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ مگر اب تو یہ معیار کچھ صحیح نہیں رہا۔ ہم اپنے اصلی لباس اور طریق بود و ماند کو چھوڑ کر یورپ کے فیشن کی غلامی کر رہے ہیں۔ وہاں کے طریق بود و ماند کے دشوار گذار طریقوں کو اختیار کرنا ہی بہت بڑی ترقی سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ فخر رہیگا کہ آپ میری وضع قطع میں میرے وطن کی شان پاتے ہیں۔

انکو میرے اس قسم کے ریمارک سے ندامت آمیز رنج سا ہوا۔ مگر اس کا جواب دینے کے

لئے انہوں نے کوشش کی۔ چنانچہ کہا فیشن کی غلامی تو کوئی چیز نہیں۔ انسان کو ہر اچھی بات لینے کے لئے طیار رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ کہیں سے آئے۔

میں۔ بہت درست ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اچھا کہہ رہے ہیں۔ وہ فی الحقیقت اچھی ہے بھی یا نہیں۔ اور کیا اس سے بہتر یا اس جیسی چیز ہمارے ہاں بھی ہے یا نہیں۔ اگر جواب یہ ہے کہ ہاں وہ ایسی اچھی ہے۔ کہ اس جیسی یا اس سے بہتر ہمارے ہاں نہیں تو بیشک اُسے لے لینا چاہیئے۔ لیکن اگر ہمارے پاس موجود ہو۔ تو پھر ہماری غلطی ہوگی کہ ہم وہ چال اختیار کریں۔ جس پر کوّے کی مثال صادق آتی ہو۔

مجسٹریٹ۔ آپ تنگدلی کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ ہم کو بہت وسیع القلب بننا چاہیئے۔ اِس یا اُس قوم کے ساتھ قومی تنفر پیدا نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہم یورپ کے فیشن کو بُرا کہینگے تو اسکا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ہم قومی تنفر پیدا کرتے ہیں۔

میں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا۔ قومی تنفر اور قومی وضعداری دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ میں اپنے لباس، اپنے عادات قومی کو ملحوظ رکھ کر بھی دوسرے لوگوں سے محبت اور ان سے شریفانہ برتاؤ کر سکتا ہوں۔ اور اس کے یہ معنی کرنا کہ قومی تنفر پیدا کرتا ہوں۔ ایک بے بنیاد الزام ہوگا۔ اسطرح تو انسان اپنی ملی غیرت اور قومی عصبیت کو کھو دیتا ہے۔ کیا ہم اس لئے عورتوں کو یورپ کی سی آزادی دیدیں۔ کہ اگر ہم اسکو اختیار نہ کریں گے۔ تو قومی تنفر ہوگا۔ آپ یورپ کے لباس اور تراش خراش اختیار کرنے کو تو بلا دلیل ایک اعلیٰ درجہ کی چیز کہدینے کو آمادہ ہیں ایک شخص جو اس طریق معاشرت کو اختیار کرے۔ اس کے پاس عذر ہوگا۔ کہ تنفر قومی سے بچتا ہوں۔ کیا آپ اس کی تائید اس کے عمل سے کریں گے۔

مجسٹریٹ۔ آپ نے اس معمولی بات کو منطقی بنا دیا۔

میں۔ ہرگز نہیں۔ میں نے تو کوئی منطقی قضیہ آپ کے سامنے پیش نہیں کیا۔ سیدھی سادھی بات کی ہے جب ہم یورپ کے طریق زندگی کو اختیار کرتے ہیں۔ اپنا لباس چھوڑ کر ان کا لیتے ہیں۔ تو ہم اپنے ملک اپنی قوم اور شائستگی کی ہتک کرتے ہیں۔ اور اپنے

عمل سے بتاتے ہیں۔ کہ ہمارے گھر میں ستر پوشی کا طریق ہی نہیں ہے۔ جو باتیں ان سے سیکھنے کی ہیں۔ وہ تو سیکھتے نہیں۔ ساری رواداری اور فراخدلی ان لغویات میں آگئی ہے۔ کہ حجامت کا فیشن کرزن ہو یا فرنچ۔ کھانے کے لئے میز پر ضرور ہی کھانے ہوں۔ اور حلال و حرام کی تمیز فضول ہے۔ کیا انگریز اس ملک میں آکر اپنا لباس چھوڑ کر آپ کا اختیار کرتے ہیں؟۔

پھر کیا یہ قومی منافرت کہلائے گی۔ میرے نزدیک تو وہ لوگ نہایت عزت کے قابل ہیں جو اپنے قومی لباس کو چھوڑتے نہیں۔

غرض یہ سلسلہ اگرچہ دلچسپ تھا۔ مگر میرے رفیق سفر کے لئے خوشگوار نہ تھا آخر اُنہوں نے کہا کہ میں اس پر زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہتا۔ کہ ایسی باتوں میں بدمزگی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے میں نے کہا کہ بدمزگی کی کوئی بات نہیں۔ تبادلہ خیالات میں ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا کافی موقعہ ملنا چاہیئے۔ اور اگر اس کی بات اچھی ہو۔ تو اسکو ضرور مان لینا چاہیئے۔ جیسا کہ آپ نے خود شروع میں فرمایا۔ اگر ہم اس اصُول پر اپنے لباس اور طریق بود و ماند کو ترک کر سکتے ہیں۔ تو کیا خیالات کو اگر غلط ہوں نہیں چھوڑ سکتے جس کے لئے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔

رات ہو چکی تھی۔ میرے رفیق سفر کا دستر خوان چنا گیا۔ اور اُنہوں نے مجھے بھی شریک ہونے کے لئے فرمایا تھا۔ لیکن میں نے شکریہ ادا کر کے اپنے مختصر سے ازوقہ کو جو ایک اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ نکال کر کھالیا۔ ملتان سے حیدر آباد جانے والی اور حیدر آباد سے روہڑی تک جانے والی گاڑیوں میں برف اور سوڈا واٹر وغیرہ کا انتظام ہمارے مکرّم مخدوم جناب سیٹھ عبداللہ بھائی صاحب کی فرم کا ہوتا ہے اس لئے ملتان ہی پر ان کے کارندہ کو سٹر نور محمد نے مطلع کر دیا تھا۔ کہ ہم اس گاڑی سے جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ ہر اسٹیشن پر آکر پوچھ لیتا۔ اور برف اور لیمونیڈ کے گلاس لے آتا تھا۔ اور اس طرح پر یہ سفر ایسا پر لطف تھا کہ من و سلوٰی کا مزا آتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بار بار آتا۔ اور پوچھتا۔ اور طلب کرنے پر فوراً لاتا۔ تو مجسٹریٹ صاحب کو اور بھی

تعجب ہوتا. لیکن اب اُنہوں نے مزید سلسلہ کلام پسند نہیں کیا. اور رات نے اور بھی اس خواہش کے پورا کرنے میں مدد کی. نماز پڑھ کر میں سو گیا. اور میرا رفیق سفر بھی. اور صبح کو سات بجے سکندر آباد پہونچے.

۱۴. جون ۱۹۲۵ء یکشنبہ

سکندر آباد ۷ بجے گاڑی سکندر آباد کے سٹیشن پر پہنچی برادرم عبد اللہ بھائی ابراہیم بھائی اور سیٹھ الہ دین صاحب عزیز محمد فاضل بھائی. اور مولوی عبد العلی صاحب اور بعض دوسرے احباب موجود تھے. نہایت محبت و اخلاص سے ملے. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے عزیز مل رہے ہیں. میرے رفیق سفر بھی یہاں ہی اُترے اور انکو یہ مجمع دیکھ کر دوبارہ تعجب سا ہوا. مگر اب وہ بھی مصافحہ کر کے اور آداب کہکر رخصت ہوئے.

میں سٹیشن سے سیدھا منٹگمری ہوٹل کو آ گیا. (جہاں میں ایک عرصہ دراز تک ٹھہرا رہا ہوں)

منٹگمری ہوٹل ہوٹل میں آکر معلوم ہوا. کہ اس ہوٹل کی بانیہ مسز منٹگمری کا انتقال ہو چکا ہے. بہت شریف تھی. میں نومبر ۱۹۱۹ء سے اکتوبر ۱۹۲۲ء تک اسی ہوٹل میں مقیم رہا. میری سیدھی سادی وضع پر یہاں کے بعض انگریز مہمانوں کو کئی مرتبہ اعتراض ہوا. مگر وہ ہمیشہ انکو ناپسند کرتی. اور کہتی کہ وہ اپنے لباس اور وضع قطع کو پسند کرتا ہے. یہ عمدہ بات ہے. ہمارا حق نہیں کہ اسکو مجبور کریں کہ انگریزی طریق اختیار کرے. بہر حال اس کی موت کی خبر سے مجھے افسوس ہوا. نیز میجر کامرن (جو ریاست حیدر آباد کے واحد انگریزی روزانہ اخبار کے مالک اور اڈیٹر تھے) کی وفات کی بھی اطلاع ملی میجر صاحب بہ حیثیت ایک با اصول اخبار نویس میرے ذاتی دوست تھے. میں نے انکے صاحبزادہ سے جو اسی جگہ مقیم تھے. اظہار تعزیت کیا. ان کے صاحبزادہ صاحب ولایت سے جرنلزم کی تعلیم پا کر آئے ہیں. اور ایک قابل اخبار نویس ہیں. غرض

چند روز تک میں اپنے قیام کے ایام میں یہاں ہی مقیم رہا۔

خان بہادر احمد الہ دین صاحب

آج ہی رات کو سیٹھ عبد اللہ بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی احمد الہ دین کو خان بہادری کا خطاب ملنے کی تقریب پر دعوت احباب کی تھی جس میں انکو مبارکباد دی گئی تھی۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر اس جلسہ احباب کے صدر تھے میں نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے:

میں نے سورۃ الکوثر کی تلاوت کے بعد کہا کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے ان فرائض کا ذکر کیا ہے۔ جو اسپر کسی فضل کے ملنے پر عاید ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی خدا تعالیٰ کے فضل کے حصول کے گر بھی بتلائے ہیں۔

جب کسی قسم کا کوثر انسان کو ملتا ہے۔ تو اس کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ تعظیم لامر اللہ کرے۔ اور خدا تعالیٰ کے حضور جھکے۔ جو فصلّ کے لفظ میں تسلیم کی گئی ہے۔ اور دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مخلوق پر شفقت کرے۔ جو وانحر کے لفظ میں بتایا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت ایک قسم کی قربانی کو چاہتی ہے۔ جب تک انسان اپنے وقت کی اپنے مال کی، اپنی خواہشوں اور ضروریات کی قربانی نہ کرے۔ دوسروں پر شفقت نہیں کر سکتا **خطابات** اعزازی کا ملنا یہ بھی ایک کوثر اور **فضل** ہے۔ اگرچہ یہ خود بعض قربانیوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ مگر مزید قربانیوں کے محرک ہوتے ہیں پس **مومن** کا فرض ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضلوں کی قدر اور احترام اپنے اعمال سے کر کے دکھائے۔ تاکہ وہ حقیقی انعامات **اور خطابات** کا جو اس کی جناب سے **مومنوں** کو ملتے ہیں۔ وارث ہو سکے۔

ایسی تقریبوں پر مبارکباد دینا یا تقریریں کرنا۔ ایک قسم کے رسمیات ہو چکے ہیں۔ مگر ہمارا یہ جلسہ احباب رسمیات سے بالاتر ہے۔ اور ہم حقیقت میں **خدا تعالیٰ** کے ایک **فضل** کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہی اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ کو اس لئے مبارکباد دے رہے ہیں۔ کہ آپ اس فضل کی ایک شان کے مظہر ہوئے ہیں۔ اور ہم یہی توقع کرتے ہیں کہ آپ ان فرائض کو پوری دیانت اور امانت سے ادا کریں گے۔ جو **مومن** پر کسی فضل کے نازل ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ آمین!

میں جب تک حیدر آباد رہا میرا ہمیشہ معمول تھا کہ میں عصر کی نماز پڑھ کر حیدر آباد اخبار لینے کیلئے جایا کرتا تھا۔ آج بھی اسی معمول کے موافق میں حیدر آباد گیا۔ مگر افسوس کہ کوئی اخبار مجھے نہ مل سکا۔

۱۵۔ جون سنہ ۱۹۲۵ء یوم دوشنبہ

صبح سے میں اپنے سال گذشتہ کے سفر نامہ کے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ اور شام کو مسٹر بنیر جی سے ملاقات کے لئے گیا۔ میرے پہلے قیام حیدر آباد کے وقت مسٹر خالد بنیر جی ولایت سے تشریف لائے تھے۔ وہ نومسلم ہیں۔ ہمارے ساتھ اخلاص کا اظہار کرتے تھے مرحوم شیخ فضل کریم صاحب ہمیشہ ان سے ملتے رہتے۔ اور اکثر جمعہ کی نمازوں میں بھی لے آتے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ ہم سے دور ہوتے گئے۔ اور حیدر آباد کے حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ الگ رہیں اب وہ خاموشی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور نظام سرکار میں ملازم ہیں بہت دیر تک ان سے گفتگو رہی مگر وہ اپنے خیالات پر مُصر تھے۔ شام کو پھر حیدر آباد گیا۔ کہ اخبارات مل سکیں۔ مگر افسوس کہ آج بھی نہیں ملے۔ دراصل اب اخبارات کی وہ ایجنسی جو ڈیوڑھی سالار جنگ کے قریب تھی نہیں رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اخبارات کے نہ ملنے سے مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔

۱۶۔ جون سنہ ۱۹۲۵ء یوم سہ شنبہ

اکثر احباب سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ اور میں خصوصیت سے مولانا ابو الحمید اور سید بشارت احمد اور سیٹھ غوث صاحب سے ملاقات کے لئے گیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ان سب دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سید بشارت احمد صاحب نے ملائی کی قلفیوں کیلئے دعوت کی مگر افسوس ہے کہ انکی بہت بڑی جد و جہد کے بعد بھی وہ میسر نہ آسکیں شام کو مسٹر بنیر جی صاحب اپنی اٹیکیٹ کے موافق باز دید کے لئے تشریف لائے۔ اور کھڑے کھڑے رخصت ہوئے۔ برادرم سیٹھ الہ دین صاحب نے شام کی دعوت کی تھی۔ وہاں مخدومی ڈاکٹر سید ظہور اللہ صاحب (جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پرانے صحابی ہیں

سے ملاقات ہوئی۔ اور دیر تک پُر لطف صُحبت رہی۔ اور میرے قیام حیدر آباد کا یہ آخری دن تھا۔ کیونکہ میں کل یہاں سے بمبئی جا رہا ہوں۔ تا کہ ۲۰ جون ۱۹۲۵ء کے جہاز پر سوار ہو سکوں

۱۷ جون ۱۹۲۵ء یوم چہار شنبہ (روانگی بمبئی)

صبح ساڑھے سات بجے یہاں سے روانہ ہوا تھا۔ تمام احباب سٹیشن تک میرے چھوڑنے کیلئے آئے۔ اور خدا حافظ اور سلام علیکم کی خوشگوار صداؤں میں ہم ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے۔ حیدر آباد کے سٹیشن پر میرے مکرم مولوی عبدالعلی خاں صاحب وکیل اور سید جعفر صاحب خدا حافظ کہنے کو آئے تھے بہت محبت اور پیار سے ملے۔ مولوی صاحب کو مجھ سے خاص طور پر محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنکو جزائے خیر دے آمین! وہ ایک بے نفس آدمی ہیں اور اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ سلوک کرنے میں بیحد دلیر ہیں۔

چونکہ راستہ میں کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ اس لئے آج گاڑی معمول سے دو گھنٹہ دیر کر کے آئی۔ تاہم وہ وقت پر واڑی جنکشن پر پہنچی۔ میرے لئے سیٹھ صاحب نے پہلے ہی سیٹ ریزرو کرا دی تھی۔ اور میں آرام کے ساتھ اس میں جا بیٹھا۔ سکندر آباد سے بمبئی تک کا سفر ہمیشہ میرے لئے نہایت دلچسپ رہا ہے۔ اور اس راستہ سے میں اب تیسری مرتبہ جا رہا تھا۔ راستہ کا نشیب و فراز نہایت خوشنما منظر پیدا کرتا ہے۔ اور پونا سے آگے تو ایسا خوشنما ہے۔ کہ اس کے بیان کرنے کے لئے میری سیاحت ہند میں جگہ ہے۔

بدلاپور سٹیشن پر پھر دو گھنٹہ کی دیر ہوئی۔ وہاں بھی ایک واقعہ بڑئے روک ہو گیا تھا۔ پونا سے بمبئی تک کا سفر رات میں طے ہوا۔ اور صبح ۱۸ جون ۱۹۲۵ء کو میں بائیکلا سٹیشن پر پہنچا۔ اپنے مکرم نواب صاحب کو تار دیا تھا مگر غلط فہمی ہوئی اُن کا آدمی ۱۷ کو موٹر لیکر آیا اور مجھے نہ پا کر واپس چلا گیا۔ ۱۸ کو میرے پہنچنے کا گمان نہ تھا۔ تاہم میں وکٹوریہ لیکر منزل مقصود پر جا پہنچا۔

۱۸ جون ۱۹۲۵ء یوم پنجشنبہ (بمبئی)

چونکہ سفر کی کوفت تھی میں دوپہر تک کہیں باہر نہ جا سکا۔ نہایا۔ کھانا کھایا۔ اور کچھ آرام کیا

پھر اُٹھ کر نماز ظہر و عصر پڑھ کر میں باہر نکلا۔ تاکہ کچھ سامان سفر خریدوں۔ اور ٹامس کک کے دفتر میں جاکر جہاز میں اپنی سیٹ وغیرہ کا انتظام کروں۔ میرے بحکم نواب صاحب کی موٹر حاضر تھی۔ اس پر سوار ہوکر سیدھا ٹامس کک کے دفتر میں گیا۔

ٹامس کک اینڈ سن ٹامس کک اینڈ سن ایک بہت بڑے مشہور پسینجر ایجنٹ "کمپنی ہے۔ جس کی شاخیں اور دفتر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا بھر میں سفر کے لئے وہ ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں میں نے جب عزیزی بحکم محمد واحمد صاحب کو روانہ کیا تھا۔ اس وقت سے اس کمپنی کے ساتھ میرا حساب لین دین قائم ہے۔ اور میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ نہایت باقاعدگی اور آسانی ہے۔ اس سفر کے لئے میں نے سکندرآباد سے بذریعہ تار دریافت کیا۔ تو انہوں نے لکھا۔ کہ ۲۰ رجون کو پی۔ اینڈ او کے "رزنک" نامی جہاز پر جو ڈاک لیکر جارہا ہے۔ درجہ دوم کی جگہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ اب جو میں ان کے دفتر میں گیا۔ تو انہوں نے مجھے کہا۔ کہ نمبر ۱۰۱ کی کیبن میں آپکو جگہ ملجائیگی۔ اور یہ بہت ہی عمدہ موقعہ ہے۔ میں الحمد للہ کہکر اور مطمئن ہوکر چلا آیا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ غلط فہمی ہوئی۔ یا کچھ ردوبدل ہوا۔ اور مجھے ۱۰۱ کی بجائے ۵۰۵ نمبر کی کیبن ملی۔

غرض میں ضروری انفرمیشن لیکر کل کو پھر دفتر میں آکر باقاعدہ حساب وغیرہ کرنے اور ٹکٹ خریدنے کا وعدہ کرکے چلا آیا۔ اور بازار جاکر بعض ضروری سامان سفر خرید کیا۔ اس لئے کہ میں نے اب تک کوئی سامان کیا ہی نہ تھا۔ چنانچہ قینچی۔ آئینہ۔ جرابیں رومال۔ تولیہ وغیرہ اور کچھ سامان نوشت خواند اور ایک چھوٹا ٹرنک خریدا۔ اور ۵ بجے کے قریب واپس آگیا۔ شام کا کھانا تیار تھا۔ کھاکر نواب صاحب کی خواہش پر ان کے ہمراہ سیر کو چلا گیا۔ اور بعد مغرب ایک سینما میں چلے گئے۔ جہاں ایک مشہور فلم شاطر بغداد دکھائی جارہی تھی۔ اور جس کے دیکھنے کے لئے بمبئی میں اس قدر جوش اور شوق تھا۔ کہ جگہ ملنی مشکل تھی۔

بہرحال ہم وہاں پہنچے۔ کچھ شک نہیں کہ فلم کی ظاہری حیثیت کے لحاظ سے نہایت

ہی قابلِ دید اور قابلِ غور فلم تھی۔ مگر مجھے اس کے مضمون سے تکلیف ہوئی۔ اس میں دکھایا گیا تھا۔ کہ "خلیفہ بغداد کی بیٹی ایک شاطر قزاق سے عشقبازی کرتی ہے۔" میں نے اس کے خلاف ایک آرٹیکل لکھکر خلافت اور بعض دوسرے مقامی اخبارات کو بھیجا مجھے معلوم نہیں کہ وہ شائع ہوئے یا نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی شوکت علی صاحب اور مولوی خجندی صاحب کو خط کے ذریعہ توجہ دلائی۔ کہ یہ توہینِ اسلام کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

۱۹۔ جون سنہ ۱۹۲۵ء یوم جمعہ

جمعہ کی نماز میں اپنی مصروفیت کیوجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ یہاں کی انجمن نے پہلا مکان چھوڑ دیا تھا۔ اور دوسرے مکان کا مجھے پتہ نہ تھا۔ اور مجھ کو کُک کے دفتر میں جا کر حساب وغیرہ کرنا تھا۔ اس لئے میں ۱۱ بجے کا گیا ہوا ۳ بجے کے قریب واپس ہوا۔ کُک کے دفتر میں جا کر میں نے پورٹ سعید تک کا درجہ دوم کا ٹکٹ لیا۔ اور راستہ کے متعلق بعض ضروری امور پر گفتگو کی۔ اور روپیہ کو انگریزی سکّہ میں تبدیل کر کے ٹامس کُک کے کوپن لے لئے۔

کوپن خریدنے کی صورت میں روپیہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور ہر مقام پر جہاں کُک کا دفتر ہے۔ روپیہ مل جاتا ہے۔ جہاز میں زیادہ روپے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اسلئے میں نے صرف چند نقد روپے جن کی میں سمجھتا تھا۔ عدن یا پورٹ سعید اترتے وقت ضرورت ہوگی۔ لیکر باقی کوپن لے لئے۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر میں سید نامکرمی سیٹھ اسمٰعیل آدم صاحب کی دوکان پر ان سے ملنے گیا۔ اس لئے کہ مجھے اب صرف یہی ایک کام باقی تھا۔

خواجہ کمال الدین صاحب

جب میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خواجہ کمال الدین صاحب شیخ عبد الرشید صاحب خلف شیخ رحمۃ اللہ صاحب مرحوم اور شیخ عبد الرحیم صاحب اُن کا بیٹا موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کا قافلہ بھی ابھی ابھی پہونچا ہے۔ اور خواجہ صاحب ولایت جا رہے ہیں۔ دو اختلاف رائے

رکھنے والے اور بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہو جانے والے کسی زمانہ کے بھائیوں کا اسطرح پر یکایک ملنا حیرت انگیز ہونا لازمی ہے۔

خواجہ صاحب کی قسمت عجیب واقعہ ہوئی ہے۔ کہ میں کبھی کبھی ان کا رفیق سفر بغتۃً ہو جاتا ہوں جسپر انکو ہمیشہ حیرت ہوئی ہے۔ اور انہوں نے یہ مشہور کرنے کی ناجائز اور بے سود کوشش کی۔ کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ جو سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔ میرا اس طرح پر مصر کی طرف جانا اسی جہاز پر جانا جسمیں خواجہ صاحب جا رہے ہوں پہلے کی فیصل شدہ بات نہ تھی۔ بلکہ خواجہ صاحب کے سفر کا کوئی علم بھی نہ تھا۔ اور نہ اب وہ اپنے سفروں کا عام طور پر اعلان کرتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے۔ انکی روانگی تک یہ خبر صیغہ راز میں ہی رہی۔ اور ایسا ہی ہندوستان کے سفروں میں انہوں نے یہی طریق رکھا ہے۔

جب انکو معلوم ہوا کہ میں بھی کل ۲۰ جون کے جہاز میں انکے ہمراہ ولایت جا رہا ہوں۔ تو انکی حیرت کی حد نہ رہی۔ اوّل تو میرا ایکدم وہاں پہنچنا۔ پھر ولایت جانا سن کر وہ سن ہو گئے میں نے زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرنا فضول سمجھا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اجازت چاہی اور چلا آیا۔ اور اپنے لمبے سفر کے لئے تیار ہونے لگا۔ وہاں سے واپس آکر میں نے کہیں جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اپنے محترم نواب صاحب سے مختلف امور پر دلچسپ گفتگوئیں کرتا رہا۔ اور مغرب عشاء کی نماز پڑھکر آرام سے سو گیا۔ تاکہ صبح جلد اٹھ سکوں۔ کیونکہ ۹ بجے مجھکو بیلرڈ پیر پہ جہاں سے ڈاک کے جہاز چلتے ہیں پہنچ جانا تھا۔

۲۰۔ جون ۱۹۲۵ء یوم شنبہ

(ہندوستان کے ساحل سے روانگی)

صبح اٹھکر حوائج سے فارغ ہوا۔ نماز پڑھی اور اپنے اس لمبے سفر کے لئے دعا کی۔ اسوقت قلب کی کیفیت عجیب تھی۔ رقت اور خشوع بیحد تھا۔ اس لئے دل کھول کر دعائیں کیں۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ قبول ہو گئی ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہیگا۔ اور جس رنگ میں میرا مولیٰ پسند کریگا۔ پوری ہو جائیں گی۔

نماز سے فارغ ہونے ہی کھانا تیار تھا۔ نواب صاحب ہمیشہ سے سحر خیزی کے عادی ہیں۔ اور انہوں نے میرے اُٹھنے سے بھی پہلے کھانے کا خاص طور پر اہتمام کر رکھا تھا محبت و اخلاص کے جذبات کے ساتھ انہوں نے دستر خوان بچھوا دیا۔ اور آپ میرے پاس بیٹھ گئے میں نے کھانا کھایا اور طیار ہو گیا۔

موٹر کھڑی تھی میں سیدھا وقت معینہ پر بیلرڈ پیر پر پہنچ گیا۔ اور جہاز کے خلاصیوں کے سپرد اسباب کر دیا۔ جب میں جہاز پر پہنچا۔ تو میرے حجرہ میں میرا سارا سامان قرینہ سے رکھا ہوا تھا۔ ۱۱ بجے طبی معائنہ کے بعد جہاز پر سوار ہونا تھا سیٹھ اسمٰعیل آدم وہاں موجود تھے مگر خواجہ صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ٹھیک وقت پر وہ بھی پہنچ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے ہم جہاز پر چلے گئے۔ جہاز کی روانگی کا نظارہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ساحل سمندر پر مسافروں کے عزیز و اقارب اور احباب کھڑے ہوتے ہیں۔ اور تختہ جہاز پر جانے والے مسافر جذبات کی موجیں درمیان میں کھیلتی ہیں۔ اور کبھی کبھی آنسوؤں کے تاروں سے گفتگو کرتی ہیں۔ میں تختہ جہاز پر کھڑا محو نظارہ تھا۔ کہ جہاز نے حرکت شروع کر دی۔ یہ ٹھیک ایک بجے کا وقت تھا۔ اور رفتہ رفتہ بمبئی کا ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

خدا تعالیٰ کے فضل کی ایک بات

۲۰ جون ۱۹۲۵ء کو کنڈونیا نامی جہاز جانے والا تھا۔ جو سات ہزار ٹن سے کچھ زائد وزن کا تھا۔ لیکن یکایک اس کے متعلق فیصلہ ہو گیا۔ کہ وہ ۲۰ جون کو نہ جائیگا۔ بلکہ اس کی جگہ رنک جو ۱۱ ہزار کے قریب ٹن کا ہے) جائیگا۔ یہ جہاز وہی ہے جس پر جناب لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند انگلستان تشریف لیگئے تھے۔ یہ جہاز نیا طیار ہوا ہے۔ اور اسی سال ماہ فروری میں یہ سمندر میں لایا گیا ہے۔ غرض اس طوفانی اور متلاطم موسم میں ایک ہلکے جہاز پر جانے کا جو خلجان تھا وہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح پر رفع کر دیا۔ والحمد للہ علےٰ ذالک۔

یہ جہاز نہایت ہی عمدہ بنا ہوا ہے۔ اس کا ڈیک بہت ہی اعلیٰ درجہ کا ہے مسافروں

کی بھی چنداں بھیڑ بھاڑ نہیں۔ درجہ اوّل و دوم کے مسافروں کی کل تعداد ۱۲۶ ہے۔ میں اس وقت قاہرہ جا رہا ہوں۔ اور انشاء اللہ العزیز مکرّم شیخ محمود احمد صاحب سے ملکر آگے قدم بڑھاؤں گا۔ میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ میں سلسلہ عالیہ احمدیہ کی طرف سے سلسلہ کے کسی کام کے لئے نہیں جا رہا ہوں۔ بلکہ بعض ذاتی کاموں کیلئے جا رہا ہوں۔ گو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ کہ میری دلی خواہش اور غرض یہی ہے۔ کہ کسی طرح سلسلہ کی کوئی خدمت کر سکوں۔ واللہ الموفق۔

جہاز اور اسکا اسٹاف

اس جہاز کا تمام عملہ انگریزی ہے۔ سوائے خلاصیوں اور باورچی خانہ کے خدام کے اوّل الذکر دمن کے مسلمان ہیں۔ اور دوسرے گوا کے کرسچن دونوں پرتگال کی حکومت کے نیچے رہتے ہیں۔

دمن کے مسلمان قدیم جہازرانی کے فن کے ماہر چلے آتے ہیں۔ اور انکی زندگیاں پانیوں ہی میں گذرتی ہیں۔ افسر اور دوسرے لوگ بہت ممنون کن طبیعت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال لکھتا ہوں

جہاز کا کھانا

جب گذشتہ سال سفر یورپ پیش آیا تھا۔ تو خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے کھانے کا ایسا معقول انتظام تھا۔ کہ ہم گویا اس پہلو سے گھر کے دسترخوان کا لطف اُٹھاتے تھے۔ اس مرتبہ جہاز کے گوشت وغیرہ کے متعلق مجھے احتیاط کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں پرسر سے ملا۔ اُس نے میرے لئے خاص انتظام کر دیا۔ ذبیحہ کا گوشت موجود اور وہ اس پر بھی آمادہ کہ مسلمان باورچی طیار کرے۔ جو خلاصیوں کیلئے رکھا گیا ہے۔ لیکن اصل غرض تو ذبیحہ کی تھی۔ چنانچہ خاص ہدایات نافذ کی گئیں۔ اور ہر کھانے کے وقت ایک انگریز افسر آکر اسکا معائنہ کرتا ہے۔ اور مجھ سے دریافت کرتا ہے۔ میری وجہ سے بعض دوسرے احباب کو بھی آرام ہو گیا ہے۔ عدن سے زندہ مرغیاں خریدنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اگر میں روانگی سے پہلے بمبئی میں کہتا۔ تو۔ اس کا انتظام وہاں ہی سے شروع ہو جاتا۔

بعض گجراتی ہندو ولایت جا رہے ہیں۔ جو شنو مذہب کے ماننے والے ہیں۔ میرے مشورہ پر جب وہ اپنی ضروریات پرسر کے نوٹس میں لائے۔ تو اُن کے لئے بھی خاص انتظام کر دیا گیا۔ غرض ہر طرح سے مسافروں کی آسایش و آرام کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور کوئی امر ایسا نہیں ہونے دیا

جاتا جو کسی کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچائے۔

گجراتی لڑکوں کا عزم مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ ان گجراتی لڑکوں نے اپنے دھرم گورو سے روانگی سے پہلے ایک عہد کیا ہے۔ کہ وہ کوئی امر اپنے مذہب کے خلاف نہ کریں گے۔ اور جب تک یہ عزم اور عہد انہوں نے نہیں کر لیا۔ انکو اجازت نہیں ملی میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے۔ جو یورپ کے سفر کے لئے جاتے ہیں۔ خصوصاً طالب علموں کو وہ پہلی ہی منزل پر سب کچھ کھانے لگتے ہیں۔ اور ان میں یورپین روح حلول کرنے لگتی ہے لیکن میں انہیں بڑے غور سے دیکھتا چلا آیا ہوں۔ کہ وہ برابر کھانے کی تکلیف اٹھاتے رہے ہیں مگر اب تک انکو جنبش نہیں ہوئی۔ اور میں نے مختلف طریقوں سے انہیں ٹٹولا۔ وہ اپنے عہد پر بہت پختہ معلوم ہوتے ہیں ہم نے اپنے امام کے ہاتھ پر جو عہد کیا ہے۔ وہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ یعنی

دین کو دنیا پر مقدم کرنا

حضرت امام نے ولایت میں رہنے والے احمدی لڑکوں کو جو ہدایات دیں اور اپنے ولایتی خطبات میں جس کیرکٹر کی طرف انکو توجہ دلائی وہ کوئی مخفی بات نہیں۔ اور در اصل کسی قوم کی ترقی کی روح کا وہی راز ہے۔ اگر یہ لڑکے جنہوں نے حق تعالیٰ کی زندہ آیات کو نہیں دیکھا۔ جو محض جذبات کی بنا پر ایک دہرم گورو کے معتقد ہیں۔ ایسا عزم کر سکتے ہیں۔ تو ہماری ذمہ واری کسی قدر بڑی ہے۔ اس وقت تک بھی ان میں سادگی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہ لڑکے اپنے عزم میں کامیاب ہوں؛

میرا رفیق سفر میرے حجرہ میں میرا رفیق سفر ایک پارسی نوجوان ڈاکٹر تھا۔ جو پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اور اپنی ملازمت پر عدن جا رہا تھا نہایت ہی شریف الطبع اور شرمیلا نوجوان ہے۔ باوجود ڈاکٹر اور نوجوان ہونے کے جہاز کی مشکلات سے ڈرتا تھا۔ مگر اب بغیر اس کے چارہ ہی نہ تھا۔ کہ جا رہے ہیں۔ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ اور دو کے رشتہ دار جہاز تک پہنچانے آئے ہیں۔

چونکہ میں جہاز میں پہلے سفر کر چکا تھا۔ اس لئے یہ معلوم کر کے وہ سمندری بیماری کے

متعلق میرے تجربے پوچھتا رہا میں نے انکو اپنے پہلے تجربہ سے آگاہ کیا کہ مجھے تو بیٹ رہنا مفید معلوم ہوتا ہے ۔ طبی تدارک اور حفظ ماتقدم تم خود اچھی طرح سمجھتے ہو۔ اس سے مذہب و اخلاقیات پر بھی بعض مذاکرات ہوئے ۔ جو اپنے اپنے موقعہ پر انشاء اللہ درج ہونگے ۔

جہاز میں امانتوں کا انتظام

جہازوں میں اموال اور قیمتی دستاویزوں کے تحفظ کا بہترین انتظام ہوتا ہے ۔ اور یہ ایسا مفید اور موزوں طریق ہے ۔ کہ کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہتا ۔ اور دفتر کے اوقات میں جب چاہو اپنی امانت لیلو یہ کام پرسر کے سپرد ہوتا ہے ۔ پرسر کوئی امانت شمار کرکے نہیں لیتا ۔ بلکہ وہ تمہیں ایک لفافہ دیگا ۔ کہ اس میں ڈالدو ۔ اور تمہارے سامنے اسے بند کرکے اسپر تمہارے دستخط لیگا یہ دستخط مہر کرنے کے قائمقام ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ لفافہ کے منہہ پر کرائے جاتے ہیں دستخط ہوجانے کے بعد وہ ایک رسید اس نمبر کی آپ کو دیگا ۔ جس پر آپ کی امانت رکھی گئی ہے ۔ جب تم کو امانت لینے کی ضرورت ہو تم اس رسید کو اس کے پاس لیجاؤ ۔ وہ ایک منٹ کے اندر آپ کی امانت لے آئیگا ۔ اور تم اسکو اس کے سامنے اچھی طرح پڑتال کرلو ۔ اور کھول کر دیکھنے پر معلوم ہوگا ۔ کہ

بالکل صحیح سلامت ہی

قطعاً کسی قسم کا نقصان نہ ہوگا ۔ جہازی سفر کرنے والوں کو لازم ہے کہ وہ اپنی قیمتی دستاویزوں اور اموال کو نقصان اور سرقہ سے بچانے کے لئے جہاز پر جاتے ہی پہلا کام یہ کریں ۔ اور جس مقام پر جانا ہو ۔ وہاں پہنچنے سے چند گھنٹہ پیشتر اپنی امانت لے لیں ۔ کیونکہ جہاز کے منزل مقصود پر پہنچتے وقت آفیسر بہت مصروف ہوتے ہیں ۔ اور پھر انتظار کرنا پڑتا ہے

غرض میں نے تختہ جہاز پر جاکر اپنے کیبن (حجرہ) میں اپنے سامان کی پڑتال کرلینے اور نماز سے فراغت کے بعد پرسر سے ملکر اپنے کھانے کا انتظام کیا اور امانت اس کے سپرد کرکے رسید حاصل کرلی ۔ اور میں اسطرح پر فارغ ہوکر اپنے آیندہ سفر کے متعلق سوچنے اور سمندری نظاروں کے دیکھنے کیلئے فارغ ہوگیا ۔

جہاز میں پہلا دن

ایک بجے ٹھیک جہاز روانہ ہوگیا ۔ اور سمندر میں کسی قسم کے تلاطم

کا کوئی اثر ہم پر نہیں ہوا۔ جہاز ابھی روانہ ہوا تھا۔ کہ مجھے بعض خطوط ملے جنیں عزیز مکرم شیخ ابراہیم علی میرے دوسرے لڑکے کا خط بھی تھا۔ میں نے اپنی روانگی کا تار اور خطوط کے جوابات مختصراً تختہ جہاز سے ہی لکھ کر حوالہ کر دئے۔ اور تھوڑی دیر تک جبتک کہ بمبئی کا خوشنما ساحل اور دلفریب عمارتیں نظروں سے اوجھل نہ ہوگئیں اس نظارہ کو امید و بیم کے جذبات اور خوشی و رنج کے ملے ہوئے احساسات میں دیکھتا رہا۔ پھر بعض ضروری سامان کھانے اور امانت وغیرہ کے متعلق کر کرا کر سیر دریا میں مصروف ہوگیا۔ جہاز جا رہا تھا۔ اور یادِ وطن چٹکیاں لے رہی تھی۔

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

جہاز نہایت سرعت سے جا رہا تھا۔ ڈاک کے جہازوں پر مسافروں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت نہیں ہوتی۔ اور علی العموم مسافر اعلےٰ طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ظہر و عصر کی نمازیں جمع کر کے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ غروب آفتاب پر مغرب و عشار کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیں۔ کھانے سے فراغت کر چکا تھا۔ دعاؤں کیلئے توفیق ملی۔ اور دل کھول کر اپنے مولیٰ و مالک سے عرض حال کیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رفیق سفر نے بھی اپنے عقیدہ کے موافق عبادت کی۔ اور فارغ ہو کر لباس شب پہن کر سونے کے لئے اپنے بستر پر چلا گیا۔ اُسے تعجب سا ہوا کہ میں نے لباس شب نہیں پہنا۔ اور وہی لباس جو دن کو پہنے ہوئے تھا پہن کر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ اسے تعجب تو ہوا۔ مگر چونکہ ہمارا پہلا ہی دن تھا۔ اس نے مجھسے اس کے متعلق استفسار نہ کیا۔ رات کو نیند خوب آئی۔ اور صبح کو جب میں اُٹھا تو

جہاز اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ اور دریائی موجیں اس سے کھیل رہی تھیں

قریباً ساڑھے تیرہ صدیاں ہونے کو آئی ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کی کتاب مجید نے جہازوں کو آیۃ اللہ فرمایا اور اس کے منافع کی طرف اشارہ کیا۔ سمندری سفر میں یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہوتی ہے۔ نیلگوں سمندر کا ایک وسیع میدان نظر آتا ہے۔ اور اس کے سینہ کو چیرتا ہوا دخانی جہاز نہایت تیزی کے ساتھ گذرتے ہوئے اہل بصیرت کے لئے ایک عجیب نظارہ پیش کرتا ہے۔

قدیم وجدید جہاز رانی

زمانہ قدیم کی جہاز رانی کو اس عہد جدید کی جہاز رانی سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اُس وقت جہاز بادبانوں کے ذریعہ سے چلتے تھے۔ اور بعض اوقات مخالف ہوائیں کہیں سے کہیں لیجاتی تھیں۔ اور منزل مقصود سے دُور پھینکدیتی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سفر کے طے کرنے کے لئے مدت دراز درکار ہوتی تھی۔ میں چھوٹا سا تھا کہ جب حج کو جانے والے لوگ نہایت حسرت و یاس کے ساتھ روانہ ہوا کرتے تھے۔ اور جو سفر اب گھنٹوں اور دنوں میں طے ہوتے ہیں۔ اُس وقت ہفتوں نہیں ختم ہوتے تھے۔ ہندوستان میں بھی پہلے بادی جہاز آیا کرتے تھے۔ جو کم از کم چھ ماہ میں ہندوستان پہنچتے تھے۔ ہندوستان میں پہلا دخانی جہاز ۱۸۲۵ء میں کپتان جانسن انٹرپرائز نام لایا تھا۔ اور اب دخانی جہاز رانی میں اسقدر ترقی ہوگئی ہے۔ کہ وہ طوفان اور تلاطم کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے سمندر میں اس طرح پر دوڑتے ہیں گویا ایک موٹر ہے۔ جو پختہ سڑک پر دوڑ رہی ہے۔ اور یوماً فیوماً رفتار میں ترقی ہو رہی ہے۔ ہمارا جہاز رنگ گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں ۳۰۵ میل سفر طے کر چکا ہے۔ یہ ایسی رفتار ہے۔ کہ جو ہندوستان کے بعض میل ٹرین ریلوے ٹرین سے بھی زیادہ ہے۔ اس کمپنی کے جہاز اپنی رفتار عام طور پر تین اور چار سو میل کے اندر رکھتے ہیں۔ اس زمانہ کی جہاز رانی میں راستہ کی بہت بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ زمانہ قدیم میں علے العموم جہاز کنارہ کے قریب قریب چلتے تھے اور جو دُور ہوتے وہ دن کو آفتاب اور رات کو ستاروں کی مدد سے راستہ نکالتے۔ لیکن جب سے کمپاس کی ایجاد ہوئی ہے۔ جہاز خشکی کی سواریوں کی طرح دوڑتے چلتے ہیں تمام سمندر کے نقشے طول بلد اور عرض بلد کے لحاظ سے جہاز پر موجود ہوتے ہیں۔ اور چپہ چپہ سمندر کا حال معلوم ہے۔ اور اس میں آئے دن ترقیاں ہو رہی ہیں۔ اور سفروں کو آسانی اور تیزی سے طے کرنے کی تجویزیں آئے دن ان کمپنیوں کے زیر نظر رہتی ہیں۔

شہر رواں کا مختصر خاکہ

میں نے کسی چٹھی میں جہاز کو ایک شہر رواں کہا ہے حقیقت میں یہ ایک شہر رواں ہے۔ جو سمندر میں چل رہا ہے۔ اور

مسافروں کے آرام و آسائش کا ہر سامان موجود ہے۔ ان کے رہنے کے کمرے نہایت مصفا روشن اور ہوادار ہیں بجلی کے پنکھوں کی بجائے اب جدید انتظام تازہ ہوا کا گیا گیا ہے۔ ہر کمرہ میں یہاں تک کہ بیت الخلا اور غسل خانہ میں بھی تازہ ہوا اس کثرت سے آتی ہے اور ایسی خنک اور خوشگوار ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ کام کرنے کو جی میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے علے العموم اس جہاز کے ہر کمرہ میں دو دو آدمیوں کیلئے بستر ہیں۔ جو نہایت گدگدے اور صاف ہیں۔ ہر کمرہ میں ہاتھ منہ دہونے کے لئے ایک سلفچی اور پانی کا نل موجود ہے۔ جس میں میٹھا پانی آتا ہے۔ صابن اور تولئے رکھے گئے ہیں۔ ایک بڑا آئینہ اور دو آئینے کی الماریاں اور ایک بڑی الماری کپڑے رکھنے کے لئے موجود ہے۔ ایک خانہ دار میز بھی موجود ہے۔

ہر دو تین کمروں پر ایک ملازم مقرر ہے۔ جس کا کام انکی صفائی اور مسافروں کے بستروں کو صاف رکھنا۔ ان کے جوتوں کو پالش کرنا اور انکی ضروریات کو مہیا کرنا ہے۔

غسلخانہ اور بیت الخلاء | مردوں اور عورتوں کیلئے جدا جدا بیت الخلا اور غسل خانے ہیں۔ یہ بیت الخلا اور غسلخانہ ایک ہی بڑے کمرہ میں علیحدہ علیحدہ بنائے گئے ہیں۔ ہر ایک بیت الخلا اور غسل خانہ کو نہایت عمدگی سے صاف رکھا جاتا ہے۔ اور مغربی طریقہ نظافت کا پورا اہتمام ہے۔ پیشاب کرنے کے لئے ایک الگ جگہ ہے۔ اور ہر وقت پانی کے نل اور سلفچی موجود ہیں۔ صابن اور تولئے اس جگہ بکثرت رکھے گئے ہیں۔ تاکہ ہر شخص ان سے ضرورتاً کام لے۔ اور ہر شخص ایک جدا تولیہ استعمال کرتا ہے اور ایک ہی مرتبہ۔ غسل خانے میں بڑے بڑے ٹب ہیں۔ اور تمام یورپ اور مغربی ممالک میں غسل کا یہی طریق عام طور پر رائج ہے۔ کہ اسے بھر کر اس میں لیٹ کر نہاتے ہیں۔ بمشرقی نقطۂ خیال سے یہ طہارت کا طریق معیوب ہو۔ مگر ان لوگوں کو یہی پسند ہے۔ میں اس ٹب میں بھی لوٹے سے کام لیکر غسل کر لیتا ہوں۔ پہلے سمندر کا کھارا پانی ملتا ہے۔ جو نل کے ذریعہ آتا ہے۔ اور ساتھ ہی خادم میٹھا پانی گرم یا سرد مہیا کر دیتا ہے۔ تاکہ نمکین پانی سے غسل کرنے کے بعد اس سے غسل کر لیا جائے۔

جہاز کی عام صفائی | روزانہ صبح آٹھ بجے تک عام طور پر جہاز کی عام صفائی ختم ہو

جاتی ہے۔ اور صحن جہاز کو پانی سے دھو کر خشک کر دیا جاتا ہے۔ یہ نظارہ مصروفیت اور فرض شناسی کا بہت قیمتی سبق دیتا ہے۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ طہارت عبادت سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ عبادت کے لئے طہارت لازمی ہے۔ اور ظاہری نفاست اور لطافت کا قلب پر بھی اثر پڑتا ہے۔

یہ صفائی اسطرح پر کیجاتی ہے کہ پانی کے بڑے بڑے نل کھول دئے جاتے ہیں۔ جن کے ذریعہ سمندر کا پانی خود بخود کھچا چلا آتا ہے۔ اور پھر برشوں سے خلاصی اسے دھو ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً دمن کے رہنے والے مسلمان ہیں۔ انکی حالت کو دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔ کہ ایسی محنتی اور جفاکش قوم کو ہم کسی مصرف میں نہیں لا سکتے۔ ان میں وہ تمام قوتیں موجود ہیں۔ جنکو اگر مفید طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ تو قومی ترقیوں کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہیں۔ غرض تختۂ جہاز کے غسل دئے جانے کے بعد لوگ صحن جہاز میں اپنی اپنی کرسیوں پر آ ڈٹتے ہیں۔ اور بعض مختلف کھیلوں میں مصروف ہو جاتے ہیں

آسائش مسافرین کے دوسرے سامان

چونکہ جہاز پر سارا دن کوئی اور کام کرنے کو نہیں ہوتا۔ اس لئے دل بہلاؤ کے سامان مہیا کئے گئے ہیں۔ درجہ دوم اور اوّل کے مسافروں کیلئے ایک ایک سموکنگ روم بنایا گیا ہے۔ اور اس کے علاوہ موسیقی کے کمرے اور لائبریری بھی ہے۔ جہاں نہایت اعلےٰ درجہ کا فرنیچر مہیا کیا گیا ہے۔

مطالعہ کتب کے لئے ایک عمدہ لائبریری ہے جس میں ناول۔ سفرنامے۔ کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ ہر قسم کی تھوڑی بہت کتابیں ملتی ہیں زیادہ تر لائٹ لیٹریچر کی کتابیں ہیں مسافر اپنے مطالعہ کیلئے وہاں سے کتابیں حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک مفید مشورہ

میری رائے میں صیغہ دعوت و تبلیغ کو جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت کر کے سلسلہ کی کتابیں ان لائبریریوں میں رکھوانی چاہئیں۔ جہاز پر عموماً لوگ فارغ ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے اوقات گذارنے کے لئے کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جہاز ران کمپنیاں صیغہ دعوت و تبلیغ کے اس قسم کے عطیہ سے انکار کریں۔ لیکن کسی حال میں کوشش کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ میرے دیکھنے میں آیا ہے کہ فرصت اور فراغت کے باعث لوگ ہر قسم کی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور مذہبی معاملات میں بھی پورا شوق ظاہر کرتے ہیں

اس لئے یہ کوشش انشاء اللہ مفید ہوگی۔

روزانہ اس کمرے میں صبح وشام کچھ عرصہ تک پیانو بجتا ہے۔ اور جہازی کمپنیوں کی طرف سے یہ موسیقی داں آکر اپنا فرض ادا کر جاتے ہیں بعض اوقات میں انہیں حیرت سے دیکھتا ہوں کہ کوئی بھی انکے فن کی داد دینے والا تو درکنار سننے والا بھی موجود نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنے فرض کو ادا کر رہے ہوتے ہیں اور خود ہی جھوم جھوم کر پیانو اور طنبور بجا کر چلدیتے ہیں۔ گو یہ فن ایک ادنٰے درجہ کا فن ہمارے ملک میں سمجھا گیا ہے لیکن یہاں جو بات مجھے متحرک کر رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کس طرح پر اس حکمران قوم کے افراد اپنے فرض کو ادا کرتے ہیں۔ پابندئی وقت کا پورا لحاظ ہے میں نے جہاز کے مختلف شعبوں میں ضرورتاً بلا ضرورت جا کر دیکھا ہے کہ جو وقت جو کام کے لئے مقرر ہے وہ ٹھیک وقت پر ہو رہا ہے۔

مسافروں کیلئے نوشت خواند سامان بھی کافی موجود ہے۔ ہر مختلف میزوں پر قلم دوات اور خطوط لکھنے کے کاغذ لفافے بلاٹنگ پیپر رکھے ہوئے ہیں۔ اور جہاز ہی میں ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ خطوط اندازی کے لئے ایک صندوق رکھا ہوا ہے۔ جو بندرگاہ پر پہنچتے ہی ڈاک گھر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر روز ضروری امور کے متعلق اعلانات ٹائپ کر کے لگوا دئے جاتے ہیں۔ مسافروں کے لئے حجام کا انتظام ہے۔ مگر اس جہاز میں نہ معلوم کیوں دھوبی کا انتظام نہیں ہے۔ ہم نے گذشتہ سال لائڈ ٹریسٹینو کمپنی کے دو نو جہازوں (افریقہ اور بلیسنا جن میں ہم نے سفر کیا تھا) میں دھوبیوں کا بھی انتظام تھا۔ کھانا کھانے کیوقت متعدد آفیسر موجود رہتے ہیں۔ اور وہ مسافروں کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور انکی خاطرداری اور تواضع میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے۔ مسافروں کو دن میں تین مرتبہ کھانا اور دو مرتبہ چائے دیجاتی ہے۔ اور اس امر کا خصوصیت سے لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کہ کوئی امر کسی کی مذہبی حس کے خلاف نہ ہو۔

۲۶ جون ۱۹۲۵ء کی صبح کو چاشت کے دسترخوان پر میرے لئے کھانے کا جو آرڈر دیا گیا تھا۔ اس میں ایک چیز یعنی کھیر نہیں آئی میں نے خدمتگار کو جب حکم دیا۔ اور وہ باورچیخانہ میں گیا۔ تو ملیا۔ نہ ہو سکی تھی۔ اس پر اس نے افسر متعینہ کو مطلع کیا۔ اور وہ فوراً دوڑا ہوا آیا اور کہا :

"مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ کھیر نہیں بن سکی۔ اور جو کچھ فرمائیں حاضر کروں" میں کھیر کا دلدادہ اور خدا کے فضل سے کسی چیز کا غلام نہیں ہوں۔ اس کے اظہار افسوس پر مجھے خود شرم آئی میں نے اسکا شکریہ ادا کیا۔ لیکن شام کے کھانے پر ایک اور ناگوار واقعہ پیش آگیا۔ جس پر میں نے افسر متعلقہ کو متوجہ کیا۔ غالباً اُسے غلط فہمی ہوئی۔ میں نے اس کے خلاف پروٹسٹ کرتے ہوئے مائدہ سے اُٹھ آنا مناسب سمجھا۔ صبح کی چار کوپن میں نے واپس کر دیا۔ تو اُسے احساس ہوا اور وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اور معاملہ کو صاف کیا۔ بات معمولی تھی لیکن جس اسپرٹ نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ

اپنی غلطی کا اقرار قلب کو خوش رکھتا ہے۔

ہم اپنی کسی بڑی سے بڑی غلطی اور کمزوری کا اعتراف کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتے اور واضح اور بیّن دلائل اپنی غلطی کے دیکھتے ہوئے بھی اسپر مصر رہتے ہیں مگر یہ قوم جو دنیا کے ایک چھوٹے سے جزیرہ سے نکلکر دنیا پر حکومت کر رہی ہے۔ اپنے اندر یہ خوبی رکھتی ہے جو اسلام نے دنیا کو سکھائی تھی۔ کہ

اپنی غلطیوں کا اقرار کر لیا کرو

میری طبیعت خود ضدی واقع ہوئی ہے۔ اور میں اپنی اس کمزوری کا ہمیشہ اعتراف کرتا رہا ہوں میں یہ بھی خدا کے فضل سے کہتا ہوں کہ میں نے بدنیتی سے یا کسی کی تذلیل کے خیال سے کبھی کسی امر میں ضد نہیں کی۔ تاہم میں اسے کمزوری خیال کرتا ہوں۔ در اصل ترقی اور کامیابی کی یہ ایک راہ ہے کہ ہم اپنے عمل اور مفوضہ کاموں کے سرانجام دینے میں اگر کسی قسم کی غلطی کر بیٹھیں تو نہایت انشراح صدر کے ساتھ اس غلطی کا اعتراف کریں۔ اور اپنے اس بھائی سے جس کے مقابلے میں ہم سے غلطی کا صدور ہوا ہو۔ معذرت کریں۔ اس طریق سے اخلاق فاضلہ کا وہ حصّہ نصیب ہوگا۔ جس سے قبول حق برداشت اور حوصلہ کی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور محبت اور دلداری کی روح ترقی کرے گی۔ انسان جو وقت اپنے عزیزوں اور دنیا کے تعلقات سے من وجہ الگ ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی رائیں اور قلبی حالات کی اور صورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی سے کوئی مقابلہ اور کسی کی ناجائز محبت کا اثر اس کے دل پر نہیں ہوتا۔

میں نے اس سفر میں بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ہے۔ خدا کرے کہ اس میں استقلال اور اخلاص پیدا ہو جاوے ؏

ڈاکٹر مسافروں کے علاج اور طبی مدد کیلئے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے۔ اور ضروری ادویات کا ایک ذخیرہ کافی رکھا گیا ہے۔ میں ابھی قادیان ہی میں موجود تھا اور میرے سفر کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اتفاق سے میرے بائیں ٹخنے پر ایک رات ایک لوہے کا کیل لگ گیا۔ جسکی وجہ سے کئی دن تک میں اپنے گھر میں پڑا رہا۔ سفر کے وقت بھی اس کی تکلیف تھی۔ اس کے علاج کے لئے میں یوروپین ڈاکٹر کے کمرہ میں گیا۔ وہ نہایت اخلاق اور ہمدردی سے پیش آیا۔ روزانہ اس کو دھوتا اور پٹی لگاتا ہے۔ اور مسافروں کو جس قسم کی طبی مدد کی ضرورت ہو اس کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے میں اس کی ہمدردی کا ممنون ہوں۔

تاروں اور خطوط کا انتظام مسافروں کی تاروں اور خطوط کا خاص انتظام ہے۔ تار فوراً مسافر کے حجرہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور دوسرا بندرگاہ آنے سے پیشتر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ کہ ایسٹرن کمپنی کے نمائندے جہاز پر مسافروں کے تار لینے کے لئے موجود رہیں گے۔ چنانچہ عدن میں اور سوئز میں اور پورٹ سعید میں برابر اس کا انتظام ہے گویا مسافروں کو تار دینے کیلئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاز ہی میں اپنے تار حوالہ کر سکتے ہیں۔

غرض جو ممکن سہولت اور آرام مسافروں کو دیا جا سکتا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں کیجاتی۔

عدن ۲۵ جون کی صبح کو ۸ بجے ہمارا جہاز بمبئی سے ۱۶۵۰ میل طے کرنے کے بعد عدن پہنچا۔ اور جیسا کہ گذشتہ سال میں نے حالات سفر لکھتے ہوئے بیان کیا تھا۔ کہ عدن کا منظر ذرا بھی خوش آیند نہیں ہے۔ وہ خشک اور جھلسی ہوئی پہاڑیوں کا ایک سنگلاخ سطح مرتفع ہے۔ جہاں کسی قسم کی سبزی یا درخت کا نام تک نہیں۔

۲۱۔جون ۱۹۲۵ء یوم یکشنبہ

بمبئی سے عدن تک ۱۶۵۰ میل کا فاصلہ ہے۔ گذشتہ ۲۴ گھنٹوں میں جہاز نے ۲۵۰

میل بحر پیمائی کی۔ سمندر بدستور تلاطم کا زور ہے۔ میں نے ساری عافیت بستر راحت پر ہی سمجھی میرے رفیق سفر نے قے کرنی شروع کی۔ مجھ کو تحریک بھی نہیں ہوئی میں نے باہر نکلنا غیر ضروری سمجھا۔ مگر میرا رفیق حجرہ قے کرتا جاتا تھا۔ اور باہر جاتا اور کھانا کھاتا تھا۔ میں اپنے حجرہ میں کچھ پھل وغیرہ منگوا لیتا۔ اور وہیں ناشتہ کر لیتا۔ نمازیں بھی لیٹ کر پڑھیں۔ بعض بعض اوقات حافظ کا یہ شعر بھی پڑھتا تھا۔

بس آسان می نمود اول غم دریا بوئے سود،
غلط گفتم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

میرا رفیق سفر مجھے اُٹھنے کی اور میں اسکو بیٹھنے کی ہدایت کرتا تھا۔ مگر نہ انہوں نے میری مانی اور نہ میں نے انکی تجویز پر عمل کیا۔ خادم کیبن میرے لئے سنگترہ۔ ملائی کی برف اور ایسی چیزیں لاتا جو مفرح اور خوشگوار ہوں۔ میں قہوہ زیادہ پسند کرتا تھا اور وہ میرے طلب کرنے پر ہر وقت لے آتا تھا۔

۲۲۔ جون سنہ ۱۹۲۵ء یوم دوشنبہ

آج بھی سمندر میں اسی طرح جوش ہے۔ اور میری حالت بھی بدستور ہے۔ مجھے کوئی تکلیف قطعاً نہ تھی۔ مگر میں نہ اُٹھنے میں سکون سمجھتا تھا۔ میرے رفیق سفر کی حالت میں بھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ شام کو خواجہ صاحب تشریف لائے۔ اور اپنی تیار کردہ امرت دھارا (کیونکہ یہی انہوں نے کہا) میری پیشانی پر ملی۔ میں بہر چند اچھا تھا۔ مگر میں نے اخلاق سے بعید پایا کہ ان کی اس ہمدردی کا شکریہ نہ کروں۔ شیخ صاحب کے پوتے کی حالت نازک ہو چکی تھی۔ اس کا تذکرہ انہوں نے کیا۔ اور بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔ تو بے تکلف فرمائیے۔ حاضر ہوں انہوں نے کہا کہ نہیں ڈاکٹر علاج کر رہا ہے۔ کسی وقت طبیعت اچھی ہو تو جا کر اسے دیکھنا۔ چنانچہ میں صبح کو گیا اسکی حالت زیادہ خطرناک نہ تھی مگر چونکہ اس نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ اور نازک طبع تھا۔ اس پر والدین سے علیحدگی وغیرہ کے خیالات کا غلبہ بہت ضعیف ہو گیا تھا۔ میں اور ایک اور رفیق سفر جو اپنے مقدمہ کی پیروی کیلئے ولایت جا رہے تھے۔ اس کو اُٹھا کر اوپر تختہ جہاز پر لے آئے۔ سمندری ہوا نے اس کو

فائدہ پہنچایا۔ اور وہ اس گھبراہٹ سے نکلگیا۔ انکی علالت مجھے بھی لبتر سے اُٹھنے کی محرک ہوگئی۔ ورنہ میں نے عدن تک حجرہ میں پڑے رہنے کا عزم کرلیا تھا۔

۲۳ جون ۱۹۲۵ء یوم سہ شنبہ

گذشتہ رات تلاطم کا زور لگ چکا تھا۔ اور آج سمندر میں نسبتاً سکون آرہا تھا گذشتہ ۲۴ گھنٹوں میں جہاز نے ۳۱۵ میل طے کئے۔ جیسا کہ میں خواجہ صاحب سے کہہ چکا تھا کہ شیخ صاحب کے پوتے عبدالرحیم کو دیکھنے کے لیئے میں اٹھا اور دیر تک اسکو لیکر ڈیک پر بیٹھا رہا۔ آج دعا کے لئے غیر معمولی تحریک تھی۔ اسلئے سلسلہ کے لئے۔ حضرت اقدس کے لئے اور بعض دوستوں اور اپنے کنبہ کے لئے دل کھول کر دعائیں کی ہیں۔ بعض خوابوں میں مجھے رات مبشرات معلوم ہوئے الحمدللہ علےٰ ذالک۔ آج جہاز نے ۳۲۲ میل سفر کیا۔

ایک گجراتی خاتون اس جہاز پر ایک گجراتی خاتون معہ اپنے ۲ سالہ بچے کے اکیلی سفر کر رہی ہے۔ اور یہ اسکا پہلا سفر ہے۔ اسکا شوہر ڈاکٹر دہرو لنڈن میں ڈاکٹری کی تعلیم پاتا ہے۔ اور باپ بمبئی کا ایک مشہور تاجر پارچہ ہے شوہر کے بلانے پر جارہی ہے۔ اور ویمبلی اگزبیشن کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ ہندی اور گجراتی جانتی ہے۔ چونکہ ولایت کا سفر پیش آگیا ہے۔ اسلئے کچھ انگریزی بھی سیکھ لی ہے۔ اور روزمرہ کی ضروریات کیلئے کام چلا لیتی ہے۔ بلکہ مجھے کہدینا چاہیئے کہ خوب چلا لیتی ہے۔ اپنے لباس اور خوراک کو پسند کرتی ہے پھل وغیرہ کھا کر گذارہ کرتی ہے۔ کھانے کے کمرہ میں نہیں جاتی اپنی کیبن (حجرہ) ہی میں کھا لیتی ہے۔ نہایت حوصلہ اور دلیری سے نکلی ہے۔ اور تختہ جہاز پر دوسرے مسافروں کیطرح بیٹھی رہتی ہے۔ ڈاکٹر دہرو جونا گڈھ کے رہنے والے ہیں۔

میں نے ضروری سمجھا کہ اس خاتون سے ایک انٹرویو بہ حیثیت ایک اخبار نویس کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے منشا کا اس سے ذکر کیا۔ تو وہ اسکو جو میرے سوالات کا جواب

دینے کے لئے آمادہ ہوگئی جیسے کوئی نہایت تجربہ کار مدبّر۔ اس کے چہرہ پر پوری متانت اور سکون تھا کسی بھی قسم کا اضطراب نہ تھا میری جو گفتگو اس سے ہوئی میں اُسے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

میں۔ آپ نے یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے؟

خاتون۔ اس لئے کہ میرے پتی (شوہر) نے بلایا ہے۔ اس کو چہ میں وہاں ویمبلی کی نمائش بھی دیکھ لونگی۔

میں۔ کیا آپ اپنے سفر سے واپس آکر اپنے تجربات کا اظہار کریں گی؟

خاتون۔ ہاں میں واپس آکر اپنی بہنوں کو اپنے تجربات اور علم سے ضرور واقف کروں گی۔

میں۔ آپ لنڈن تک اکیلی جائینگی یا آپکے شوہر راستہ میں آملیں گے۔

خاتون۔ نہیں وہ مجھ سے مارسیلز میں آملیں گے۔

میں۔ کیا آپ انگریزی سوسائٹی کو پسند کرتی ہیں؟

خاتون۔ میں انگریزی سوسائٹی کو پسند کرتی ہوں۔

میں۔ آپ کا شوہر انگریزی طریق کے مطابق آپ کو اپنے دوستوں سے انٹروڈیوس کرائے گا۔ تو کیا آپ ان غیر مردوں سے ہاتھ ملائینگی؟

خاتون۔ میں مردوں سے تو ہاتھ نہیں ملاؤں گی لیکن عورتوں سے ہاتھ ملانے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

میں۔ ممکن ہے آپ کے شوہر جو انگریزی سوسائٹی کے اثر میں ہونگے۔ آپ کو غیر مردوں سے ہاتھ ملانے کی تحریک کریں۔ تو پھر آپ کا کیا عمل ہوگا؟

خاتون۔ میں یقین نہیں کرتی کہ وہ ایسا کریں گے۔

میں۔ کیا آپ وہاں جاکر انگریزی لباس پہن لینگی؟

خاتون۔ میں کوشش کروں گی۔ کہ اپنا لباس نہ چھوڑوں۔

میں۔ میں بھی آپ کو تاکید کرتا ہوں کہ آپ اپنے ملکی اور قومی لباس کو نہ چھوڑیں

کیا آپ کو اعتراض تو نہیں اگر میں آپ کے ساتھ اس مکالمہ کو شائع کر دوں۔

خاتون۔ اگر اس سے کسی کو فائدہ پہنچے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

نوٹ:۔ یہ ایک ہندو گجراتی عورت ہے۔ جو ہماری مستورات کیلئے سبق آموز ہے ایک زمانہ تھا کہ مسلمان خواتین میدان جنگ میں اپنی شجاعت جرأت کے قابل تقلید کارنامے دکھاتی تھیں۔ علمی مجالس میں انکی علمی قابلیت کا سکّہ تھا۔ حکومت کی عنان ہاتھ میں لیکر انہوں نے بتا دیا کہ وہ بہترین حکمران دماغ کے عطیہ سے محروم نہیں۔ مگر آج جو حالت ہے وہ ظاہر ہے۔ اب اگر نظر پڑتی ہے۔ تو وہ احمدی خواتین پر کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرکے اسلام میں عورتوں کے مقام اور شان کا پھر اظہار کریں۔

جہاز آج ۳۳۴ میل چلا ہے

بہت دیر تک خواجہ صاحب میرے پاس آکر بیٹھے رہے اور مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اس سفر میں اپنا طرز عمل انکے ساتھ یہ رکھا ہے کہ میں انکی سنتا جاؤں۔ تاکہ وہ جو کچھ اپنے خیالات لئے بیٹھے ہیں۔ ان کا پورا اظہار کر سکیں۔ کبھی کبھی میں کوئی بات کہدیتا تھا میں ان سے مکالمات پر تبصرہ الگ کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے یہاں کچھ نہ کہوں گا۔

پارسی ڈاکٹر سے ایک مکالمہ

تلاطم تو بدستور تھا مگر طبیعتوں میں عادت کیوجہ سے کچھ سکون ہو چلا تھا میرا رفیق سفر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں قے بھی کرتا جاتا تھا اور پھر تا بھی تھا میں سکون کے ساتھ اپنے بستر پر رہتا تھا۔ اور اب برخوردار عبدالرحیم کے بیمار ہو جانے کیوجہ سے اوپر جانے لگ گیا تھا۔ خواجہ صاحب کے ساتھ بھی گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آج ایک مختصر سا مذہبی مکالمہ ہو گیا شام کو جب ہم سونے لگے۔ تو حسب معمول ڈاکٹر صاحب نے اور میں نے اپنے اپنے طریق پر عبادت کر کے سونیکا انتظام کیا میں نے ڈاکٹر صاحب سے تجاہل عارفانہ کے طور پر سلسلہ کلام شروع کیا

عرفانی۔ ڈاکٹر صاحب آپ کس کی عبادت کرتے ہیں؟

ڈاکٹر۔ آگ کی۔ اس لئے کہ وہ روشنی دیتی ہے۔

عرفانی۔ تو کیا آگ کو بجھنے نہیں دیتے؟

ڈاکٹر۔ نہیں آگ کو ہمیشہ روشن رکھا جاتا ہے۔

عرفانی۔ اگر گھر کو آگ لگجاوے تو اُمید ہے۔ آپ نہ خود بجھاتے ہوں گے۔ اور نہ فائر بریگیڈ منگوا کر بجھانے دیتے ہونگے۔ کیونکہ وہ نور کا ظہور کامل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر۔ کچھ محجوب سا ہو کر ہنستے ہوئے نہیں اس وقت تک تو بجھانا ضروری ہوتا ہے ورنہ ہم خود یا شہر تباہ ہو جاوے۔

عرفانی۔ پھر کیا ہرج ہے ہونے دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کی عبادت کرنے میں خلل واقع ہوگا۔ اگر اسے بجھا دیا جاوے۔ یہ گناہ نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر۔ میں اس کو نہیں مان سکتا۔

عرفانی۔ اچھا آپ کے گھر میں بجلی تو ہمیشہ روشن رہتی ہوگی۔ محض بل بڑھ جانے کے خطرہ سے آپ اسے نہیں بجھاتے ہونگے۔

ڈاکٹر۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم زیادہ دیر روشنی رکھ نہیں سکتے۔ اس کا خرچ برداشت نہیں ہو سکتا۔

عرفانی۔ معلوم ہوا یہ عبادت کا طریق غلط ہے۔ بیشک انسان کو ایک نور کی ضرورت ہے۔ مگر وہ نور آسمان سے آتا ہے۔ اور دلوں میں سکینت بخشتا ہے۔ حق اور باطل میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں تو انسان کی خادم ہیں۔ پھر وہ معبود کس طرح ہو سکتی ہیں یہ حقیقت اسلام نے بتائی ہے۔ اصل میں آپ کا مذہب تو درست تھا۔ حضرت زرتشت خدا کے نبی تھے۔ مگر اب انکی تعلیمات اُٹھ گئی ہیں۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے مفہوم سے آپ لوگ ناواقف ہیں۔

ڈاکٹر۔ ہماری مذہبی کتابوں کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس خاص کام پر مقرر ہیں۔

عرفانی۔ پھر اپنے مذہب کی حقیقت سے آپ واقفیت کیونکر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ ہمکو وہی کرنا چاہئے۔ جو ہمارے بزرگ کرتے آئے ہیں۔

عرفانی۔ یہ تو غلطی ہے۔ آپکو سوچنا چاہئے۔ کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں۔ اس کی حقیقت

کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں بعض پارسی ایسا خیال کرتے ہیں۔ مگر میں نہیں کرسکتا۔ اور نہ اس کے لئے زیادہ وقت دیسکتا ہوں۔

۲۴ جون ۲۵ ۱۹ء

آج سمندر میں سکون ہے۔ میں نے معمولات سے فارغ ہو کر چند خطوط لکھے۔ تاکہ عدن پہنچکر پوسٹ کرسکوں۔ ہوا میں حدت ہوگئی ہے۔ جہاز نے ۱۲ بجے تک ۳۰۴ میل طے کیا ہے عدن تک اب صرف ۸۰۷ میل کا فاصلہ ہے۔ ہندوستان کو جانے والی ڈاک کے لئے مسافر خطوط لکھ رہے ہیں۔ لیکن جو اپنے گھر ولایت کو جا رہے ہیں وہ زیادہ تر کھیل کود میں مصروف ہیں۔

جہاز پر کھیلیں جہاز پر قریباً ہر قسم کی کھیلوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اور لوگ ان کھیلوں کے علاوہ جو زیادہ تر بیٹھ کر کھیلی جاتی ہیں۔ شطرنج۔ تاش وغیرہ بعض دوسری کھیلیں کھیلتے ہیں جنمیں نشانہ بازی وغیرہ بھی ایک قسم کی ہوتی ہے۔ اس میں مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ اور ہار جیت بھی۔ بلکہ مجھے کہنا چاہئے کہ قریباً ہر کھیل میں عام ہار جیت کے علاوہ قماربازی بھی ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب اسے جائز سمجھتی ہے۔

خواجہ صاحب اور قادیان خواجہ صاحب آج بھی دن کا اکثر حصہ اور رات کا ایک حصہ میرے پاس آکر بیٹھے رہے۔ آج انکی گفتگو میں قادیان پر اعتراضات کا ایک رنگ تھا۔ ایسے طور پر کہ گویا نہایت دلسوزی سے کہہ رہے ہیں۔ مجھے خواجہ صاحب کی سادگی پر افسوس اور رحم آتا تھا۔ اس لئے کہ وہ مجھے جانتے تھے۔ کہ میں نے اپنی عمر کے بہت بڑے حصہ میں انکو مطالعہ کیا ہے۔ اور میں انکی سپرٹ سے اس زمانہ سے واقف ہوں جبکہ بقول انکے ایام اخلاص و ایثار تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام زندہ تھے۔ اور حضرت صاحبزادہ میرزا بشیر احمد صاحب کی شادی کے متعلق راولپنڈی کے چودہویں صدی اخبار میں ایک مضمون خلاف نکلا تھا۔ وہ لاہور میں درد گردہ سے بیمار ہوگئے۔ میں ان کی عیادت کو گیا۔ تو اس وقت بھی انہوں نے قادیان پر اعتراضات کئے تھے۔ خود حضرت مسیح

موعود علیہ السلام اور حضرت ام المومنین کی ذات پر فضول خرچی کا الزام لگایا تھا اس لئے خواجہ صاحب کے لئے یہ نئی بات نہ تھی۔ مگر تعجب یہ تھا کہ باوجود مجھے جانتے ہوئے پھر انہوں نے نہایت باریک پیرائے میں کہا کہ قادیان جانے کے لئے دل بہت چاہتا ہے مگر وہاں جاکر تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ کہ کیسے گدی بن گئی اور حالات بدل گئے ہیں۔

میں نے کہا کہ قادیان کے برکات دنیا کے آخر تک کم نہیں ہوسکیں گے۔ جیسے مکہ معظمہ کے ساتھ جو برکات ہیں۔ وہ تبدیل نہیں ہوسکتی ہیں۔ اور آپ تو گئے ہی نہیں آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ ہاں حالات بدل گئے ہیں آپ کے۔ اور اب آپ کو قادیان جاکر بڑی خوشی ہوگی۔ گدی۔ کی بنیاد تو خود خدا تعالیٰ نے رکھدی۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو وہاں نازل کر دیا۔ اور انہوں نے ہمیشہ کیلئے سلسلہ کا مرکز اسے قرار دیدیا۔ یہ میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے۔ کہ اسکو بدل دیا جائے۔ آج آپ جس چیز کو گدی کہتے ہیں۔ سنہ ۱۹ء میں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دن اسکو بھول گئے تھے

خواجہ صاحب نے کہا کہ میں بحث نہیں کرتا۔ میں نے جواب دیا کہ میں خود اسے ناپسند کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ سے اسے میں ترک کر چکا ہوں۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ دیر تک مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں کہیں کہیں کوئی جواب دے جاتا تھا۔ ورنہ عام طور پر سنتا تھا۔ جو کچھ وہ کہتے تھے۔ اپنے مشن ووکنگ کی کامیابی کے متعلق پہلوؤں پر وہ خود ہی روشنی ڈالتے اور اس کے مزے لیتے تھے۔ اور ہمارے مشن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے جاتے تھے میں ایک ہی بات کہدیتا تھا۔ کہ میں اب خود جا رہا ہوں اپنی آنکھ سے دیکھ کر انشاء اللہ موازنہ کرسکوں گا۔ میرے نقطہ نظر میں کامیابی اور ناکامی کا اور پہلو ہے۔ اور وہ آپکے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔ اگر ہم سارے یورپ کو مسلمان کرلیں اور وہ اصول اسلام اور حقیقت مذہب سے غافل یا ناواقف ہوں تو میں اسے کامیابی نہیں سمجھوں گا لیکن اگر ایک آدمی جسکی کوئی بھی پوزیشن نہ ہو۔ حقیقت اسلامیہ سے واقف ہوکر عملی قوت لیکر اسلام میں داخل ہو۔ تو میں۔

اس ایک گو منیظر کامیابی کہونگا

ہم کو صرف اشتہار نہیں دینا ہے۔ اور یہ تجارتی متاع نہیں ہے۔ جس کیلئے ہم کو حق اور حقیقت کی پرواہ نہ ہو۔ بلکہ یہ نفس الامر میں جان ہے۔ جس کے بغیر انسان زندہ کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ پس میں کامیابی کا دوسرا معیار رکھتا ہوں۔ اور شاید وہ آپ سے بالکل مختلف ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ ایکدن میں یا چند سال میں ایسا انقلاب نہیں ہوسکتا۔ کہ یورپ کے لوگ بایزید بسطامی بن جاویں۔ میں نے کہا کہ میرا آپ سے بالکل اتفاق ہے۔ اور اگر ہم نومسلموں سے یہ توقع کریں۔ کہ پہلے ہی دن ان میں یہ بات پیدا ہو جاوے۔ جو ہم میں آجتک بھی نہیں تو یہ غلطی ہوگی۔ مگر میں اسکو تسلیم نہیں کرتا۔ کہ اسلام کو ہم انکی ضرورت کے مطابق یورپی قالب میں ڈھال دیں پہلے انکی ایک ضرورت محسوس کریں۔ جو رسم وعادت یا تمدنی ضروریات نے پیدا کردی ہے۔ اور پھر اسلام کی تعلیم کو وہی شکل دینے کیواسطے تیار ہو جائیں۔ اس طرح پر

اسلام کی قلب ماہیت ہوجائیگی

پھر وہ اسلام نہ رہیگا جو قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ بلکہ وہ ہماری ایجاد اور اختراع ہوگا۔ عمل میں کمزوری قابل پذیرائی عذر میرے نزدیک ہوسکتا ہے۔ مگر حقیقت اسلامیہ کی خود ساختہ صورت کو میں کسی قیمت پر قبول نہیں کرسکتا۔ خواجہ صاحب نے کہا آپ کو شاید کسی نے غلط کہدیا ہوگا۔ کہ ہم یورپ میں اسلام کو کسی اور رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ میں نے کہاکہ میں اعتراض نہیں کرتا میں تو اصولی طور پر آپ سے گفتگو کررہا ہوں۔ اور یہ اب جاکر دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا۔ کہ

لنڈن میں کیسا اسلام پیش کیا جارہا ہے

دیر تک یہ صحبت رہی۔ اور ۱۱ بجے کے قریب خواجہ صاحب تشریف لیگئے۔ میں بھی آکر سوگیا۔

۲۵ جون ۱۹۲۵ء یوم جمعرات (عدن)

آج صبح ۹ بجے جہاز عدن پہنچگیا۔ میں رات کو ہی بعض خطوط لکھتا رہا تھا۔ اور صبح اٹھ

کر اخبار کیلئے ایک مضمون لکھا۔ اور اسطرح پر ہندوستان کی ڈاک کو مکمل کیا۔ اور تمام خطوط پوسٹ کرنے کیواسطے تیار ہوگیا۔ عدن تک ہندوستان ہی کے ٹکٹ ڈاک خانہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور میرے پاس اس ڈاک کا سامان موجود تھا۔ جہاز پر ایک لیٹر بکس اس غرض کیلئے رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مسافر اپنے خطوط اس میں ڈالدیتے ہیں۔ اور جہاز بندرگاہ پر پہنچتے ہی وہ ڈاک کے لئے عدن بھیجدئے جاتے ہیں۔

سعید جباری سعید جباری جو بمبئی سے اسی جہاز پر سوار ہوا تھا۔ اس سے راستہ میں ملاقات کا موقعہ نہ ملا اس لئے کہ وہ تھرڈ کلاس میں تھا۔ جو عدن تک آیا تھا۔ صرف ایک روز جب کہ میں اوپر ضلع گجرات کے مسلمان خلاصیوں سے ملنے گیا۔ اس سے ملاقات ہوئی تھی یہاں وہ اتر گیا اور مجھے افسوس رہا کہ زیادہ گفتگو اس سے نہ ہوسکی میرے رفیق حجرہ پارسی ڈاکٹر صاحب بھی منزل مقصود پر پہنچ چکے تھے۔ اور وہ اترنے کے لئے بیقرار سے تھے۔ یہاں انکی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔ مختلف قسم کی امیدوں اور خوف کے درمیان وہ اترنے کیلئے تیاری کر رہے تھے۔ انکے لینے کے لئے ایک کشتی آئی ہوئی تھی اور وہ اس میں سوار ہونے کے لئے اُترے۔ جاتی دفعہ اُنہوں نے ان چند روز کی رفاقت میں محبت آمیز سلوک کا شکریہ ادا کیا۔ اور خواہش کی کہ میں عدن آؤں تو واپسی پر ان سے ملوں میں نے کہا۔

یار زندہ صحبت باقی

اور ہاتھ ملا کر انہیں خدا حافظ کہا۔ خواجہ صاحب شہر جانے کو تیار تھے میں نے عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب اپنے بیٹے کے نام ایک تار لکھ کر دیا۔ کہ وہ کنارہ پر جا کر دیدیں۔ کیونکہ میں خود شہر جانیکا خواہشمند نہ تھا۔ گذشتہ سال کچھ حصہ اسکا میں دیکھ چکا تھا۔ گجراتی طالب علم بھی اپنے بعض واقفوں اور آشناؤں سے ملنے کیلئے اتر گئے۔ اور یہاں اُترنے کی انکو بہت بڑی خوشی تھی۔ خصوصاً اسلئے کہ وہ ایک طرح پر گھر کا کھانا کھا ئینگے چنانچہ جب وہ واپس آئے تو اس قدر خوش تھے۔

گویا جاگیر ملگئی

میں نے پوچھا عدن سے آپ بہت خوش لوٹے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ آج ہم نے بہت اچھا کھانا کھایا ہے۔ اور اعلےٰ درجہ کا کھانا بھی وہ تعریف کرتے تھے۔ اسے سکہ ہنڈ کہتے تھے۔ وہ دہی میں کچھ لائیتے کی سی قسم کا تھا۔ مجھے اُنہوں نے پیش کرنا چاہا۔ میں نے عذر کردیا۔ کہ

میں نہیں کھایا کرتا

جہاز کو یہاں چار گھنٹے تک ٹھہرنا پڑا۔ اس عرصہ میں عجیب مصروفیت کا عالم تھا۔ جہازی مسافر اور عدنی تاجر ایک عجیب چہل پہل تھی۔ کشتیوں کا بازار پرلطف تھا۔

عدن

عدن کا منظر بہ حیثیت منظر خوش آیند نہیں۔ اس لئے کہ وہ صرف خشک اور جھلسی ہوئی پہاڑیوں کا ایک سنگلاخ ہے۔ جہاں کسی قسم کی سبزی یا درخت نظر نہیں آتا۔ لیکن جہاز کے تلاطم افزا موسم اور چند روزہ سمندری سفر میں زمین دیکھنے کا شوق ایک عجیب کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لئے بمبئی سے چلے ہوئے مسافر جو سمندر کی تلاطم انگیز لہروں اور بحری بیماری سے گھبرائے ہوئے تھے۔ ان سنگلاخ چٹانوں کو نہایت بیقراری سے دیکھ رہے تھے۔ آٹھ دس میل کے فاصلہ ہی سے عدن کی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور دوربینوں کو لیکر مسافر تختہ جہاز سے سیر کرتے ہیں۔ جونہی جہاز لنگر انداز ہوا بہت سی کشتیاں دونوں طرف آموجود ہوئیں۔ اور یہودی تاجر رومی ٹوپیاں پہنے ہوئے مراقہ کا کام لیے تختہ جہاز پر چڑھ آئے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اپنا مال بیچنے کے لئے

ایک بھی مسلمان تاجر موجود نہ تھا

صرف روئٹر کمپنی کا ایک سومالی مسلمان تار خبروں کا ایک ٹائپ شدہ اخبار بیچنے کیلئے جہاز پر چکر لگا رہا تھا۔ انگریز مسافروں نے اس ٹائپ شدہ اخبار کو خریدنا شروع کردیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سب پرچے بک گئے۔

اخبار بینی کا شوق

اگرچہ میرے لئے یہ پہلا موقعہ نہ تھا۔ کہ میں انگریزوں کے اخبار بینی کے شوق کو دیکھتا۔ لیکن ایک ایسے مسافر کیلئے جو پہلی مرتبہ سفر کرتا ہے۔ یہ ایک قابل غور مطالعہ ہوگا۔ جہاز پر انگریزوں کے سوا ہندو اور مسلمان مسافر بھی تھے

مگر میں نے غور سے دیکھا کہ کسی ایک نے بھی وہ پرچہ خرید نہیں کیا۔ اس کے سوا اور بھی ولایت کے مختلف اخبارات کے مصوّر اور غیر مصوّر اڈیشن موجود تھے۔ جو دھڑا دھڑ فروخت ہو گئے تھے۔ یہ انگریزی قوم کی علم دوستی اور اخبار بینی کے مذاق کا ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ میں نے بھی ڈیلی مرر کا ایک پرچہ خرید کیا۔ اور اسے اپنے کیبن میں رکھ کر بھی معروف نظارہ ہو گیا۔

تار کا انتظام

عدن میں جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں مجھے اترنا نہ تھا۔ میں اپنے خطوط اور تار بھیج چکا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میں اپنا تار جہاز ہی پر دے سکتا تھا۔ اور اس طرح پر میں کم از کم ایک روپیہ بچا سکتا تھا۔ ایسٹرن کمپنی کا نمائندہ جہاز پر موجود تھا۔ اور اس کمپنی کے نرخ سرکاری نرخ سے کم ہیں۔ جو تار میں نے عزیز مکرّم شیخ محمود احمد صاحب کو دیا اس پر ساڑھے سات روپے خرچ ہوئے۔ اور ایسٹرن کمپنی کا نمائندہ اسے چھ روپیہ کچھ آنے میں بھیج دیتا۔

بہرحال جہاز لنگر انداز ہو کر ہندوستان سے بار کیا ہوا آٹا اتارنے میں معروف ہو گیا۔ اور آٹے کی بوریاں اتار کر بارسیلز کے لئے عدن کے بہت سے تھیلے بار کرنے لگا اس میں کافی وقت صرف ہوا۔

پارسی قوم کا انٹرپرائز

پارسی قوم ہندوستان میں اپنی علمی اور تجارتی اور مالی حیثیت سے بہت بڑی پوزیشن رکھتی ہے۔ اور عدن میں بھی اسکا تجارتی کاروبار بہت بڑھا ہوا ہے۔ صرف ایک فرم کاوس جی ڈنشا نامی عدن میں سب سے زیادہ مالدار۔ مقتدر۔ اور سٹیمروں کی مالک اور مختلف قسم کے ٹھیکوں کی واحد اجارہ دار ہے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ساحل عرب اور ساحل افریقہ کی سب سے زیادہ تجارت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس فرم کی بدولت یہاں بہت بڑی پارسی کمیونٹی جمع ہو گئی ہے۔ میرے لئے مسلمانوں کی تجارتی حالت پر غور کرنے کے لئے یہ ایک افسوسناک منظر تھا۔ وہ قوم جو تجارتی حیثیت سے بھی ممتاز رہ چکی ہو۔ اور بالآخر حکومت اور سلطنت کے مقام تک پہنچی ہو۔ آج اپنے ہی ملک میں دوسروں

کی دست نگر اور محتاج ہے۔

جغرافیائی کیفیت

عدن کی اہمیت جہاز رانی کے نقطۂ خیال سے اس لئے بھی ہوئی ہے۔ کہ یہ بہت بڑا کوئلہ کا سٹیشن ہے۔ اور بحیرۂ احمر کے دروازہ پر ہے۔ اسکی لمبائی پانچ میل تک اور چوڑائی تین میل تک ہے۔ پی۔ اینڈ۔ او کمپنی اور دوسری جہاز ران کمپنیوں کے جہازات یہاں ضرور ٹھیرتے ہیں۔ لاسلکی کا بھی سٹیشن ہے۔ آب ہوا گرم ہے مگر مضر صحت نہیں۔ عدن بجائے خود ایک اسی نام کی سٹیلمنٹ کا دار الخلافہ ہے اس سٹیلمنٹ کا رقبہ ۷۵ مربع میل ہے۔ عدن پروٹیکٹوریٹ کا رقبہ نو ہزار مربع میل ہے۔ اور یمین کے شمال مغرب تک چلا گیا ہے۔ اور دوسری طرف حضر موت تک پھیلتا ہے۔ جزیرہ سقوطری ساحل افریقہ کی طرف اور پریم وغیرہ عربی ساحل کی جانب اسی کے ملحقات میں داخل ہیں۔ اور یہ پروٹیکٹوریٹ گورنر بمبئی کے ماتحت ہے۔ عدن میں مختلف مذاہب کے باشندے (جو باہر سے آئے ہوئے ہیں تجارت کرتے ہیں۔ سومالی مسلمان عام طور پر مزدوری پیشہ ہیں

ایک زمانہ میں عدن میں سمالی لڑکوں کی غوطہ زنی کا عجیب تماشہ ہوا کرتا تھا۔ جو سمندر میں پھینکے ہوئے سکّوں کو نکال لاتے تھے۔ مگر اب یہ فعل حکمًا بند ہے۔ اور رفتہ رفتہ اتنا کم ہو گیا ہے کہ قریبًا معدوم ہے۔

بحیرۂ قلزم

اب ہم بحیرہ عرب سے نکلکر بحیرۂ قلزم میں داخل ہو رہے تھے۔ بحیرہ عرب میں بحر پیمائی کے ابتدائی ایام میں متلاطم سمندر میں ہماری وہی حالت تھی جسکا نقشہ حافظؒ کے اس شعر میں موجود ہے۔

بس آساں مینمود اوّل غم دریا بہ بوئے سود
غلط گفتم کہ یک موجش بصد من زرنمی ارزد

اس شعر کے متعلق تاریخی روایت یہ ہے کہ خواجہ حافظؒ کو وزیر دکن نے اس کا شہرۂ شاعری سُنکر بلا بھیجا۔ لیکن جب حضرت حافظ جہاز پر سوار ہوئے۔ اور متلاطم سمندر نے کشتی کو باد مخالف کے جھونکوں سے کھیلنے کا موقعہ دیا۔ اور جان کے لالے پڑے۔ تو حضرت نے ناخدا کو واپسی کیلئے کہا۔ اور وہ اُسے واپس لیگیا۔ تب خواجہ نے حسب حال یہ غزل لکھ کر بھیجدی اور

اپنی سلامتی پر شکر کیا۔ یہی حال بحیرہ عرب میں ہمارا تھا۔ اگر اختیار میں ہوتا۔ تو واپس لوٹنے کو ترجیح دیتے۔ لیکن بحیرہ قلزم میں داخل ہونے پر کبیدگی اور افسردگی جاتی رہی اور سمندر کی پاک و صاف ہوائے دماغ کی اور ہی کیفیت کر دی سمندر کے تلاطم اور امواج کی تھپیڑوں سے جو بیکلی بحیرہ عرب میں رہتی۔ اس سے تو نجات ہو گئی۔ مگر افریقہ اور عرب کے ساحلوں نے فلسفے میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دی۔

یادِ ایّامِ سلف نے ہائے کیا تڑپا دیا

جہاز نہایت امن و سکون سے سرگرم بحر پیمائی تھا۔ لیکن عرب کے ریگ زار ساحل اور افریقہ کے ساحل کی چٹان اسلام کی اس شان و شوکت کے نظارے سینما ٹوگراف کی طرح یکے بعد دیگرے میرے دل و دماغ میں گذرنے لگے۔

سال گذشتہ کی کیفیت جب اس سمندر سے میں گذرا تھا۔ پھر تازہ ہو گئی۔ اور میں کیفیت کے اظہار کی طاقت اپنے قلم و زبان میں نہیں پاتا۔ گذشتہ اسلامی شان و شوکت کا ایک مرثیہ تھا کہ میرا دل پڑھتا تھا۔ اور آنکھیں اشک باری کر کے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرتی تھیں۔

ایک طرف عرب اور دوسری طرف افریقہ اور جہاز ان دونوں کناروں کے درمیان مصروف بحر پیمائی تھا۔ میں اپنی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے کیبن میں اکیلا رہ گیا تھا۔ جی بھر آیا اور خوب دل کھول کر رویا۔ ایک وقت تھا کہ یہ سمندر اسلام کا جولانگاہ تھا۔ اور عرب اور افریقہ میں بہادران اسلام کا سکّہ جاری تھا۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ہم اپنے گھر میں ہی مسافر اور اجنبی ہیں۔ اور اغیار کے دست نگر۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

ان خیالات کا دیر تک دل و دماغ پر اثر رہا۔ خواجہ صاحب رات کو گیارہ بجے تک تختۂ جہاز پر میرے پاس بیٹھے رہے۔ پُر لطف صحبت تھی۔ مصلح موعود۔ انصار اللہ کی مفروضہ سازش بوہروں کے ملا سے ڈھائی سو روپیہ کا وظیفہ۔ نواب صاحب رامپور کی ملاقات۔ اور بارہ سو سالانہ کا وظیفہ وغیرہ امور پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ اس طریق پر اپنی کامیابیوں کا اظہار کرتا

چاہتے تھے۔ مگر مجھ پر ان باتوں کا کیا اثر؟

پھر انہوں نے قرآن مجید کے حقائق اور علمی تصانیف کا تذکرہ کیا۔ چونکہ ان امور کیلئے میں نے حد البحث کرنی ہے۔ اس لیے یہاں محض ڈائری کے التزام کے طور پر لکھدیا ہے۔

خواب گذشتہ شب میں نے خواب دیکھا۔ کہ ایک لکڑی کا گھوڑا ہے۔ جو ساز و سامان سے کسا ہوا ہے۔ ایک دوست جو بڑے معزز ہیں۔ مگر مجھے نام یاد نہیں رہا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اسے دیدوں۔ میں نے اس کے ایک نوکر کو کہا کہ لیلو۔ اتنے میں اس گھوڑے میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اور وہ پویہ دوڑنے لگا۔ اور میں کہتا ہوں

دیکھو میں نے زندگی پیدا ہو گئی ہے

واللہ اعلم بالصواب۔

وہ پانی اور وہ سرزمین جو اسلام کی جولانگاہ تھی۔ آج ان سواحل پر اور ان پانیوں پر اسلام بیکسی کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

بیکسے شد دین احمدؐ ہیچ خویش و یار نیست
ہر کسے در کار خود با دین احمد کار نیست

جن کے اسلاف ان کناروں پر خدائے قدوس و اکبر کا جلال ظاہر کرتے تھے اور جن کے نعرہائے توحید دشت و جبل میں ایک گونج پیدا کرتے تھے۔ آہ آج وہ بستیاں سونی پڑی ہیں اور حاملان احمدیت سے مطالبہ کرتی ہیں۔ کہ

بشتابید نصرت را

سواحل عرب کی خانہ جنگیوں نے جو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس سے دل پر ایک ٹھیس لگی اور حسرت کے آنسو گرا کر میں اپنے کیبن میں چلا گیا۔

الغرض بحیرہ قلزم میں ہمارا جہاز نہایت سریع السیر ہو گیا۔ ہر روز جہاز کی رفتار پر جو ٹوٹلے اور اندازے بتائے جاتے ہیں۔ اور صحیح اندازے والا جیت جاتا ہے در اصل یہ بات ہے کہ **پل کا تخمینہ** روز غلط نکلتا ہے۔

ناظرین شاید پُل کے لفظ سے وہ پل مراد سمجھیں۔ جو کسی دریا پر عبور کے لئے بنایا جاتا ہے

جہاز رانی کی ڈکشنری میں پل یا برج سے وہ سب سے بلند جگہ مراد ہوتی ہے۔ جہاں جہاز کا کوئی نہ کوئی ذمہ وار افسر ہاتھ میں دُوربین لئے ہوئے کھڑا رہتا ہے۔ اور راستہ کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔ تاکہ جہاز ہر قسم کی ٹھوکر اور آفت سے محفوظ چلا جائے۔ اور وہ عندالضرورت فوراً جہاز کا رُخ بدل سکتا ہے۔ یا اُسے ٹھہرا سکتا ہے۔ یہاں بھی جہاز کا گھڑیال رہتا ہے۔ جو ہر آدھ گھنٹہ کے بعد بجتا ہے۔ رات دن کے ۲۴ گھنٹے یہاں چھ حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ اور ہر آفیسر چار گھنٹے تک کام کرتا ہے۔ غرض اس مقام کو اصطلاح جہاز میں پل کہتے ہیں۔

قبلہ کی تبدیل

بحیرۂ قلزم میں جوں جوں جہاز آگے جاتا ہے قبلہ نماز میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ عدن سے آگے چلکر شمال مشرقی گوشہ میں نماز کا رخ ہو گیا۔ اور اس سے بھی آگے چلکر جدہ سے آگے گذر کر قبلہ کا جنوب ومشرق کو ہوا۔ اور اس طرح پر جوں جوں ہم آگے چلتے ہیں۔ قبلہ میں تبدیلی ہو رہی ہے

یہودی تاجروں کے متعلق کچھ اور طریق خرید و فروخت

میں نے ابھی کہا ہے کہ عدن میں یہودی تاجر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے جہاز پر اور اس کے گرد نیچے کشتیوں میں کثرت سے پھرتے ہیں یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اپنی تجارتی متاع لیکر آتے تھے۔ یہ دوکانہائے رواں تھیں اور سمندر پر تیرتی پھرتی تھیں میں نے دیکھا کہ وہ ہر ایک زبان بولتے تھے۔ انگریزی۔ اطالی۔ ہندوستانی۔ عربی۔ ان تجارتی کشتیوں میں جو متاع تجارت میں نے دیکھا وہ علے العموم انگریزوں کی ضروریات اور عام مسافروں کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ سگار۔ سگریٹ۔ دیاسلائی مختلف قسم کے اچار۔ میوہ جات۔ اناناس وغیرہ کے ڈبے۔ خرید و فروخت کا طریق بھی دلکش تھا۔ تاجر نیچے سمندر میں تھا اور خریدار اوپر جہاز میں۔ جب کسی چیز کو دکھانا یا بیچنا منظور ہوتا۔ تو تاجر ایک لمبی رسی اوپر پھینکتا تھا۔ جکو خریدار پکڑ لیتا اور دوسری رسی اور چھینکا تاجر کے ہاتھ میں رہتا۔ تاجر اپنی فروختنی چیز چھینکے میں رکھدیتا۔ اور خریدار اوپر کھینچ لیتا۔ قیمت کا فیصلہ

پہلے ہو چکا ہوتا تھا۔ اس لئے خریدار اسی چھینکے میں دام رکھ دیتا۔ اور تاجر اسے کھینچ لیتا۔ عدن سے یورپ جانے والے انگریز مرد اور عورتیں بعض تحایف خرید کرتے تھے۔ اور یہ یاد ترشتر مرغ یا دوسرے جانوروں کے پروں کے گلوبند سے ہوتے تھے۔ جنکو عموماً انگریز عورتیں موسم سرما میں گلے میں ڈال لیتی ہیں۔ یہودیوں کے علاوہ بعض ماہی گیر اور سومالی لوگ بڑے بڑے گھونگے۔ اور سیپیاں اور اس قسم کی چیزیں بھی فروخت کرتے تھے۔ اور انگریز بطور تحایف انکو نادرات کی قسم سے سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔

سومالیوں کی تربیت کی ضرورت

میں جب کشمیر گیا تھا۔ تو مجھے کشمیریوں کو دیکھکر بہت افسوس ہوا۔ کہ ایسی ذہین اور طبّاع قوم جو نہایت کار آمد اور مفید ہو سکتی ہے۔ عدم تربیت کی وجہ سے کس طرح تباہ ہو رہی ہے۔ میں نے سومالی مسلمانوں کو جب یہاں دیکھا۔ تو وہ درد اور زخم تازہ ہو گیا۔ یہ ایسے طبّاع ذہین اور محنت کش ہیں۔ کہ مجھے حیرت اور تعجب ہوا۔ مختلف زبانیں نہایت عمدگی سے وہ بولتے تھے۔ اور ایسے مستعد اور پھرتیلے تھے۔ گویا مشین کے پرزے ہیں۔ بڑے جفاکش اور محنتی مگر قومی ادبار نے انہیں حالی سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اگر ان لوگوں کی تربیت ہو۔ ان میں تعلیم ہو۔ اور **اسلامی** روح ان میں پیدا کی جائے۔ تو یہ ایک مفید اور نہایت ہی کار آمد ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ہو تو کیونکر ہو۔

غرض ان نظاروں کو دیکھتا ہوا دماغ مختلف قسم کے **جذبات** کی امواج کو اُٹھتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ میرا دل و دماغ بجائے خود ایک سمندر بن رہا تھا۔ کہ اس میں لہریں پیدا ہوتی تھیں۔ اور سمندری موجوں کیطرح اٹھ کر اسی میں ختم ہو جاتی تھیں۔ سمندری موجوں کو تو گذرنے والے جہازوں کے مسافر ہی کم از کم دیکھ سکتے تھے۔ اور یہ میری موجیں۔

دل سے اُٹھتی اور دل ہی پر ختم ہو جاتی تھیں

بحیرۂ قلزم میں

اب ہم بحیرۂ قلزم میں داخل ہو چکے تھے۔ دُور تک دونوں طرف پہاڑیاں اور کنارہ نظر آتا تھا۔ اور عرب اور افریقہ کے ساحلوں کے درمیان میں گذر رہا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے بنجر جزیرے اور چٹانیں دور دور یہ

نظر آتی ہیں۔ رات کا منظر اور بھی دلفریب ہو جاتا ہے۔ جہاز جو گذرتے ہیں۔ تو وہ سمندر میں گویا بقعہ نور ہوتے ہیں۔ اور دور سے روشنی کا منار ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ اور انسان کو سبق دیتا ہے۔ کہ تیری زندگی اگر دوسروں کیلئے راہنمائی اور خطرات سے حفاظت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ تو تجھ پر افسوس! دیکھ میں اس سنسان جگہ پر بھی کسی اجر کی خواہش کے بغیر دوسروں کی رہنمائی کا کام کرتا ہوں۔ اور یہ مقام تجھے میسر نہیں آسکتا۔ جب تک تیرے قلب میں سوزش نہ ہو۔

تو آپ جلیگا تو دوسروں کو روشن کریگا

میں نے روشنی کے منار کو زبان حال سے یہ کہتے ہوئے سنا اور اپنے قلب کو دیکھا اسے سن پایا گرمانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ابھی بے حسی میں جا رہا ہوں

۲۶ جون ۱۹۲۵ء یوم جمعہ

رات خوب آرام سے گذری۔ بہت صبح اٹھا۔ اور توفیق دعا محسوس کی۔ اس لئے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اور نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت کیلئے تختۂ جہاز پر اوپر چلا گیا۔ جہاز مصروف بحر پیمائی تھا۔ مسافر اپنے حجروں میں سو رہے تھے۔ اور کچھ تختۂ جہاز پر سوئے ہوئے تھے میں نے اس تنہائی کے وقت کو غنیمت سمجھا۔ اور محبوب حقیقی سے راز و نیاز کی باتیں کیں۔ اور قرآن مجید کی تلاوت سے از بس مسرور ہوا۔ ایسے اوقات زندگی میں کبھی آتے ہیں۔ کہ طبیعت نمازیں دعائیں۔ قرآن کریم کی تلاوت میں ایسی لذت محسوس کرتی ہے۔ کہ الفاظ اسے ادا ہی نہیں کر سکتے۔ اور اس وقت تنہائی اور خلوت کیلئے بیحد جوش ہوتا ہے۔

اس لئے تلاوت کرکے پھر نیچے حجرہ میں آگیا۔ اور پھر مصروف دعا رہا۔ اور خیالات کے ایک سلسلہ میں نیند غالب ہوئی۔ اور سو گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ مفتی فضل رحمٰن صاحب کے ساتھ میں ڈیوڑھی جا رہا ہوں (سر وقار الامراکی ڈیوڑھی مراد ہے) راستہ میں میں تانگہ والے پر ناراض ہوا۔ اور محسوس کرتا ہوں کہ ۲۷ کو میں نے جہاز پر جانا ہے۔ پورٹ سعید سے

واپس آیا ہوں۔ پھر خواب ہی میں کہتا ہوں۔ کہ ٹھیرو۔ پھر دیکھنے تو دو۔ شاید خواب ہی ہو ہے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ

جہاز مصروف بحر پیمائی ہے۔ اور میں اپنے حجرہ میں ہوں

آج جہاز ۴۷۵ میل چلا ہے۔ سمندر صاف ہے۔ تختہ جہاز پر کھیلوں کے ٹورنمنٹ ہو رہے ہیں۔

شام کا کھانا کھا کر میں نے مغرب و عشاء کی نماز ادا کی۔ اور نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول میں اوپر چلا گیا۔ میرا معمول جہاز میں یہی ہے کہ مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔ خواجہ صاحب بھی حسب معمول تشریف لائے۔ اور دس بجے تک بیٹھے رہے۔ آج انکی گفتگو کا موضوع اپنی بیماری اور اس سے صحت اور بعض نسخوں کے الہاماً بتائے جانے کا ذکر کرتے تھے۔

مکہ معظمہ کے سامنے دس بجے کے قریب جہاز جدہ کے سامنے سے گذرنا تھا میں نے اس کے متعلق پہلے سے علم اور اطلاع حاصل کر لی تھی۔ اسلئے میں اُٹھ کر اپنے حجرہ میں آ گیا۔ میں نیچے آیا ہی تھا۔ کہ میرے حجرہ کا خادم دوڑتا ہوا آیا اور کہا۔ کہ

صاحب اب ہم جدہ کے سامنے سے گذرتے ہیں

میں نے اسے کہہ رکھا تھا کہ مجھے اطلاع دے۔ گذشتہ سال جب اسی مقام سے ہم گذرے تھے۔ تو حضرت خلیفۃ المسیح نے اپنے خدام کو لیکر جہری قرأت سے دو رکعت نماز پڑھ کر دعائیں کی تھیں۔ اس یاد نے رُوح میں جوش اور قلب میں رقّت پیدا کر دی اور میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور سب سے اول یہ دعا کی۔ کہ

اے میرے محسن مولیٰ میری ان عاجزانہ دعاؤں کو ان دعاؤں میں شریک کرلے
جو میرے آقا نے اسی مقام پر گذشتہ جولائی میں کی تھیں

اس کے بعد میری دعا کی ترتیب سلسلہ عالیہ احمدیہ کی ترقی و اقبال حضرت اولوالعزم

کی صحت اور اس کے اولوالعزمانہ ارادوں کی تکمیل۔ اور اس میں ہم کو اخلاص و وفا کی توفیق دے
حضرت ام المومنین کی صحت اور درازی عمر کی دعا۔ بعض خاص احباب کے لیے عقدہ کشائی
کی گذارش۔ بالآخر اپنے رازوں کو پیش کیا میں جب اس دعا میں محو تھا۔ تو یکایک میری دعا
حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس شعر میں بدل گئی۔

اے خالق ارض و سما۔ بر من درِ رحمت کشا
دانی تو آں دردِ مرا۔ کز دیگراں پنہاں کنم

اس شعر نے زبان پر خود بخود آکر قلب و چشم کو پانی کی طرح کر دیا۔ اور میں اس وقت
سنتا تھا کہ

فضا میں یہی آواز گونج رہی ہے

میں اپنے مولی المحسن پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ دعاء ضرور قبول ہو گئی ہے۔ وللہ الحمد
اس وقت درود شریف پڑھنے کا بھی لذیذ موقعہ ملا۔ ثم الحمد للہ علےٰ ذالک۔
دعا کے بعد درود شریف پڑھتے ہوئے ہی میں سو گیا۔

میرا خواب آج رات میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ مجھ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام
وفات کی خبر ملی ہے۔ اور میں قادیان کے قریب کہیں باہر ہوں مجھے اس خبر
کے سننے سے سخت صدمہ ہوا۔ اور میں ڈرتا ہوا وہاں پہنچنا چاہتا ہوں فخر الدین بھی میرے
ساتھ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت صاحب کو بڑی خوشی تھی کہ میں بارہویں پارہ کے نوٹ شائع
کر دوں۔ اتنے میں کوئی شخص آیا اور نظارہ بدل گیا۔ اس نے کہا رات لاہور اور شملہ خواجہ
صاحب نے تار دئے ہیں۔ اور یہ سمجھا گیا ہے کہ ہمارے خلاف ہیں۔ میں نے کہا کہ لاہور اور شملہ
تار ضرور دیا ہے۔ مگر ہمارے متعلق قطعاً نہیں۔ اس کے بعد نظارہ بدل گیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ
حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے گھر کوئی لڑکا پیدا ہوا ہے۔ حضرت صاحب کہیں باہر سے آئے
ہیں۔ اور لوگ مبارکباد دے رہے ہیں میں نے بھی مبارکباد دی ہے۔ حضرت اقدس گھر کو جا رہے
ہیں۔ ابھی پہنچے نہیں کہ عبد الرحمن بوٹ والا ملا۔ اور اس نے ایک روپیہ نذر کے طور پر پیش کیا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صاحب نے اُسے کچھ دینے کا ارادہ فرمایا ہوا تھا۔ یا کہہ دیا ہوا

وہ بیان کرتا ہے کہ مجھے میرزا سُلطان احمد صاحب کی تائی نے تین روپیہ دیدئیے ہیں اور یہ اس نے فارسی زبان میں کہا ہے۔

حضرت نے فرمایا۔ **اگر ضرورت باشد ایں ہم بگیرید** ۔اس نے جواب دیا۔ کہ نہیں مگر اس نہیں میں خواہش کا احساس تھا۔ اس لئے حضرت صاحب نے وہ روپیہ بھی دیدیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۷- جون ۱۹۲۵ء یوم ہفتہ بحیرہ احمرا

ہُوز ہُو اور خواجہ صاحب

صبح کو میں جب تلاوت وغیرہ سے فارغ ہوچکا اور جہاز کے عرشہ پر پہنچا۔ تو خواجہ صاحب تشریف لائے۔ اور کہا کہ میں نے جہاز کی لائبریری میں ہوز ہو دیکھا ہے۔

(ہوز ہو ایک کتاب انگریزی ڈکشنری کے طور پر ہوتی ہے جس میں مشہور و معروف اشخاص کے نام ہوتے ہیں۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ کہ اس میں کوئی شخص اپنا نام درج کرا سکے عرفانی)

میرے ساتھ آئیے میں آپکو دکھاؤں۔ مجھے کوئی خاص دلچسپی اس کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن میں نے ناپسند کیا۔ کہ خواجہ صاحب کی آفر کو رد کردوں میں انکے ساتھ درجہ اوّل کے سیلون میں گیا اور وہ کتاب خواجہ صاحب نے لاکر اپنے متعلق نوٹ اس میں دکھایا۔ خواجہ صاحب نے خود ہی اسکو پڑھا۔ اور تفاخرا پڑھا۔ میں سے سنتا رہا۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ خواجہ صاحب نے کیوں مجھ کو سنایا تو وہ مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے تھے۔ کہ میں بچوں کے اس کھلونے پر تعجب کروں گا۔ اور یا وہ اس کو خفیف الحرکت نہیں سمجھتے تھے۔ میں ان سے اجازت لیکر چلا آیا۔ اور جہازی کھیلوں کا ٹورنمنٹ ہوتا تھا۔ اس کے دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔

جہاز کی رفتار سمندر کے سکون کے ساتھ تیز ہوگئی ہے۔ چنانچہ آج ۳۱۵ میل چلا ہے۔ ہر روز جہاز کی رفتار بقایا سفر کا ایک نقشہ جہاز کے تختۂ اعلانات پر چسپاں کردیا جاتا ہے۔ بقایا سفر صرف دوسرے بندرگاہ تک ہوتا ہے۔ مثلاً بمبئی سے چلے تھے۔ تو صرف عدن تک کا فاصلہ دکھایا جاتا تھا۔ اور اب عدن سے روانہ ہوئے ہیں۔ تو سویز تک کا کل امید کیجاتی ہے۔ انشاء اللہ جہاز سویز پہنچ جائیگا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ جہاز پر مختلف قسم کا جوا ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاز کی رفتار

پر بھی ہوتا ہے۔ ۱۲ بجے کے وقت عجیب نظارہ ہوتا ہے جب کہ رفتار کا نقشہ آویزاں کرنے کا وقت آتا ہے۔ عورتیں اور مرد بھاگے آتے ہیں۔ جیتنے والوں کی خوشی اور ہارنے والوں کی حسرت قابل دید ہوتی ہے۔

لائف بیلٹ اور خطرہ کا الارم

جہازوں پر بعض اوقات مختلف قسم کے حوادث ہو جاتے ہیں جن سے مسافروں کی جان خطرہ میں ہوتی ہے حفظ ماتقدم کے طور پر اس قسم کے خطرات سے بچاؤ کا انتظام قبل از وقت موجود رہتا ہے۔ آگ بجھانے کا سامان اور اگر جہاز کے غرق ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ تو مسافروں کو بچانے کا انتظام۔ اس موقعہ کے لئے کچھ تو کشتیاں ہوتی ہیں۔ جنکو لائف بوٹ کہتے ہیں۔ سب سے پہلے عورتوں اور بچوں کو ان میں جگہ دی جاتی ہے۔ اور جہاز کے عملہ کے لئے سب سے آخر جگہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک مسافر کے لئے ایک ایک لائف بیلٹ یا لائف جیکٹ مہیا کی جاتی ہے۔ اور وہ ہر کرہ میں رکھی رہتی ہیں۔ ہر کرہ میں انکے استعمال اور پہننے کا طریق ایک تختہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ پرچہ ہدایات بالتصویر ہوتا ہے۔ تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ مسافروں کو پہلے سے ہدایت ہوتی ہے کہ جب خطرہ کا گھنٹہ بجے تو وہ فوراً اسے پہن لیں۔ اور انکو تشویش سے بچانے کے لئے یہ انتظام ہوتا ہے۔ کہ جس روز امتحان مقصود ہو۔ کھانے کے مینو پر یا اعلان کے ذریعہ بتا دیا جاتا ہے۔ کہ فلاں وقت ایسا امتحان ہوگا۔ اس وقت فوراً ہر مسافر کو اپنی جیکٹ پہن کر تختہ جہاز پر چلے جانا چاہئے۔

یوم الامتحان

چنانچہ آج یوم الامتحان تھا۔ سہ پہر کو گھنٹہ بجا۔ اور ہم سب اپنی اپنی جیکٹ پہن کر گویا ایک آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو کر تختہ جہاز پر پہونچ گئے۔ یہ بہت ہی قابل دید نظارہ تھا۔ جہاز کے ملاحوں اور ملازموں نے اپنے منصبی فرائض کی جو ایسے وقت ہوتے ہیں۔ پوری تعمیل کی۔ تمام کشتیوں کو سمندر میں اتار دیا گیا اور تمام مسافر پریڈ میں کھڑے ہو گئے۔ کپتان جہاز نے ہدایات دیں۔ کہ خطرہ کے وقت پہلا کام یہ ہے کہ انسان گھبرا نہ جائے۔ گھبراہٹ سے عمل کی قوت بیکار ہو جاتی ہے۔ اور انسان مبتلائے مصیبت ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا کہ ایکدم کشتی پر ہجوم نہیں کرنا چاہئے۔ اور جہاز میں سب کی

پہلے عورتوں اور بچّوں کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہیئے۔

مسافروں کو یہ ہدایات دیکر انکو منتشر کر دیا گیا لیکن ابھی اس کے اپنے عملہ انتظام کا امتحان باقی تھا۔ اس میں دکھایا گیا کہ کس طرح جہاز کے ایک حصّہ میں پانی گھس آوے تو دوسرے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اور ایسے خطرے کے اوقات میں کسطرح پر ناگہانی آفات سے بچنے کے دروازوں سے انسان نکل سکتا ہے۔ یہ بہت ہی قابل دید نظارہ تھا۔ انسانی جان کے بچانے کے لئے کوئی تدبیر اور حیلہ جو انسانی عقل تجویز کر سکتی ہے۔ باقی نہیں رکھا گیا تھا۔ بڑے بڑے آہنی دروازے ملنٹوں میں بند ہوتے اور کھلتے تھے۔ اور جہازی ملازم ایسے عادی اور خوگر تھے۔ کہ انہیں ذرا بھی گھبراہٹ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ باوجودیکہ کوئی واقعی خطرہ نہ تھا۔ لیکن وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں اسی طرح معروف تھے گویا وہ ایک جان ستان خطرہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ آخر یہ مفید اور دلچسپ شغلہ ختم ہوگیا۔ اور عمّلا اعلان ہوگیا کہ

جہاز بالکل محفوظ اور مصئون ہے

ایک ناگوار واقعہ کا خوشگوار نتیجہ

کل شام کو کھانا کھانے کی میز پر ایک ناگوار واقعہ پیش آگیا۔ جو گو اتنا اہم نہ ہو۔ مگر اپنے نتیجہ کے لحاظ سے ایک قیمتی سبق اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لئے میں اسے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہم کھانا کھا چکے تھے۔ اور میوہ جات آخر میں پیش ہو رہے تھے۔ ہندوستانی مسافروں کی میز پر جو پھل آئے وہ نسبتًا ناقص اور خراب تھے۔ مجھے تو انکی چنداں پرواہ نہ تھی۔ مگر میرے رفقاء سفر خصوصًا گجراتی ہندوؤں نے مجھے توجہ دلائی۔ اور شکایت کی کہ آپ اسکا انتظام کرادیں۔ میں نے پھر بھی اسے معمولی بات کہا۔ اور چاہا کہ نظر انداز کردوں۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اصلاح ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے افسر متعینہ جو اس وقت موجود تھا۔ اس کی طرف توجہ دلائی۔ مگر اس نے کچھ پرواہ نہ کی تب میں نے اسکو کہا کہ میں اپنے رفقاء سمیت اس کے خلاف پروٹسٹ کرتا ہوں۔ اور جب تک تم اپنی غلطی کا اعتراف نہ کروگے۔ اور آیندہ اس قسم کی ہتک آمیز غلطی نہ کرنے کا اقرار۔ میں میز پر نہ آؤں گا۔ اور یہ کہکر میں میز سے اٹھا۔ اور اپنے حجرہ کو چلا آیا میں نے دیکھا کہ انگریز مسافروں پر اس کا کچھ اثر تھا۔ یہ کہنا

میرے وہ ساتھی جو اس کے محرک تھے نہ اُٹھے۔ اور وہی پھل کھاتے رہے۔ ہندوستانیوں کی حالت اور اپنی جلد بازی پر تاسف ہوا۔ شام کو میرے پاس ڈائننگ روم کے دوسرے ملازم یکے بعد دیگرے معذرت کے لئے آتے رہے۔ اور نہایت عمدہ پھل کافی مقدار میں لیکر آئے۔ اور معافی چاہی۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہونے کا اعتراف کیا۔ مگر میں نے ان سے ہر ایک کو یہی کہا کہ آپ کا قصور نہیں۔ جب تک وہ افسر اپنے قصور کا اعتراف نہ کرے گا میں باز نہ جاؤں گا

دراصل اس انگریز افسر نے یہ سمجھا تھا۔ کہ شاید اس طرح پر بات ختم ہو جاویگی۔ لیکن جب اس نے مجھے اپنے عزم میں مصمم پایا۔ تو وہ آج صبح حاضری سے پہلے میرے کمرہ میں آیا۔ اور اس نے نہایت منت سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی چاہی۔ اور عذر کیا کہ۔

میں دراصل سمجھا نہیں تھا

آئندہ اس قسم کی اور کسی قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ مجھے بھی کوئی ضد تو تھی نہیں۔ میں تو۔

ما اُرید الا الاصلاح

پر عمل کر رہا تھا میں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کر دیا۔ اور انکی درخواست پر ناشتہ کیلئے گیا۔ مجھے اس معذرت پر کوئی فخر نہ تھا۔ اور نہ ہے۔ اور نہ اس غرض سے میں نے اس واقعہ کو لکھا ہے بلکہ مجھے اس نے ایک سبق دیا کہ فاتح قوم کے اندر کس قسم کی خوبیاں ہوتی ہیں۔

انتظام کو قائم رکھنے کیلئے یہ لوگ فرض شناسی کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اور ادائے فرض کیلئے کسی قسم کی ذلت نہیں سمجھتے۔ اور اپنی غلطی کے معلوم ہونے پر اعتراف میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے۔

دوسری طرف ہماری یہ حالت ہے کہ ایک معمولی سے امر پر بھی ہم متفق نہیں ہو سکتے۔ مجھے ان ہندو گجراتی رفقا پر افسوس ہوا۔ کہ انہوں نے خود تحریک کی۔ اور جب میں نے پروٹسٹ کیا۔ تو وہ الگ ہو گئے میں انکو بدعہد یا غدار نہیں کہتا۔ مگر انکی خطرناک کمزوری سمجھتا ہوں کہ وہ نوجوان جن پر آئندہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا انحصار ہے۔ وہ اس قسم کی کمزوریوں کا شکار ہوں۔

بہرحال اس واقعہ نے جو ہر چند ناگوار تھا۔ خوشگوار نتائج پیدا کر دئے۔ اور اب ہم بافراط نہایت عمدہ

اور اعلیٰ درجہ کے پھل کھا رہے ہیں۔ اور وہی افسر ہر روز خود آکر پوچھتا ہے اور میں No Thank you کہکر خوشی اور شکریہ کا اظہار کر دیتا ہوں۔

۲۸؍ جون سنہ ۱۹۲۵ء یوم یکشنبہ

جہاز پر گرجا

آج اتوار کا دن ہے۔ اس لئے جہاز پر باقاعدہ گرجا ہوا۔ اور ۱۱ بجے انگریز مسافر نماز کیلئے جمع ہو گئے۔ قطع نظر اس امر کے کہ یہ لوگ دل سے عیسائی ہیں یا نہیں۔ اتنی بات بطور خصوصیت قومی ان میں داخل ہو گئی ہے کہ وہ اپنی مذہبی رسوم کی تکریم کریں۔ چونکہ اتوار انکے ہاں یوم السبت ہے۔ اس لئے اس یوم کی **تقدیس** اور تبریک کا وہ عملاً اظہار کرتے ہیں۔ آج جہاز پر کسی قسم کی کھیل کود کا شغلہ نہیں ہے۔ اور سب کے سب انگریز مرد اور عورتیں وقت مقررہ پر نماز کے لئے جمع ہو گئے۔ اور ایک گھنٹہ تک طریق مقررہ پر نماز و عبادت ہوتی رہی۔ جہاز پر مذہبی گیتوں اور دعاؤں کی کتابیں اور بائیبل وغیرہ موجود رہتی ہیں۔ اگر مسافروں میں کوئی پادری نہ ہو۔ تو پھر کوئی شخص مسافروں میں سے منتخب ہو جاتا ہے۔ جو پادری کے فرائض ادا کرنے کی پوری قابلیت رکھتا ہو۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو۔ تو کپتان ہی ان فرائض کو ادا کر دیتا ہے۔

آج کے گرجا کیلئے جہاز کے نوٹس بورڈ پر اعلان لگا دیا گیا تھا مسافروں میں ایک پادری صاحب بھی تھے۔ اور انہوں نے ہی آجکی امامت کرائی میں اس نظارہ کو دیکھنے کیلئے گیا۔ اور ایک افسوس کے ساتھ واپس آگیا۔

یوم السبت کی حرمت

میرا افسوس اسلئے تھا کہ ہم مسلمان اپنے فرائض منصبی اور مذہبی سے کس قدر غافل ہیں۔ معمولی عذروں پر ہم نماز کو قضا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اور ہماری حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہے۔

لا تقربوا الصلوٰۃ زہیم بخاطر است
وز امر یاد ماند کلوا واشربوا مرا

سبت کی حرمت و تقدیس کیلئے قرآن مجید میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ اور یوم السبت کی حرمت کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث یہودیوں پر جو عذاب آیا۔ اور انکی قومی تعمیر کو جو صدمہ اور نقصان پہنچا اس کی

حقیقت بھی قرآن مجید نے کھول کر بیان کی ہے۔ مگر ہم ان باتوں کو پڑھتے ہوئے بھی عمل کے میدان میں بھول جاتے ہیں۔ میں مسلمانوں کے ادبار اور زوال کے اسباب میں جمعہ کی تقدیس کو نگاہ نہ رکھنا بھی ایک باعث یقین کرتا ہوں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جمعہ کے احترام کو مسلمانوں نے مذہبی طور پر بھی صدمہ پہنچایا ہے۔ ناعاقبت اندیش علما نے جمعہ کی فرضیت کے اسباب اور شرائط پر بحثیں کر کے اکثر مسلمانوں کو ترک جمعہ پر مجبور کر دیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید نے کسی قسم کے شرائط عاید نہیں کئے تھے۔ غرض میں نے ان عیسائی مسافران کو اپنے یوم السبت کی تقدیس کرتے دیکھا۔ اور اپنی حالت پر افسوس کے جذبات میں بہ گیا۔

اگرچہ سب کے سب انگریز شامل نہیں ہوئے۔ مگر شامل نہ ہونے والوں کی تعداد چند نفر سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ بھی جبتک گرجا ختم نہیں ہو گیا۔ اپنے حجروں سے باہر نہیں نکلے۔ اور ایک متنفس بھی کسی قسم کی کھیل کود میں آج شریک نہیں ہوا۔

افریقی اور حجازی ساحل

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں بحیرہ قلزم کے دونوں طرف افریقی اور حجازی ساحل ایک مسلمان کے قلب و دماغ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اور مسلمانوں کے گذشتہ کارناموں کی تصویریں یکے بعد دیگرے فکر میں آتی ہیں میں ان ہر دو ساحل کو دیکھتا گیا۔ اور دل حسرت منزل میں خیالات کی مختلف لہروں میں غوطے کھاتا رہا۔ حجاز کے دیکھنے کا شوق غالب تھا۔ اور افریقہ میں **اسلامی عظمت** کے قائم کرنے یا کم از کم قائم ہو جانے کی تمنا کبھی کبھی خیالی بلند پروازیوں کیطرف لیجاتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روح کے مطالبہ کو دل کے کانوں سے سنتا اور اپنی بے بسی کا قطرات اشک سے جواب دیکر بہجاتا مجھے اسلام کے مستقبل کے متعلق حجاز اور افریقہ کے ریگ زاروں اور صحراؤں میں بہت کچھ نظر آیا۔ اور اب بھی آتا ہے۔ مگر کس طرح یہ منادی کروں اور دلوں کو اس حقیقت سے آشنا کروں۔

الغرض بحیرہ قلزم میں سے گذرنے والے مسلمان مسافروں کیلئے یہ ہر دو ساحل دائیں بائیں سے بیدار کرنے والے مجسّے ہیں۔

جس کے سننے کے کان ہوں وہ سنے

بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے نظروں سے گذرتے ہے۔ بحیرۂ عرب میں بہت سی ایسی مچھلیاں دیکھی گئیں۔ جو سمندر میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی دور تک جہاز کے ساتھ دوڑتی تھیں بحیرہ قلزم

میں وہ نظر نہیں آئیں۔ البتہ بعض جگہ مختلف قسم کی رنگدار مچھلیاں نظر آئیں۔ جو سمندر میں ایک خوبصورت پھول کی شکل پر نظر آتی تھیں۔ ایک قسم کی مرغابی بھی دیکھی جاتی تھی بحیرۂ قلزم کے متعلق یہ بات عام ہے کہ یہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ اس مرتبہ بحیرۂ قلزم کا سفر گرم نہ تھا۔ بلکہ نہایت خنک اور خوشگوار ہوا چلتی رہی۔ البکرو زکسی قدر ترشح بھی ہوا۔

چونکہ سمندر یہاں چھوٹا ہے۔ اس لئے متعدد جہاز ادہر سے اُدہر جاتے نظر آتے رہتے تھے۔ جب میں بچوں میں پڑھتا تھا۔ تو بحیرۂ قلزم (ریڈسی) کے متعلق پڑہا تھا۔ کہ اس کا پانی سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ لیکن جب آکر دیکھا تو سمندر کے پانی میں سرخی کا کوئی نشان نہ پایا۔ جو بحیرۂ احمر کی وجہ تسمیہ بتایا جاتا تھا بحیرۂ قلزم کے تمام سفر میں رات دن جہازوں کے گذرنے کا نظارہ بہت ہی خوش کن رہا۔

جہاز کے چونکہ آج سویز پہنچ جانے کی اُمید تھی۔ اس لئے مسافر بہت خوش تھے۔ ہر سانس ہمکو بندر سویز کے قریب کر رہا تھا۔ میری خوشی اُمید اور امنگ کے جذبات سے معمور تھی۔ عزیز مکرم محمود احمد صاحب کے دیکھنے کی خوشی ہر آن بڑھتی جاتی تھی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ گویا میرا پہلا منزل مقصود آگیا۔

بحیرۂ قلزم کے سفر کا ذکر ختم کرنے سے پہلے چند اور باتوں کا ذکر ناظرین کی وسعت معلومات کے لئے کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

بحیرۂ قلزم کی تاریخی اہمیت

بحیرۂ قلزم میں قدیم تاریخ کے اوراق مدفون ہیں۔ اور اس سمندر کی لہروں نے زمانہ کے بہت سے انقلابات کو دیکھا ہے۔ رومیوں۔ اسیرین سیرین۔ ترک وغیرہ قوموں کا یہ جولانگاہ رہ چکا ہے۔ مذہبی نقطہ خیال سے بحیرۂ قلزم کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لیکر اسی سمندر کے پانیوں سے گذرے تھے۔ اور انہوں نے خدا تعالیٰ کی تائید سے اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ اور فرعون اُس کے ساتھی غرق ہوئے۔ بحیرۂ قلزم کی سیاسی اہمیت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر **مشاہداتِ عرفانی** کے دائرہ عمل سے شاید یہ بات بعید ہو لیکن میں اس قدر کہنے سے ہنیں رک سکتا کہ بحیرۂ احمر کے پانیوں ہی میں سے ۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو انگریزی جنگی جہاز منروا نے عقبہ پر جو عرب کا ایک بندرگاہ ہے۔ گولہ باری ہوئی۔ اور اس گولہ باری سے ٹرکی کے ساتھ آغاز جنگ ہوا میں اس واقعہ کو نہ لکھتا۔ لیکن چونکہ ۱۹۱۴ء کی حرب عظیم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا ایک زبردست نشان

ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا۔ کہ اس کے مناسب تذکرہ کے بغیر گذر جاؤں۔ جو بحیرۂ قلزم سے تعلق رکھتا ہے ان پانیوں سے ایام حرب میں سینکڑوں جنگی جہاز ادہر سے اُدہر گذرے جنگی توپیں اور سامان حرب ملک الموت کے آلات تھے۔ اور اس حرب عظیم کی یادگار چھوڑنے کے لئے کام کر رہے تھے۔ یوناً فیوناً بحیرۂ قلزم کی سیاسی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ اور ایک مسلمان کی نظر میں اسکی اہمیت بہت بڑی ہے۔ اسلئے کہ

اس کے دونوں کناروں میں ماضی کی یاد اور مستقبل کی امید ہے

جزیرہ خواہر و برادر اور روشنی کا منار

بحیرۂ قلزم میں سویز سے ایکدن رات کے فاصلے پر دو چھوٹے چھوٹے جزیرے بلادر و خواہر یا ہردو برادر کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ غیر آباد بے برگ وگیاہ چٹانیں ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک بہن اور بھائی کے مدفن ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں دونوں بھائی تھے۔ ہیں ہاں نہ جا سکتا تھا۔ اور نہ اس کے تحقیق کا کوئی موقعہ تھا۔

جہاز رانوں کے آرام اور سہولت کیخاطر ان میں ایک بہت بڑا لائٹ ہوس (روشنی کا منار) بنا دیا گیا ہے جو رات کیوقت جہازوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ چونکہ کنارہ کے قریب چٹانیں ہیں۔ اسلئے انکے تصادم سے جہازوں کو محفوظ کرنے کے لئے لایٹ ہوس کا ہونا ضروری ہے۔ اور بعض ایسے مقامات سمندر میں ہوتے ہیں۔ جہاں اسقدر پانی گہرا نہیں ہوتا۔ کہ جہاز بآسانی چل سکے۔ اور ریت کے تودے قریب ہوتے ہیں۔ ان روشنی کے مناروں سے ایسی جگہ بھی آرام ملتا ہے۔ اس حصّہ میں کثرت سے لائٹ ہوس ہیں۔ اور رات کو یہ منظر بہت ہی دلفریب ہوتا ہے۔ انہیں سے بعض میں یورپین ملازم رہتے ہیں۔ جنکو ہفتہ میں ایکبار کھانا اور پانی پہنچایا جاتا ہے۔ اور اب بعض آٹو میٹک سسٹم میں تبدیل کئے جا چکے ہیں جس کے سبب سے کسی آدمی کے وہاں رہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ دُنیا کے سمندروں میں بعض ایسے لائٹ ہوس بھی کہے جاتے ہیں جہاں سال میں صرف ایکمرتبہ ذخیرہ اشیاء خوردنی مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ نو ماہ کام کرتے ہیں۔ اور تین ماہ کی رخصت انہیں ملتی ہے۔

ان خلوت نشینوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ انسانی زندگی کی جدو جہد کی یہ مثال بہت ہی سبق آموز ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ جو دنیا سے عملاً منقطع ہو کر ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا وہ لطف زندگی

ادھام معنوں میں، اُٹھ سکتے ہیں؟ کچھ شک نہیں وہ دنیا اور اُنکی دلفریبیوں سے بہت دور ہیں۔ مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ انکی زندگی کا مشن اور اسکے کام کا دائرہ ایسا عجیب و غریب ہی کہ

میں خواہش کرنے لگا کہ کاش میں روشنی کا منارہ ہوتا

میں نے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر غور کیا۔ کہ کسی طرح وہ اپنے ایام قبل بعثت کو خلوت میں گذارتے ہیں۔ اور دنیا میں رہ کر بھی اس سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ یہ تخلیہ اور تنہائی دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے جدائی اور علیحدگی انہیں اوپر کی طرف لیجاتی ہے۔ اور ان کا صعود خدا کی طرف ہونے لگتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ کا نور ان پر نازل ہوتا ہے۔ اور پھر

وہ بھولے بھٹکوں کو اپنی شمع ہدایت سے راستہ دکھاتے ہیں

وہ اس دنیا کے سمندر میں لائٹ ہوس ہوتے ہیں۔ اور حقیقی رہنما کہلاتے ہیں۔ میں اس لائٹ ہوس کو دیکھتا تھا اور قرآن مجید میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سراج منیر پڑھتے ہوئے ذوق اور حلاوت سے بھر جاتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ

حقیقی نُور یہ ہے

یہ سچی بات ہی کہ جس جس قدر انسان دنیا کے علائق اور اسکی دلفریبیوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی قدر وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کی روشنی پاتا ہے۔ ان لائٹ ہوسوں میں رہنے والوں کے حالات سے میں بیخبر ہوں میں نہیں جانتا وہ اپنی زندگی کن شغل میں گذارتے ہیں۔

تمام دنیا میں جہازرانی کی سہولت کے لئے ایک انٹرنیشنل لائٹ ہوس ایسوسی ایشن بنی ہوئی ہے۔ اور وہ تمام دنیا کے لائٹ ہوسوں پر حکومت کرتی ہے۔

جزیرہ پیرم اور انگریزی فرزانگی

بحیرہ قلزم کا فسانہ سویز کے پہنچنے تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور میں اسے جزیرہ پیرم کے ذکر کے بغیر ختم کرنا نہیں چاہتا۔ جو انگریزی فرزانگی اور مستعدی کی ایک زندہ مثال ہے۔ یہ جزیرہ باب المندب کے پاس واقع ہے۔ اور عدن

سے مغرب کی طرف ، ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ **باب المندب** عربوں کی جہاز رانی کے عہد عروج میں بہت نازک مقام سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی لئے اسکو باب المندب کہتے تھے۔ اس جزیرہ پر انگریزی قبضہ کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ اس جزیرہ پر عرب و یمن کی حکومتیں رہی ہیں۔ مگر اسے کسی مصرف کا نہ پاکر بانہ بنا کر یہ خالی ہوگیا۔ فرانسیسیوں نے چاہا کہ اس پر قبضہ کریں۔ اور اس مقصد کے لیے ۱۸۵۷ء میں جبکہ ہندوستان میں غدر ہو رہا تھا۔ فرانسیسی امیر البحر نے اپنے ایک آفیسر کو حکم دیا۔ کہ اس جزیرہ پر فرانسیسی جھنڈا گاڑ دے۔ اور اس غرض کیلئے بالکل مخفی ہدایات دی گئی تھیں۔ یہ افسر اپنی مہم لیکر پرم کو جا رہا تھا۔ اور عدن اس نے قیام کیا۔ انگریزی ایجنٹ کے ساتھ کھانے کی میز پر بہت شراب پی گیا اور اس بیخودی کے عالم میں اپنی مہم کے مقصد کا اظہار خوشی میں کر دیا۔ انگریزی ایجنٹ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اس نے وہاں ہی میز پر بیٹھے بیٹھے پنسل سے میز کے نیچے ہاتھ لیجا کر اپنے ایک آفیسر کو حکم دیا۔ کہ وہ فوراً وہاں جاکر انگریزی جھنڈا بلند کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت رات کی تاریکی میں انگریزی مہم نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ اور فرانسیسی آفیسر اپنی عیش میں مصروف رہا۔ اور جب وہ اپنے سفر پر روانہ ہوکر وہاں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ

انگریزی جھنڈا ہوا میں اڑ رہا تھا

اور اس وقت سے آجتک انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ اور **ملحقات عدن** میں شامل ہے ...... اور صرف پانچ میل لمبا ہے۔ کہنے کو یہ معمولی واقعہ ہے۔ مگر انگریزی قوم کے تدبر۔ ہوشیاری۔ اور مستعدی کی ایک شان اس میں نمایاں ہے۔ جس قوم کے آفیسر اپنی لہو و لعب کی گھڑیوں میں **قومی مفاد** اور تعمیر ملک کے خیال کو فراموش نہ کریں۔ وہ قوم اگر دنیا پر حکومت نہ کرے تو اور کس قوم کا حق ہے۔

مسلمانوں نے اسے کسی مصرف کا نہ پاکر خالی کر دیا۔ مگر انگریزی قوم نے اسی افتادہ اور غیر مصرف چیز کو اب کارآمد بنا لیا۔ اور ایسا کارآمد کہ بحیرہ قلزم کا یہ قیمتی اور محفوظ دروازہ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس چھوٹے سے دروازہ پر قبضہ کرکے اب تمام بحیرہ قلزم پر انگریزی حکومت کی قوت مضبوط ہو چکی ہے اگرچہ افریقی ساحل پر اٹلی کے مقبوضات وغیرہ بھی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس تمام سمندر پر اثر غالب برٹش حکومت کا ہے۔

نہر سویز

نہر سویز دنیا میں اپنی سیاسی اور تجارتی حیثیت کے لحاظ سے ایک مہتم بالشان چیز ہے۔ اسکی تاریخ دلچسپ اور بہت پرانی ہے۔ جہاں تک صحیح تاریخ ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ نہر سویز کا خیال **عمرو ابن العاص** فاتح مصر کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اور فاتحان عرب نے اسے کھدوایا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ رحمن میں ان ہر دو سمندروں یعنی بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کے ملائے جانے کی پیشگوئی موجود ہے اور اسکی حقانیت اور صداقت کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے وحی پاکر یہ خبر دی اور آپ کے وصال کے قریباً بارہ سو برس بعد اس پیشگوئی کے پورا ہونے کے سامان شروع ہوئے۔ موجودہ نہر سویز کے متعلق علماء یورپ تو کہتے ہیں۔ کہ نپولین کے حملہ مصر ۱۷۹۸ء سے اسکا خیال پیدا ہوا۔ مگر صحیح یہی ہے۔ کہ اسکی بنیاد مسلمانوں نے رکھی تھی۔ اور سب سے پہلی منظوری تعمیر نہر کے لئے ۳۰ نومبر ۱۸۵۴ء کو سعید پاشا گورنر مصر نے ایک فرانسیسی انجنیر فرڈی نینڈ ڈی لیس کردی۔ اور اجرائے نہر سے ۹۹ سال کا پٹہ دیا گیا تھا اس تعمیر کے لئے ایک کمپنی قائم ہوئی جسکا سرمایہ ۸۰ لاکھ پونڈ قرار پایا۔ جو ۲۰ پونڈ کے چار لاکھ حصوں پر مشتمل تھا۔ مگر ان حصص کی فروخت خاطر خواہ نہ ہوئی۔ خصوصاً انگلستان نے تو توجہ نہ کی۔ اس لئے کہ سیاسی اور ٹیکنیکل وجوہات سے اسکی مخالفت کی جارہی تھی۔ مگر تجویز کو ناکام ہونے سے سعید پاشا کی اولوالعزمی اور فیاضی نے بچا لیا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۹ء کو کام شروع ہوا۔ باوجود ہر قسم کی مشکلات کے سعید پاشا کی وفات تک (۱۸۶۳ء) کام زور شور سے جاری رہا۔ سعید پاشا کے جانشین اسماعیل پاشا اور کمپنی کے درمیان بعض جھگڑے قائم ہوگئے۔ اور آخر جولائی ۱۸۶۴ء میں مصری حکومت اور حکومت فرانس کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا نومبر ۱۸۶۹ء میں اس نہر کے افتتاح کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس تقریب پر شہنشاہ بیگم فرانس اور شہنشاہ آسٹریا موجود تھے۔ کہتے ہیں کمپنی کے ۱۷ ملین پونڈ اس نہر سویز پر خرچ آئے۔ اور افتتاح کے بعد پہلا ہی سال ناتسلی بخش ثابت ہوا۔ اور ۵ لاکھ پونڈ کا نیا قرضہ لیا گیا۔ اور جہازوں پر محصول بڑھا دیا گیا۔ ان تمام مشکلات پر قابو پانے کے لئے ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اب انگریزوں کو بھی اس نہر کی اہمیت معلوم ہوئی۔ اور انہوں نے حصص خریدنے کا عزم کرلیا۔ اسمٰعیل پاشا نے ۴ لاکھ پونڈ کے اپنے حصص برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ دئے۔ اور ۱۸۷۶ء میں ۳ انگریز ڈائرکٹر بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شامل ہوگئے۔

۱۸۸۷ء میں نہر کو دوہرا بنانے کی تجویز ہوئی۔ مگر وہ گر گئی۔ اور اسکی بجائے اسکو چوڑا اور گہرا ہونے کی تجویز قرار پائی۔ جو مزید ۸۰ لاکھ پونڈ کے قرضہ کی محرک ہوئی۔ یہ نہر پورٹ سعید سے پورٹ توفیق تک ۸۷ میل لمبی ہے

جس میں سے ۱۲ میل کی دو جھیلیں بھی ہیں جنکی گہرائی ۴۰ فیٹ اور چوڑائی قریباً ۲۰۰ فیٹ ہے۔ جہازوں کو علے العموم اس نہر سے گذرنے میں پندرہ گھنٹے لگتے ہیں۔ بڑے سے بڑے جہاز اس میں سے گذر سکتے ہیں۔ گو وہ جہاز جو بحیرہ اطلانٹک میں چلتے ہیں۔ ابھی تک اس میں نہیں چل سکتے۔ چونکہ یہ تمام حصہ بے آب تھا اس لیے میٹھے پانی کی ایک نہر قاہرہ کے قریب سے نکال کر اسماعیلیہ تک لائی گئی ہے۔ اور گذشتہ جنگ عظیم میں اس نہر کی اہمیت خصوصیت سے ثابت ہوئی ہے۔ گو اس سے پہلے جنگ چین اور امریکہ اور ہسپانیہ کی جنگ میں بھی اُس اوسپین کی فوجیں اسی نہر سے گذری تھی۔ اور جرمن اور فرانس کی فوجیں بھی عندالضرورت گذر چکی تھیں۔ اب اس نہر پر سب سے بڑا تصرف انگریزوں کا ہے۔ گذشتہ سال جب میں یہاں سے گذرا تھا۔ تو نہر کو عریض اور عمیق بنایا جا رہا تھا۔ اب یہ کام بہت حد تک ہو چکا ہے۔

اسقدر تاریخی اور ضروری حالات بیان کرنے کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ نہر سویز اپنے اندر انسانی دانش و تدبر اور علم و فرزانگی کا ایک بیش قیمت نمونہ اور سبق رکھتی ہے۔ اس مقام پر براعظم افریقہ اور ایشیا ملے ہوئے تھے۔ اور بحیرۂ روم اور بحیرہ احمر جدا جدا تھے۔ ولایت کے جہاز اس امید کیطرف سے بہت بڑا چکر لگا کر آیا کرتے تھے۔ مگر اس نہر نے منزل کو قریب اور مقصد کو نزدیک کر دیا۔

سویز اور سویز سے پورٹ سعید تک

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ جہاز ۵ بجے سویز پہنچ گیا تھا۔ ۸ بجے تک نہر سویز میں ٹھہرا رہا۔ اس جگہ اس نے میٹھے پانی کا کافی ذخیرہ لیا۔ تاجر اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر جہاز کے قریب آ گئے تھے۔ اور اس سمندری بازار کا کسی قدر ذکر میں نے کر دیا ہے۔ سویز ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو نہر سویز کے کھودے جانے کے بعد بہت بارونق ہو گیا ہے۔ میں چونکہ جہاز کو جاتے ہوئے چند منٹ یہاں قیام پذیر رہا ہوں۔ اس لئے شہر سویز کے متعلق اس حصہ سفرنامہ میں ذکر کروں گا۔ انشاءاللہ العزیز۔

اس عرصہ میں ڈاکٹری معائنہ اور مصر میں اترنے والے مسافران کے پاس پورٹ وغیرہ دیکھ لئے گئے تھے ۸ بجے جہاز روانہ ہو گیا۔ میرے اس سفر کی یہ آخری منزل تھی۔ کیونکہ مجھے پورٹ سعید عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کیلئے اترجانا تھا۔

سویز سے جب جہاز روانہ ہوتا ہے تو اس کے ہمراہ پائلٹ فرود ہوتا ہے۔ اور جو جہاز یہاں پہنچتا ہی قبل اس کے کہ وہ نہر میں داخل ہو وہ اپنے لئے پائلٹ فرو مانگ لیتا ہے۔ اور یہ ایک جھنڈے کے ذریعہ

ہوتا ہے۔ جو جہاز پر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ ہر جہاز پر دو تین جھنڈے آویزاں کرنے ہوتے ہیں۔ ایک جس سے معلوم ہو کہ جہاز کس حکومت کا ہے۔ دوم یہ کہ اس میں کسی قسم کی متعدی مرض نہیں۔ تیسرے پائلٹ کیلئے اور اگر میٹھا پانی لینا ہو تو اسکو بھی ایک جھنڈے ہی کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ میٹھے پانی کی ایک بہت بڑی کشتی یہاں آئی۔ اور برابر تین گھنٹہ تک قلی پمپوں کے ذریعہ جہاز پر پانی پہنچاتے رہے۔ جب میٹھے پانی کی کشتی لائی گئی تو مجھے عجیب لطف آ رہا تھا۔

کشتی درون دریا۔ دریا درون کشتی

کا منظر تھا۔ نہر سویز میں داخل ہو کر ہمارے تیز رفتار بحر پیما جہاز کی رفتار جو بعض اوقات ۱۷ میل فی گھنٹہ تھی ہو یا ۶ میل گھنٹہ پر آگئی۔ نہر میں جہاز تیزی سے نہیں چلائے جا سکتے۔ ورنہ کناروں کو پانی سے صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ اگر کوئی جہاز سامنے سے آتا ہوا ملے تو جانے والے جہاز کو ٹہیر کر اسے گذرنا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات اس پر دو دو گھنٹہ صرف ہو جاتے ہیں مگر مجھے ایسا موقعہ پیش نہ آیا۔ لیکن یہ لازمی امر ہے کہ ایک رات نہر میں ضرور آجاتی ہے۔ نہر کے کنارے پر جانے والا مسافر جہاز کے مسافروں سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اور آواز خوب سنائی دیتی ہے۔ ایک طرف کنارے پر جو فلسطین کا کنارہ ہے لق و دق میدان ہے۔ اور دوسری طرف آبادی ہے۔ جو نہر کے عملہ کے آدمیوں کیلئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر خوشنما بنگلوں کی صورت میں نظر آتی ہے

آدمی یہاں کے گرانڈیل جوان ہیں ۶ فیٹ سے کم نہیں ہوتے۔ عام طور پر لباس لمبے کرتوں کا ہوتا ہے۔ جو پاؤں تک ہوتے ہیں۔ اس پر ایک چھوٹا کوٹ یا صدری عام طور پر پہن لیتے ہیں۔ مگر عمائد اور علماء اس پر ایک جبہ رکھتے ہیں۔ ان امور کے متعلق میں تمام مصر میں انشاء اللہ بیان کروں گا۔

الغرض جہاز روانہ ہو گیا۔ اور رات بھر نہر میں چلتا رہا۔ میں اپنے حجرہ میں جا کر نمازیں پڑھ کر امید اور خوشی کے جذبات سے معمور دل لیکر سو گیا۔ اگرچہ نیند اچھی طرح نہ آئی۔ اور یہ کسی بیماری کیوجہ سے نہیں تھی بلکہ کل صبح منزل مقصود پر پہنچنے کی خوشی کا غلبہ دماغ پر تھا۔ اور اسی وجہ سے بہت کم نیند آئی اور صبح بھی بہت جلد بیدار ہو گیا۔

۲۹ جون ۱۹۲۵ء یوم دوشنبہ (رپورٹ سعید)

رات کو خوشی کی لہروں نے بار بار جگا دیا۔ اور رات کی سنسان گھڑیوں میں تختہ جہاز پر جا کر

پورٹ سعید کو دیکھتا۔ کہ کتنی دُور ہے۔ آخر پورٹ سعید آگیا۔ اور میری بیتاب نظریں کنارے کی طرف دوڑیں۔ کبھی اس کشتی کو کبھی اُس کشتی کو دیکھتی تھیں اور حیرت وحسرت کے ساتھ بے نیلِ مرام واپس آتی تھیں اس لئے کہ محمود کہیں نظر نہ آیا طبیعت پر افسردگی غالب آگئی۔ دماغ میں خیالات کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیونکر رہ گیا۔ انتظار کی حد ہوگئی۔ مسافروں نے اترنا بھی شروع کر دیا۔ کیونکہ پاسپورٹ وغیرہ سب سویز دیکھ لئے گئے تھے۔ اترنے کے ...... ٹکٹ بھی دیدئے گئے تھے۔ جب محمود نہ آیا تو میں نے جہاز سے اترنے کا عزم کر لیا اور اپنے کمرہ میں جا کر خدمتگار کو اشارہ کیا۔ کہ اسباب اوپر لیچلے یہ کہکر میں اوپر آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا نور نظر سیڑھی پر کھڑا ہے۔ اسے دیکھ کر محبت کے جذبات نے جو تھوڑی دیر پہلے حسرت اور افسوس کی کیفیتوں میں دب کر عجیب و غریب افکار کا ہجوم پیدا کر رہے تھے۔ نشاط و مسرت کی صورت اختیار کر لی۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کہ مجھے اس سے ملکر بہت خوشی ہوئی میں نے اپنے نور نظر کو چھاتی سے لگا لیا۔ اور محبت والفت پدری کا اظہار اسکی پیشانی پر بوسے سے کیا۔ اور میری آنکھوں نے گرم گرم آنسوؤں سے اس کے منہ کو دھو دیا میں اس کے چہرہ کو دیکھتا تھا کہ محبت سے تمتا رہا تھا۔ سامان پہلے ہی کُک کے آدمی کے سپرد کر دیا تھا۔ محمود کو میں نے اپنے دیسی اور یورپین رفقا سے ملایا۔ اور خواجہ صاحب سے بھی ملاقات کرائی۔ اور تمام رفقاء سفر کو خدا حافظ کہکر جہاز سے اترنے کا ارادہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بہت بڑی جماعت خواجہ صاحب کو ملنے آئی ہوگی مگر میں نے دیکھا کہ ایک متنفس بھی موجود نہ تھا۔

مصری مداری

میں ابھی جہاز پر ہی تھا کہ مصری مداری نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنے عجیب و غریب کرتبے دکھانے شروع کر دئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پیالہ لیکر مانگنا شروع کر دیا اور معاً مجھے وہ ساحر یاد آ گئے جنہوں نے فرعون مصری کے ایماء سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کیا تھا۔ اور قبل اس کے کہ اپنی شعبدہ بازی کا نمونہ دکھاتے۔ فرعون سے اُجرت اور معاوضہ کا سوال کر دیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ مداری صاحب جو دم زدن میں مرغی کے انڈے سے بچے پیدا کر کے دکھا رہا تھا خیرات کا پیالہ لئے ہوئے ہر شخص کے سامنے پھرتا تھا۔ انگریز مسافر باوجود دعوے علم سائنس کے اس قسم کے عجائبات پر مرتے ہیں اور انہوں نے دل کھول کر اسے پیسے دئے۔

پورٹ سعید میں چند گھنٹے

میرے لئے پورٹ سعید میں پانچویں دفعہ آنا تھا۔ ہم دونوں باپ بیٹا جہاز سے اُترے۔ اور کمپنی کے سٹیم لانچ پر سوار ہو کر کنارہ پر

آئے اور سب سے پہلے قرنطینہ کے دفتر میں پہنچے۔ اور ۲۵ قرش (جو ساڑھے تین روپے کے برابر ہوتے ہیں) محصول صحت ادا کیا۔ ازاں بعد دفتر صحت میں طبی معائنہ کرا کر سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ یہ سرٹیفکیٹ قاہرہ پہنچکر دکھانا لازمی ہوتا ہے۔ اور کسٹم ہوس (چنگی خانہ) گیا۔ گذشتہ سال کسٹم ہوس میں بہت دیر لگی تھی مگر اب تین ہی منٹ میں فارغ ہو گیا۔ اسباب کیلئے کُک کے آدمی کو ہدایت دیدی تھی۔ کہ وہ سٹیشن پر پہنچا دے۔ اور میں محمود کے ہمراہ ہوٹل اجیش (مصری ہوٹل) میں پہنچا۔ محمود ہمیشہ اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ میں اور چوہدری فتح محمد صاحب اس سے پہلے بھی اسی ہوٹل میں سال گذشتہ ٹھہرے تھے۔ جبکہ حیفا میں ہم گاڑی سے رہ گئے تھے۔ محمود اب بھی ۲۷ جون سے یہاں ہی مقیم ہے۔ یہ ہوٹل صرف شب باشی کے ہیں۔ کھانے کے لئے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔ ہوٹل کے پاس ہی مطعمتہ الہلال ہے۔ اس لئے وہاں چلے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا۔ کہ کھانے کی فہرست میں ایک کھانا بالکل شراب میں ہی پکایا ہوا بھی تھا۔ مسلمانوں کی حالت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے آہ!

خیر ہم نے کچھ مچھلی گوشت اور سبزی کھائی۔ اور قیمت ادا کر کے باہر نکلے۔ اور کُک کے دفتر میں جا کر ضروری انفرمیشن حاصل کی۔ اور ساڑھے بارہ بجے کی ایکسپریس سے قاہرہ کی روانگی کا انتظام کیا۔ جیسا کہ ہدایت دیدی گئی تھی۔ کُک کے آدمی اسباب لیکر سٹیشن کو پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں اور محمود ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر سٹیشن کو روانہ ہوئے۔ اور وقت مقررہ سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ یہاں کُک کے آدمی نے ایک چالاکی کی۔ اور میں اور محمود باوجود جاننے کے غلطی کر گئے۔ اس نے اسباب سٹیشن پر ایک اور شخص کے حوالہ کر کے کہا۔ کہ یہ آپ کو گاڑی میں سوار کرا دے گا۔ اور اپنی مزدوری مانگی۔ ہم نے سمجھا کہ یہ انتظام کُک کا ہی ہو گا۔ کُک کے قلی نے بندرگاہ سے سٹیشن تک اسباب پہنچانے کا کرایہ ۱۲ طلب کیا۔ مجھے دو ٹکوں کا اس قدر کرایہ دینا بہت ناگوار گذرا۔ اور میں نے کُک کے دفتر کو ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے مزدوری کی شرح کو درست بتایا۔ اور میں نے اسے ادا کر دیا۔ وہ چلا گیا۔ اور یہ دوسرا شخص جب سامان گاڑی میں رکھ چکا تو اس نے نئی مزدوری مانگی۔ مجھے حیرت ہونا قدرتی امر تھا۔ مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ چند آنوں پر اس سبق کو پڑھا جاتا۔ آخر وقت مقررہ پر گاڑی روانہ ہوئی۔ اور ۵ بجے کے قریب قاہرہ کے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ اور سٹیشن سے اتر کر موٹر لیکر شارع محمد علی میں محمود کے مکان پر جا اترے۔ اور اس طرح پر پہلی منزل ختم ہوئی طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری۔

گو ابھی سفر کا بہت حصہ باقی ہے۔ تاہم طوفانی سمندری سفر کا ایک بڑا حصّہ ختم ہو گیا تھا۔ اور اب آگے سمندر کا سفر بھی ایسا تکلیف دہ نہیں رہا تھا۔ مکان پر پہنچکر غسل کیا۔ اور طبیعت میں ایک خنکی اور سکون پایا۔

پورٹ سعید کے متعلق کچھ اور پورٹ سعید سے قاہرہ تک کے سفر پر ایک نظر

پورٹ سعید نہر سویز کے اس دہانہ پر واقع ہے جو بحیرہ روم سے ملتا ہے۔ یہ ۱۸۵۹ء میں اس زمین پر آباد ہوا تھا جو سمندر ہی سے نکلی ہوئی ہے۔ اس وقت نہر سویز کے لئے سروے کا کام ہو رہا تھا۔ نہر سویز کی کمپنی کا دفتر بھی یہاں ہی ہے۔ اور اس کے علاوہ بڑے تاجروں اور مختلف جہازی کمپنیوں کے دفتر بھی ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ سعید پاشا کے نام پر آباد ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا کوئلہ کا سٹیشن ہے۔ اور جہازرانی کا گویا مرکز ہے۔ آبادی ۴۵ ہزار کے قریب ہے۔ یہاں ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں۔ اور مختلف ملکوں کے لوگوں کا مجموعہ ہونے کے باعث یہاں کے لوگ بڑے ہوشیار، طرار اور عیار ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تاجر اور پھیری والے بھی اپنا سامان اور مال بعض اوقات گلے منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ مصری لباس زیادہ تر پہنتے ہیں لیکن یوروپی قومیں یونانی وغیرہ انگریزی ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ ترکی ٹوپی کا جو بہت اونچی ہوتی ہے۔ بہت رواج ہے۔ شہر کے محلے بمبئی کی طرز پر ہیں۔ بازار کشادہ اور صاف ہیں۔ مکانات خوشنما اور یوروپی طرز کے ہیں۔ مکانات بلا امتیاز مشرق و مغرب کے بہت صاف اور ستھرے رکھے جاتے ہیں۔ لوگ صفائی پسند ہیں۔ شہر میں قہوہ خانے بہت کثرت سے ہیں۔ قہوہ خانے کے آگے کرسیاں اور چھوٹے میز بچھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور لوگ ہر وقت ان میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے قہوہ خانوں میں موسیقی کا لطف بھی اٹھایا جاتا ہے۔ اور مختلف قسم کے باجے بجتے رہتے ہیں۔ سمندر کے کنارہ پر نہایت ہی پر فضا سڑک ہے۔ اور شام کو اسکا نظارہ خصوصیت سے قابل دید ہوتا ہے۔ سمندر میں ایک مقام پر جہاں تک چھوٹی سی سڑک بنا دی گئی ہے۔ نہر سویز بنانے والے فرانسیسی انجنیر کا بت کھڑا ہے۔ جو سمندر کیطرف منہہ کئے ہوئے ہے اسکا وجود نہر سویز کی تاریخ اور اس کے حوصلہ کی بلندی کو ظاہر کرتا ہے۔ شام کے وقت وہاں اتنا جمگھٹا ہوتا ہے گویا ایک بہت بڑا میلہ ہے۔ خوشباش اور بےفکر لوگوں کی منڈلیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ اور نوجوان عورتوں کے جھنڈ بھی منہہ پر نقاب ڈالے

ہوئے موجود ہیں۔ اور بعض بے نقاب بھی پھرتی ہیں۔

مصری ریل

مصری ریل گاڑی میں دن بدن ترقی ہو جاتی ہے۔ ان گاڑیوں کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ تمام گاڑیاں ایک ہی گاڑی کا حکم رکھتی ہیں۔ درمیانی دروازوں سے ملا دی گئی ہیں۔ دوسرے ان میں انسان سو نہیں سکتا۔ دونوں طرف بنچ بیٹھنے کو ہوتے ہیں اور درمیان میں گذرنے والوں کیلئے راستہ ہوتا ہے۔ اس راستہ میں ہر وقت ایک بازار سا لگا رہتا ہے۔ کیونکہ کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والے ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کھانے کیلئے عام طور پر روٹی اور انڈے ملتے ہیں۔ اور پینے کے لئے لیموں کی سکنجبین لیمونیڈ وغیرہ بھی ملتا ہے جسکو قازوزہ کہتے ہیں۔ اس گاڑی میں ایک ڈائنگ کار بھی ہوتی ہے۔ نہر سوئز کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ نہر سے عبور کرنے والے جہاز اچھی طرح نظر آتے تھے۔ جس جس قدر پورٹ سعید سے ہم قاہرہ کی طرف جا رہے تھے۔ دریائے نیل کی فیاضیوں کیوجہ سے زمین کی سیرابی اور شادابی کا ایک خاص لطف معلوم ہوتا تھا۔

فلاحین اور انکی عورتیں

مصری فلاحین مصری قومیت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ انکی عورتیں ان کے کاموں میں اس طرح حصہ لیتی ہیں جس طرح پر ہندی کاشتکاروں کی مستورات۔ عورتوں کے لباس سیاہ نیلے لمبی کرتے اور ازار پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور سر ننگے نہیں رکھے جاتے۔ فلاحین میں ہمارے ملک کیطرح پردے کی بہت بڑی پابندیاں نہیں۔ عورتوں اور بچوں کا لمبا اور ڈھیلا ڈھالا لباس بہت ہی خوشنما اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اسماعیلہ سے آگے جب ہم گئے تو دیکھا کہ خریف کی فصلیں کھڑی تھیں اور گیہوں صاف کئے جا رہے تھے۔ جو فصلیں بھی کھڑی تھیں وہ بہت سرسبز اور سیر حاصل معلوم ہوتی تھیں۔ مصریوں کا بہت بڑا رہنما جو اس سفرنامہ کی اشاعت کے وقت فوت ہو چکا ہے اسعد زاغلول پاشا بھی فلاحین کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور لوگ انکی اس قدر عزت کرتے تھے کہ اگر اس کے لئے انسانی خون کی ضرورت ہوتی۔ تو ہر ایک شخص دوسرے سے پہلے اپنے کو پیش کرتا۔ اور شاید قرعہ اندازی یا ڈیول لڑنے کی نوبت آجائے۔

قاہرہ تک تھرڈ کلاس کا کرایہ سات روپے کے قریب ہے۔ اور تھرڈ کلاس کی گاڑیاں ہندوستا

کی گاڑیوں سے بہتر نہیں ہیں۔ چونکہ پورٹ سعید میں عموماً جہاز رات کو بھی آتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ قریباً رات بھر ہی کھلا رہتا ہے۔ پرانا شہر کسی قدر فاصلہ پر ہے۔ اور یہ نیا شہر ہے۔ ہر قسم کی سواریاں فٹن موٹریں گدھے ملتے ہیں۔ اور ایک حصۂ شہر میں خچروں کی ٹرام بھی چلتی ہے۔ پورٹ سعید میں ہندوستانی دعموماً سندھی) دوکاندار بھی ہیں۔ اور رتال اور آنکھ بنانے والے راول بھی نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی مصر کا حال ہے۔ میں چونکہ قاہرہ میں چار مرتبہ آیا گیا ہوں۔ اور جیسا کہ لکھ چکا ہوں مصر کے متعلق تفصیلی حالات۔ بلاد اسلامیہ والی جلد میں بیان کروں گا۔ (انشاء اللہ العزیز) اس لئے صرف مختصر روزنامچہ پر اس جگہ کفایت کرونگا وباللہ التوفیق۔

۳۰ رجون ۱۹۲۵ء دوشنبہ قاہرہ (مصر)

صبح اُٹھ کر ضروریات سے فراغت پاکر نماز پڑھی اور پھر ناشتہ کیا طبیعت میں ایک سکون اور لذت معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ عید کے بعد میں یہاں سے انگلستان روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ اور واپسی پر چند روز تک رہ کر سیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے سرسری طور پر بعض ضروری مقامات کا دیکھنا تجویز کیا۔ گذشتہ سفر یورپ میں بھی یہاں چند روز ٹھیرنے کا موقعہ ملا تھا میرے لئے اب تیسری مرتبہ ہے کہ یہاں آیا ہوں۔

مصر کی زمین خدا کی کتاب میں

مصر کی زمین کا خدا تعالیٰ کی کتاب میں خاص طور پر ذکر آیا ہے۔ اور اسلامی تاریخ کے ساتھ اسکا بہت پرانا تعلق ہے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا مصری کے رہنے والی تھیں۔ اور اسی لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو ہدایت فرمائی تھی کہ تم مصر فتح کرو گے وہاں کے لوگوں سے نیک سلوک کرنا کیونکہ وہ ہمارے ننہیال ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدسی قوت کا اس سے پتہ لگتا ہے۔ کہ کس قدر دُور کے رشتہ کی آپ نے قدر کی۔ یہ متمم اخلاق رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی شان کے شایاں ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی مصر بلکہ شاہ مصر کے محل میں گذری۔ اور بالآخر آپ مصر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر فرعون اور اس کے دربار کو تبلیغ کے لئے آئے۔ اور بنی اسرائیل کی نجات کا ذریعہ ہوئے قرآن مجید نے ان واقعات کو جس شان سے بیان فرمایا ہے۔ اس سے بہت بڑے سبق ہم کو آج بھی ملتے ہیں۔ بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید ایک زندہ اور دائمی کتاب ہے۔ اس لئے اس کے اندر حقائق مستقلہ ہیں۔ وہ ہر عہد وعصر میں ایک اُسوہ کو پیش کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں غیر معمولی حوادث

کامردانہ اور مقابلہ کرنے ۔ **قومی عصبیت** ۔ جبر و استقلال کی جو شان پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر ایک دائمی حیثیت رکھتی ہے۔ اور انکی ہر وقت ضرورت ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور مشن ایک خاص شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ کچھ شک نہیں وہ بحیثیت خداتعالیٰ کے ایک صادق مرسل اور اولوالعزم نبی کے خداتعالیٰ کی توحید۔ تزکیہ نفس۔ اور تہذیب اخلاق کے معلم تھے مگر جو پہلو انکی نبوت میں نمایاں ہے۔ اور انکی دعوت کا جو مقصد عظیم نظر آتا ہے۔ خداتعالیٰ نے جب انکو خلعت نبوت سے سرفراز فرمایا۔ تو حکم دیا۔

"اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى"

موسیٰ! تم فرعون کیطرف جاؤ۔ اس لئے کہ وہ بہت سرکش اور ظالم ہوگیا ہے۔ اس کے پاس جانے کا مقصد عظیم کیا ہے۔ اس سے کہو۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ

اے فرعون! خداتعالیٰ کے بندوں یعنے بنی اسرائیل کو مجھے واپس دیدو۔ جنکو تم نے اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ اور ان پر ہر قسم کے ستم روا رکھتے ہو۔ میں تمہارے پاس اسی مقصد کیلئے رسول ہو کر آیا ہوں اور اور اپنے منصب رسالت میں امین ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسوی مشن کا سب سے بڑا مقصد بنی اسرائیل کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنا تھا۔ اور فرعون کی اسیری سے نجات دلا کر انہیں محکومی کی ذلت سے نکال کر

خود حکمران بنا دینا تھا

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ذریعہ نجات ہوئی۔ اور بحیرۂ احمر کے پانی اس تاریخی واقعہ کے آج بھی گواہ ہیں جو خداتعالیٰ کیطرف سے حضرت موسیٰ کی تائید میں ایک اعجازی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور وہ فرعون کا غرق اور حضرت موسیٰ کا پار اترجانا تھا۔ میں مصر میں داخلہ کے وقت سمندر کے اس حصّہ کو نہایت ہی دلچسپی اور غور سے دیکھتا رہا۔ اور بار بار میرے دل میں آتا تھا۔ کہ

خداتعالیٰ کے نبی کسطرح پانیوں پر حکومت کرتے ہیں

گہوارۂ مسیح علیہ السلام

میں موسوی عہد سے گذر گیا اور میں نے دیکھا کہ اس پر تیرہ صدیاں گذر چکی ہیں بنی اسرائیل جو فرعون کی غلامی سے موسیٰ کے ہاتھ پر نجات پاچکے

تھے۔ ارض مقدس میں داخل ہوکر اپنی حکومت کا لطف اٹھا چکے ہیں اور زمانہ کے بُعد نے ان میں شوخی، خود رائی، ضد اور تنگدلی پیدا کردی ہے۔ اور اپنی علمی عملی اور انتظامی خرابیوں میں مبتلا ہوکر خدا تعالیٰ کی منعم علیہ جماعت میں سے نکلکر مغضوب ہو رہے ہیں۔ اسوقت خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے گھرانے میں عہد نبوت کو ختم کرکے بنی اسمٰعیل میں منتقل کرنے کا مشیت ازلی کے ماتحت ارادہ فرمایا۔ اور مسیح کو بن باپ پیدا کرکے تصویری زبان کے رنگ میں بتایا۔ کہ یہ اسرائیلی انعام نبوت کی آخری اینٹ ہے۔ مگر نابکار یہودیوں نے جو اپنی ظاہری رسوم اور الفاظ پرستی میں حقیقت اور بصیرۃ سے دور جا پڑے تھے۔ خدا کے ایک ہونے والے نبی اور اس کی ماں پر مختلف قسم کے الزام رکھنے شروع کئے۔ اور عمران کی بیٹی کو اس کے سوا کوئی موقعہ نظر نہ آیا۔ کہ وہ ارض مقدس سے نکلکر مصر میں داخل ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنے خیالات کے سلسلہ میں دیکھا کہ ایک شریف و نیک سیرۃ اسرائیلی خاتون اپنے دودھ پیتے بچے کو لئے گدھے پر سوار مصر میں داخل ہو رہی ہے۔ اور اس طرح پر اپنی اہل قوم کی زبان درازیوں سے نجات پانا چاہتی ہے۔ اپنی زندگی کے کچھ دن اس سرزمین میں اس نے گذارے۔ اور اپنے اکلوتے بچے کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہی۔ اس پہلو سے میں نے مصر کو دیکھا۔ اور میں نے کہا۔

یہ بھی نبوت کی سرزمین ہے

اور اسے یہ عزت حاصل ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اس پر چلتے پھرتے رہے اور خدا تعالیٰ کے وہ فرشتے جن کا نبیوں کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے۔ اس سرزمین پر اُترتے رہے۔ اور خدا کی تجلیات کا مظہر یہ زمین قدیم سے ہوئی ہے۔ میرے خیالات کا یہ سلسلہ بہت لمبا تھا۔ میں آگے نکلکر پھر پیچھے ہٹا۔ اور یعقوب کی آنکھوں کے تارے کو تلاش کرنے لگا۔

یوسفی دور

اور اب میں نے مصر کی سرزمین کو ایک اور عہد میں دیکھا۔ یہ یوسفی عہد تھا۔ اسوۂ یوسفی پر میں نے نظر کی۔ اور دیکھا کہ آج بھی اخوت کے جذبات کی حقیقت مفقود نظر آتی ہے۔ اور ہر عہد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اخوت کی محبت کو عداوت کے "تاریک غبار سے بدل لیتے ہیں۔ اور ان کے خون سفید ہو جاتے ہیں۔ اسلئے عفو و درگذر کی تعلیم ہر عہد میں ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح پر ضبط نفس۔ عفت۔ اور تحفظ ناموس۔ اور امانت و صدق کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ پس اسوۂ یوسفی میں بھی وہی حقائق مستقل نظر آتے ہیں۔ مصر کی سرزمین نے "ان تمام واقعات اور حالات کا ایک نقشہ میرے

میرے سامنے رکھدیا۔ اور جسطرح سینما ٹوگراف میں نظارے یکے بعد گذرتے ہیں میری متخیلہ ان تمام نظاروں کو یکے بعد دیگرے میرے سامنے لے آئی۔ اور میں نے دیکھا کہ کبھی میں موسوی عزم و استقلال کی شان کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ اور کبھی **اسوہ یوسفی** کا منظر میرے سامنے ہے۔ اور کبھی براہیمی **تعلقات مصری** ایک شان میرے سامنے جلوہ گر ہے۔ خیالات کی اس رو میں میں مصری شہزادی ہاجرہ کے اس اقبال اور شان کو دیکھنے لگا۔ جو وادیٔ غیر ذی زرع میں نظر آتی ہے۔ اس کا تعلق اس ہادیٔ عظیم اور صاحب خلق عظیم **رحمتہ اللعالمین** کا امین تھا۔ جو مثیل موسیٰ و یوسف ہو کر نسل اسمٰعیل سے فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہونے والا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے آپکو مکہ معظمہ کی وادی اور فاران کی چوٹیوں پر پایا۔ اور میں غور فکر کے ایک لمبے سلسلہ میں جدا گیا مکہ معظمہ اور اس کے فیوض و برکات کے ابدی اور نا متناہی سلسلہ کو میں نے دیکھا کہ

یہ سب کچھ ایک عورت کے جذبات کا نتیجہ ہے

اس کی صداقت اسکا خدا پر ایمان و توکل اسکی رضا کے لئے بیقراری نے کیا کرشمہ دکھایا ہے۔ کہ آج روئے زمین سے لوگ وہاں چلے آتے ہیں۔ اور دنیا کے ہر حصے میں ہر وقت اس کے پوتے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتے ہیں۔ اور اسطرح پر خود اس کے مدارج میں بھی ترقی کا باعث ہوتے ہیں میں اس نظارہ پر غور کرتا تھا۔ اور سوچتا تھا۔ کہ

یہ سب کچھ ایک مصری شاہزادی کیلئے ہوا کہ جسکا نام ہاجرہ علیہا السلام ہے

اسے دیکھ کر مصری سرزمین سے بوئے محبت اور اخلاص کے جذبات میں ایک برقی رو پیدا ہو گئی مجھے اسکی مٹی اس کے سنگریزوں۔ درختوں یا نیموں۔ اور اس کے ہر ذرہ سے محبت ہو گئی۔ اور میں مصر کی سرزمین پر

ادب اخلاص اور نیاز مندی سے چلنے لگا

ایک نکتہ معرفت احمدی قوم کیلئے

اسلئے کہ مجھے اپنے آقا و محسن سید ولد آدم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو ان ذرات سے آتی تھی۔ میں نے مصر کو دیکھا اور اس کی حالت پر غور کیا مجھے معلوم ہوا کہ آج بھی طاغوت اور فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے ایک موسیٰ کی ضرورت ہے۔ میں اسے سوچتا تھا۔ کہ یکایک میری توجہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس وحی ایک موسیٰ ہے میں اسے ظاہر کروں گا۔

پر چل گئی۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ تمام پیشگوئیاں جو اس عہد سے وابستہ ہیں یکے بعد دیگرے میرے سامنے آنے لگیں۔ کہ کس طرح پر مسلمان آخری زمانے میں **یہودیوں** سے مناسبت پیدا کرینگے اور وہ واقعات اور حالات اب ظاہر ہو چکے ہیں۔ پھر خدا تعالےٰ انکی نجات کے لئے ایک **وجود** کو نازل کرے گا۔ **جو جری اللہ فی حلل الانبیاء** کہلائیگا۔ اور بعض خاص شانوں کے لحاظ سے وہ موسےٰ عیسےٰ علیہما السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا **برونکامل** ہوگا۔ اور اسکے خلفاء میں سے خلیفہ ثانی کے عہد میں مصر میں احمدیت کے لئے ایک

شاندار مستقبل پیدا ہو جائیگا

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بہت سے الہامات میرے فکر میں آنے لگے۔ اور میں نے دیکھا کہ کسطرح خدا کی مشیت حضرت خلیفہ ثانی کو دو دفعہ مصر لائی۔ اور کسطرح اس کے ہاتھ پر مصر میں احمدیوں کو بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے اس نے اپنی خلافت سے پہلے شیخ عبدالرحمٰن صاحب اور سید ولی اللہ شاہ صاحب کو تعلیم کیلئے مصر بھیجا۔ اور اس طرح مصر کو احمدیت سے آشنا کرنے کی داغ بیل لگائی۔ اور پھر وہ خود مصر میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے لئے آیا مگر مشیت ایزدی میں کچھ اور تھا لیکن جب وہ خلیفہ ہوا تو خدا تعالیٰ نے اسے بحیثیت **خلیفۃ المسیح** مصر آنے کا نہایت شاندار موقعہ دیا۔ چنانچہ سال گذشتہ (۱۹۲۴ء) میں جبکہ وہ **لنڈن کی مذہبی کانفرنس** میں شمولیت کے لئے جا رہا تھا۔ مصر آیا اور اہل مصر کو مختلف ذرائع سے اپنا پیغام بہ نفس نفیس پہنچایا۔

عرفانی کیساتھ مصر کا تعلق

میں جب اس سلسلہ تبلیغ پر غور کر رہا تھا۔ تو خدا تعالیٰ کے فضلوں اور رحمتوں کو جو مصری سلسلے میں مجھ پر ہوئی ہیں۔ دیکھکر

بے اختیار میرا سر اپنے رب کریم کے حضور جھک گیا

مصر میں تبلیغ کے سلسلہ میں خدا تعالیٰ نے کس طرح پر مجھے توفیق دی۔ کہ میں اپنے پلوٹھے بیٹے محمود احمد کو اس مقصد کیلئے حضرت خلیفۃ المسیح کی منشا کے ماتحت بھیجنے کے قابل ہوا۔ جو ۱۹۲۲ء کے آغاز سے یہاں ہے۔ اور میں اسی کے مکان پر بیٹھ کر تصورات کے ایک لمبے اور لذیذ سلسلے میں مست ہوں۔ الحمد للہ اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً حمداً کثیراً۔

حضرت خلیفۃ المسیح سال گذشتہ جب تشریف لائے تو آپنے کاشانہ ابن **عرفانی** ہی پر قیام

پسند فرمایا۔ یہ ایک تاریخی اہمیت ہے جس پر عرفانی کی نسل فخر کرتی رہیگی۔ مصر کے خوشنما ہوٹل اور فلک نما مکانات اس کے قیام کیلئے میسّر آ سکتے تھے۔ وہ چاہتا تو یقیناً حکومت کے گیسٹ ہوس میں اسے عزت سے جگہ دی جاتی۔ مگر اس نے یہی چاہا کہ اپنے ایک خادم زادے کو نوازے۔

میرے نقطۂ خیال سے مصر کی اہمیت میرے خیال میں اور بھی بڑھ گئی۔ میں جانتا ہوں وہ یقین اور بصیرت سے جانتا ہوں کہ مصر کی آزادی میں احمدیت کا مستقبل نمایاں ہے۔ اور خدا تعالیٰ چاہیگا۔ تو نیل کی اس سرزمین میں احمدیت کا ستارہ ایک شان کے ساتھ طلوع ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعض الہامات اور رویا ایسے ہیں جو مصر کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ میرا اپنا ذوق اور فہم ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیگا۔ اور جس رنگ میں چاہیگا انہیں پورا کریگا۔

غرض میں خیالات کی اسی لہر میں عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کے مکان میں بیٹھا ہوا اپنے مصری پروگرام کو تیار کرنے لگا۔ اور میں نے پسند کیا کہ آج سیدنا حسین اور ازہر کی یونیورسٹی کو دیکھوں۔ اور اگر وقت مل سکا۔ تو بعض اور دوسرے مقامات کو بھی دیکھوں گا انشاء اللہ العزیز۔ غرض ناشتہ وغیرہ کرکے ہم اپنے اس پروگرام پر روانہ ہوئے۔

مصر کی سواریاں

مصر میں ہر قسم کی سواریاں ملتی ہیں۔ گھوڑا گاڑیاں۔ موٹریں۔ گدھے۔ اونٹ۔ ٹرام۔ قاہرہ کے بڑے بازاروں میں ٹرام وے جاری ہے۔ جو اہرام مصری تک اور جدید مصر تک جاتی ہے۔ اس میں عورتوں کیلئے جداگانہ درجہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کرایہ کی موٹریں بھی کثرت سے چلتی ہیں۔ اور تمام ان بازاروں میں جہاں ٹرام وے نہیں جاتی ہے موٹر لاریاں مسافروں کو ادھر سے ادھر لیجانے کے لئے دوڑتی پھرتی ہیں۔ اس کے علاوہ گھوڑا گاڑیاں جو دن بدن کم ہو رہی ہیں ہیں۔ اور سواری کیلئے گدھے بکثرت ملتے ہیں۔ یہاں گدھے کی سواری ذلیل نہیں سمجھی جاتی۔ اور گدھے بھی معمولی نہیں ہوتے۔ نہایت عمدہ خوبصورت اور ان پر زین اور ساز و سامان نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ سبک اور سریع رفتار ہوتے ہیں کسی صورت میں گھوڑوں سے کم نہیں ہوتے۔

اونٹوں کی سواری بھی عام ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتی چھکڑے بھی ہیں جن پر عام طور پر دیہاتی لوگ بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ اور قاہرہ کے بازاروں میں عموماً دیہاتی عورتوں اور بچوں کے غول کے غول چھکڑوں میں ادھر سے ادھر جاتے نظر آتے ہیں۔

مصری سکہ ہندوستانی روپیہ اب ختم ہوگیا۔ مصر کے بازاروں میں یہ پیاسٹر کا رواج ہے جنکو قرش کہتے ہیں یہ ایک پونڈ کے ۹۰ سے لیکر ۹۹ تک آتے ہیں مگر ہندوستانی روپیہ اور نوٹ تبدیل کرنے میں وقت نہیں ہوتی ہر ملک کا سکہ فوراً تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں نے پورٹ سعید میں ہی کچھ پونڈ عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کو دیکر مصری سکہ میں تبدیل کر لئے تھے۔

مصر کی قبر پرستی مصر جسطرح پر سر و بدن یورپین فیشن اور طرز زندگی کا غلام ہو رہا ہے۔ اسی طرح اسکی قبر پرستی بھی برابر بڑھ رہی ہے۔ ۳۰ جون کی صبح کو میں نے سب سے پہلے سیدنا حسین کے مرقد مبارک (فرضی یا اصلی) کے دیکھنے کا ارادہ کیا۔ دراصل میں ازہر کی یونیورسٹی کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اور اور سیدنا حسین کا مرقد قریب ہی ہے۔ اس لئے اس کے دیکھنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا۔ سیدنا حسین دراصل ایک بہت بڑی عالیشان مسجد ہے۔ جو بہت سے سنگین ستونوں پر بنائی گئی ہے۔ اور نمازیوں کیلئے تمام مسجد میں اعلیٰ قسم کے قالین کا فرش ہے۔ اس مسجد میں سے ہی گذر کر زوار کو جانا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک کوفہ سے لاکر یہاں دفن کر دیا گیا تھا۔ حضرت امام حسینؓ کی قبر کا مسئلہ بھی ایک راز ہو رہا ہے قسطنطنیہ میں اس مقام حسینی کے متعلق یہی کہا جاتا ہے۔ کہ وہ آپ کا مزار ہے۔ مرزا حیرت نے ایک زمانہ میں شہادت امام حسینؓ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اور بڑے زور سے ثابت کرنا چاہا تھا۔ کہ امام حسینؓ شہید ہی نہیں ہوئے بلکہ وہ میدان جنگ سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور وہاں وفات پائی۔ میں مرزا حیرت سے اس معاملہ میں اتفاق نہیں کرتا لیکن انہوں نے یہ خیال محض حضرت مسیح علیہ السلام کی اعجازی ہجرت کے مسئلہ کے اتباع سے پیدا کیا تھا۔ کیونکہ ان ایام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مسیح کا سری نگر آنا ثابت کیا تھا۔ غرض یہ زیارت گاہ اس مسجد کے پیچھے ہے۔ اور برابر زیارت کرنیوالوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ مرد اور عورتیں مزار مبارک کے جنگلے کو پکڑ کر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو پیش کرتے ہیں۔ قبر پرستی کا یہ مذاق اسقدر بڑھ گیا ہے کہ دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اور مسجد کی بعض اوقات بیحرمتی ہوتی ہے۔ ازہر کے طالب علم بھی یہاں آکر اپنے سبق رٹتے ہیں۔ چونکہ بیٹھنے کیلئے بہترین جگہ ہے۔ اور بعض اوقات کچھ قرآن مجید یا دلائل الخیرات پڑھنے کی جرأت بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اکثر یہاں آکر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کا جھوم جھوم کر پڑھنا اور سر ہلانا عجب شان بے تمیزی پیدا کرتا ہے۔

سیدنا حسین کی عمارت نہایت شاندار ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہاں سیدنا امام حسین رضی اللہ

عنہ کا سر مبارک کوفہ سے لاکر دفن کیا گیا تھا۔ اس روضہ میں اور بعض مقامات سیدہ زینبؓ وغیرہ میں کسی نصرانی یا غیر مسلم کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے جب کوئی دروازہ پر جاتا ہے تو اسکے مسلمان ہونے کا سرسری امتحان کر لیا جاتا ہے۔ جب وہ کلمۂ طیبہ پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ تو اسے اندر جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ دروازے کے باہر جوتے اتارنے کی جگہ ہے۔ اور ہر شخص کو اپنا جوتا وہاں اتار لینا چاہیئے۔ جوتوں کی حفاظت کرنے والے بھی دروازے ہی پر رہتے ہیں۔ اور وہ بہت احترام اور احتیاط سے جوتا رکھ لیتے ہیں۔ واپسی پر آپ کے حوالہ کر دیں گے۔ اس خدمت کے معاوضہ میں آپ اسے کچھ دیدیجئے میں نے اوپر لکھدیا ہے کہ یہ قبر پرستی ہے۔ مرد اور عورتیں اکثر مرقد سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اور

یا حسیناہ ادرکنی یا مولاہ ادرکنی

کے نعرے مارتے رہتے ہیں۔ عورتوں کے داخلہ اور زیارت کے لئے خاص اوقات اور ان کی آمد و رفت کے لئے جداگانہ راستہ ہیں۔

جامع ازہر | سیدنا حسین کی زیارت کے بعد جامع ازہر کو دیکھنے گیا۔ جو وہاں سے دو تین منٹ کا راستہ ہے۔ قاہرہ کی آبادی پر ایک ہزار سال گذر رہا ہے ۳۵۸ہجری میں فاطمیئین نے مصر پر حملہ کیا تھا اس وقت تک ان کا مرکز قیروان واقعہ ٹیونس تھا۔ ان کے سپہ سالار جوہر نے مصر فتح کر کے فسطاط کے قریب ایک نیا شہر آباد کرنے کی کوشش کی۔ اور اسکا نام القاہرہ رکھا۔ اور اس نے شیعہ مذہب کی تعلیم و تربیت کے لئے جامع الازہر کی بنیاد ڈالی۔ اس مسجد کی بنیاد سے شیعہ مذہب کی اس شاخ کیلئے پراپیگنڈا کرنا تھا جو باطنیین یا فاطمیین کے نام سے مشہور چلی آتی ہے مجھ کو فاطمی خاندان اور عباسی حکومت کے تعلقات پر بحث کرنیکی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ عباسیوں نے اپنے عہد حکومت میں علوی شیعوں نے بہت مصائب جھیلے تھے۔ اور انکو جلاوطن ہونا پڑا تھا۔ جب مصر پر فاطمیوں نے قبضہ کیا ہے۔ اس وقت مصر میں شافعی مذہب کا زور تھا۔ اس لئے کہ حضرت امام شافعی نے اپنی زندگی کا آخری حصہ یہاں ہی بسر کیا تھا۔ اور یہاں ہی وفات پائی۔ چنانچہ آپ کا مقبرہ اس وقت بھی مرجع انام ہے۔ فاطمی خلفا نے تقیہ کر کے شافعیوں کے ساتھ توافق مذہب ظاہر کیا۔ اور اس طرح پراپیگنڈا سکہ اچھی طرح جمالیا۔ اور اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت کیلئے اس مسجد کو تعمیر کیا۔ اور مختلف ممالک میں اپنا پراپیگنڈا کرنے کے لئے انہوں نے یہ تجویز کی کہ علماء اور فقہاء کو دربار میں عزت کے مقام پر بٹھایا جائے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا سے علماء اس حصول کی بنا کے

مصر میں جمع ہونے لگے۔ اور انہیں حکومت مصر نے بیش قرار تنخواہیں دینی شروع کیں۔ اور اس طرح پر مختلف ممالک سے طالب علم بھی وہاں جمع ہونے لگے۔ اور فاطمی حکومت کی خوبیوں کو ذہن نشین کرنے کا ذریعہ یہی علماء اور تلامذہ ہوئے۔

جامع ازہر ابتداء میں اتنی بڑی نہ تھی لیکن جوں جوں طالب علموں کی کثرت ہونے لگی۔ اسے بڑھاتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت اس کی ساحت ۱۲۰۰۰ مربع میٹر ہے۔ پہلی تعمیر میں اس کی صرف ۷۶ ستون تھے۔ جو آج ۳۷۵ ہیں اور نو دروازے ہیں۔ ابتداءً ان علماء اور فقہاء کو غیر مقرر تنخواہیں ملتی تھیں۔ مگر ۳۶۰ھ ہجری میں تنخواہیں مقرر ہوگئیں۔ اور ازہر کی آمدنی آج کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی ہے۔ دو سو سال تک جامع ازہر شیعہ مذہب کا مرکز رہی میرا خیال ہے کہ سیدنا حسینؑ کے مزار کا راز بھی ازہر کی تعمیر میں ہی مخفی ہے۔ گو میں اس پر ابھی تک کوئی تاریخی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اور نہ سفر میں میرے پاس سامان تاریخ ہے۔ تاہم میرا ارادہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو فاطمی حکومت کی تاریخ کی مدد سے اس کی تحقیق کی جاوے۔ چونکہ شیعہ حکمران اپنے مذہب کی اشاعت اور سیاسی اغراض کی تکمیل کیلئے مصر کو اپنا مرکز بنا چکے تھے۔ اسلئے عوام کی کشش اور دلچسپی کیلئے جہاں ایک طرف جامع ازہر کی تعمیر کی اور علماء و فقہا کیلئے بیش قرار روپئے مقرر کئے۔ اور اپنی حکومت کیلئے مختلف قسم کی احادیث وضع کیں۔ جن میں مہدی کی بعض احادیث بھی ہیں۔ انہی میں انہوں نے کیا تعجب کہ سیدنا حسینؑ کے سر مبارک کے مدفن کا عجوبہ بھی کھڑا کر دیا ہو۔ تاکہ زائرین اس کشش سے جمع ہوں۔ اور وہ فاطمی سیاست کے پراپیگنڈہ کا موجب ہو سکیں جہاں تک مجھے ازہر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسجد سیاسی نقطۂ خیال کا مرکز رہی ہے۔ اور اس کی بنیاد (اللہ بہتر جانتا ہے) واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ محض سیاسی اغراض کیلئے رکھی گئی تھی۔ اور حالات کا سلسلہ بتلاتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ تقویٰ پر بنیاد رہو۔

دو سو سال تک یہ مسجد فاطمی تحریک کی اشاعت کا بہت بڑا مرکز رہی۔ یہاں تک کہ ۵۶۷ھ ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر کو فتح کیا۔ سلطان صلاح الدین اسلام کی سیاسی مصیبتوں کو دیکھتا تھا۔ اور یورپ کے اس عناد و تعصب پر نظر کرتا تھا۔ جو اسے مسلمانوں سے تھا۔ اس نے تمام مسلمانوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کیلئے جامع ازہر کو ذریعہ بنانا ضروری سمجھا۔ صلاح الدین نے اولاً بغداد کے عباسی خلیفہ کی بیعت کر کے فرمان حکومت حاصل کیا۔ اور جامع ازہر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ چونکہ صلاح الدین مذہباً شافعی تھا۔ اس لئے اہل مصر نے بڑی خوشی سے اس کی حکومت کا خیر مقدم کیا۔

سلطان صلاح الدین جانتا تھا کہ ازہر شیعہ مذہب کا تعلیمی مرکز ہے۔ اور فاطمیوں کا سیاسی مرکز اشاعت اس لئے اس نے ازہر کی تعلیمی حالت کو تبدیل کر دینا ضروری سمجھا۔ اب تک وہاں صرف شیعہ عالم درس دیتے تھے۔ مگر صلاح الدین نے تمام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنیکے لئے یا بالفاظ دیگر اتحاد پیدا کرنے کے لئے اہل سنت کے ہر چہار اماموں کی تعلیم کی ازہر میں اجازت دیدی۔ اور ہر ایک مذہب کے مستند عالم وہاں پر درس جاری کرنیکے قابل ہوگئے۔ نظام تعلیم کی اس خوبی تبدیلی نے عجوبہ نما اثر کیا۔ اور دنیا کے ہر گوشۂ اسلامی سے طالب علم آنے لگے۔ اور ازہر کی ترقی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دسویں ہجری کے آغاز میں سلطنت عثمانی کا مصر پر قبضہ ہوگیا۔ چونکہ ازہر میں تعلیم بالکل مفت تھی۔ اور اب تک ہے اس لئے کہ دنیا کے تمام ممالک سے طلبا آتے تھے۔

اس زمانہ میں ازہر کی اصلاح اور تجدید کا خیال مفتی شیخ محمد عبدہٗ کے وقت میں پیدا ہوا۔ مگر اس میں کوئی نمایاں کامیابی نہ ہوسکی پچھلے سالوں میں ازہر کے طلبا نے پولٹکس میں بجد حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور جدید تحریک کے بانی سعد زاغلول پاشا خود بھی ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک گروہ اس خیال کا پیدا ہوگیا ہے کہ اب تک اس مدرسہ میں سیاسی جوڑ توڑ کی رُوح چلی جاتی ہے۔ اور دینی علوم اور قرب الٰہی کے ذریعہ سے یہ لوگ فارغ ہیں۔ اسلئے وہ چاہتے ہیں کہ انکی اصلاح کریں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اصلاح کی بہت ضرورت ہے ازہر کی اسقدر مختصر تاریخ کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا۔ اسکا ذکر کرتا ہوں۔

ازہر کے اردگرد غلاظت

میں جس سڑک سے ازہر کے دروازہ میں داخل ہوا۔ وہ ازہر کے شرقی جانب ہے۔ وہ اسقدر غلیظ اور کوڑا کرکٹ سے پُر تھی کہ ہندوستان کے دیہات اور قصبات کے کوچے اس سے بہتر حالت میں پائے جاتے ہیں۔ میری حیرت اور استعجاب کی حد نہیں رہی۔ جب میں نے ازہر کے اندر جاکر انکی سڑی ہوئی چٹائیوں کو دیکھا۔ اور میں نے دیکھا کہ طالب علموں نے تربوز کھاکر مسجد ہی میں اسکے چھلکے اور بیج ڈالے ہوئے تھے۔ اور مسجد کا کچھ بھی احترام نہ تھا۔ مصر میں جانیوالا سیاح دیکھکر حیران ہوجاتا ہے۔ کہ ازہر کی یونیورسٹی جہاں علوم دینیہ پڑہائے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور جہاں سے علما کی وہ جماعت تیار کی جاتی ہے۔ جو دنیا میں صداقت اور حقیقت اسلام پھیلانے کے مدعی ہیں۔ اس مرکز کا اور جو عام مدرسہ ہی نہیں مسجد بھی ہے یہ حال ہے کہ والرجز فاہجر کی تعلیم پر قطعاً عمل نہیں۔

ازہر کا بورڈنگ ہوٹل

ازہر میں تعلیم پانیوالے طالب علموں کیلئے بورڈنگ ہوس بھی ہے۔ جو مسجد کے اوپر اور بعض متصل

مکانوں میں ہے۔ اور یہ بورڈنگ طلبار کی سکونت کے لحاظ سے مختلف حصوں پر منقسم ہیں۔ جنکو رواق کہتے ہیں۔ کوئی طالب علم اپنے ملک یا مذہب کے رواق کے بغیر کسی دوسرے میں نہیں رہ سکتا۔ خواہ کتنی ہی گنجائش کیوں نہ ہو۔ ہر طالب علم کو روٹی اور کچھ نقدی ماہواری ملتی ہے۔ اور ازہری روٹیوں نے علی العموم ان میں حوصلہ اور خودداری کم کردی ہے۔

میں نے دیکھا ہے بعض طالب علم جو کسی عصری جگہ سے معقول وظائف پاتے ہیں۔ وہ بھی ازہری روٹیوں کو لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ حرص اور مفت لینے کی عادت انہیں بہت سے اخلاق سے محروم کر رہی ہے طلبا کی تعلیم کا نظارہ نہایت حیرت افسوس افزا ہوتا ہے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی بھی شخص جو ازہر میں گیا ہو۔ اور اس نے ازہر کی حالت پر افسوس نہ کیا ہو۔ ازہر میں ایک شخص برابر ساڑھے سال سے تعلیم پاتا ہے اور اب اسے ایسے ایوان جنون سے نکلنا موت معلوم دیتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ کیا حالت ہے۔

طلبار میں نماز کی پابندی قطعاً نہیں۔ اور نہ کوئی بازپرس کیجاتی ہے۔ نماز ہو رہی ہے۔ اور طلباء باہم مجمع لگے گپیں لڑا رہے ہیں۔ یا روٹیاں نگل رہے ہیں۔ طلبا کو اپنا سامان رکھنے کیلئے بڑی بڑی الماریوں میں ایک چھوٹا سا خانہ ملا ہوا ہے جسمیں وہ کتابیں اور کپڑے رکھ لیتے ہیں۔

رواق شام میں چند منٹ میں نے بورڈنگ ہوس کو دیکھنے کے لئے رواق شام کو دیکھا۔ شیخ رواق نہایت اخلاق سے ملا۔ اور محبت سے باتیں کیں۔ جنمیں سے ایک مکالمہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

عرفانی۔ استاذ المکرّم۔ مصر کی کاروباری زبان قرآن مجید کی زبان سے بالکل الگ ہے۔ اخبارات بھی خارجی اور اجانب حکومتوں اور ملکوں کے اندر دخل کیوجہ سے غیر زبانوں کے الفاظ کو لینے کیلئے مجبور ہیں۔ اور اس طرح پر رفتہ رفتہ قرآن مجید کی زبان پر ایک اثر پڑ رہا ہے۔ کیا آپ نے اس زبان کو قائم رکھنے اور جاری کرنے کے لئے کبھی خیال کیا ہے؟ یا اس کے اثرات کو سوچا ہے۔ کہ لسان القرآن متروک ہی نہ ہو جائے۔ اور مصر کی آیندہ نسلیں قرآن کے سمجھنے سے قاصر رہجائیں۔

شیخ شام۔ بے شک اجانب کے تعلقات اور کاروبار نے عربی زبان پر ایک اثر ڈالا ہے! اور

مصر کی زبان بالکل نئی ہو رہی ہے مگر اس سے قرآن مجید کی زبان پر کوئی اثر نہ پڑیگا کیونکہ تاج العروس موجود ہے۔

عرفانی۔ مجھے جناب سے یہ سنکر بہت تعجب ہوا کہ قرآن مجید کی زبان سمجھنے کیلئے آیندہ نسلیں تاج العروس کی ۲۰ جلدوں کی محتاج ہونگی۔ مگر مولانا ان کے پڑھنے کے لئے پھر کس لغت سے مدد لی جائے گی۔

شیخ شام۔ قرآن کا حافظ خدا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون۔

عرفانی۔ لیکن حفاظت کے آخر کچھ اسباب اور ذرائع بھی ہوتے ہیں تعلیم قرآنی کی حفاظت کیلئے خدا تعالیٰ امت محمدیہ میں سے راستبازوں کو مبعوث کرتا ہے۔ جو انکی تعلیم کو عملی نمونہ اور خدا تعالیٰ کی تائیدات سے زندہ رکھتے ہیں لیکن جب آپ خود اس خطرۂ لسان کو محسوس کرتے ہیں۔ تو اسکی حفاظت کیلئے کوئی ذریعہ بھی تو بتائیے۔

شیخ نے اس موقعہ پر ایک طالب علم کو اشارہ کیا۔ کہ وہ ایک دوسرے عالم کو جو نابینا بھی تھے۔ بلالائے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور انھوں نے اس سوال کو من وجہ چھوڑکر کہنا شروع کیا۔ کہ مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت ہے۔ تفرقہ نہیں چاہئے۔ میں نے اس کی تائید کی پھر انھوں نے مصری لہجہ میں قرآن مجید سنایا میں نے مصر کے بعض علما کا پتہ پوچھا۔ تو ایک صاحب نے ایک عالم کا نام لیا۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ وہ ان کے ملنے کے قابل نہیں ہیں (مطلب یہ ہے کہ وہ آزاد خیال نہیں ہے)

ترجمہ قرآن کے متعلق بھی ذکر آیا۔ حافظ صاحب نے کہا دوسرے لوگوں کے سمجھانے کیلئے انکی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہئے۔ معلوم ہوا مصر میں دو گروہ ہیں۔ ایک ترجمہ کا مخالف دوسرا مؤید

چونکہ آجکل ازہر میں تعطیل ہے۔ اس لئے میں طریق تعلیم کا معائنہ نہ کرسکا۔ مگر معلوم ہوا کہ ازہر کے امتحانات کے قریب ایک عجیب نقشہ ہوتا ہے۔ امتحان سے کچھ عرصہ پیشتر طلبا رڈاڑھیاں رکھنی شروع کرتے ہیں کیونکہ امتحان میں ڈاڑھی ضروری ہے لیکن امتحان کے بعد حجاموں کی دوکانوں پر ایک تانتا طلبائے ازہر کا لگجاتا ہے جو داڑھیاں منڈوانے کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ ازہر کے طلبار کی آمدنی کا ذریعہ قبروں پر قرآن مجید اور دلائل الخیرات کا پڑھنا بھی ہے۔ اور وہ شوق سے اس غرض کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان کی آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے۔

یکم جولائی کو پہلے میں ایک حمام میں گیا۔ اور ایک روپیہ نو آنے اُجرت غسل کرنے کی دی گذشتہ سفر میں مَیں نے دمشق کے ایک حمام کو دیکھا تھا۔ وہ اس سے بہت بہتر اور اُجرت اس سے نصف کے برابر تھی۔ حمام میں ننگا نہانا یہاں عیب نہیں سمجھا جاتا۔ حمام میں سب ننگے کی ضرب المثل شاید یہاں ہی کے لئے ہے

شیخ ابراہیم حسن الضاری سے ملاقات

شیخ ابراہیم الضاری کا ذکر اس سے پہلے الحکم میں آچکا ہے۔ یہ شیخ ابراہیم حسن مدنی الضاری ہیں۔ ان کے جدّ اعلیٰ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس آئے تھے۔ اور اس وقت سے بیت المقدس کی تولیت ان کے خاندان میں چلی آتی ہے۔ گویا بالفاظ دوسرے الفاظ میں شریف قدس کہنا چاہئے۔ گذشتہ سفر میں سب سے پہلا شخص جو ہم کو کسٹم ہوس سے نکلتے ہی پورٹ سعید میں ملا۔ وہ شیخ ابراہیم حسن تھے۔ اُنہوں نے اپنے اخلاص اور محبت کا ثبوت دیا۔ اور خاص تار بھیجکر بیت المقدس اپنے ایک معزز عزیز کو مامور کیا کہ سیدنا خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ اور آپ کے خدام کے آرام و آسائش میں ہر ممکن مدد دے۔ بلکہ انکی خواہش تھی کہ آپ انہی کے مکان پر اتریں شیخ ابراہیم حسن اپنے اخلاص میں یومًا فیومًا ترقی کر رہا ہے۔ وہ بہت با اخلاق اور ملنسار بزرگ ہیں۔ رؤسائے مصر و شام میں سے ہیں۔ اور مصر و شام کے اعلیٰ طبقہ میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ قیصر جرمنی جب بیت المقدس گیا ہے۔ تو قیصر کو مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف آپ کے والد ماجد کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ شیخ صاحب کے دل میں اسلامی درد ہے۔ اور وہ مسلمانان عالم کے مصائب اور تکالیف کو محسوس کر رہے ہیں۔ ان کا عزم ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کا اس غرض سے سفر کریں۔ کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کریں۔ اور اگر وہ کوئی خدمت اسلام اور مسلمانوں کی کر سکیں۔ تو اس کے لئے دریغ نہ کریں۔

مصر قدیم

میں نے مصر قدیم کے دیکھنے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ اس لئے میں قبل دوپہر اس کے دیکھنے کو گیا۔ راستہ میں جب شارع عینی پر سے گذرا اور وہاں قصر العینی دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ محلہ حضرت عینی شارح بخاری کے نام پر ہے۔ اور قصر العینی وہ مکان ہے کہ جہاں شارح مذکور کا گھر تھا۔ اس گھر کو اور اس کے ملحقہ مکانات کو لیکر اب وہاں ایک ہسپتال بنایا گیا ہے۔ کئی میل کا سفر کرنے کے بعد میں مصر قدیم میں پہنچا۔ صدیوں کی قدامت کا رنگ اس میں اب تک موجود ہے۔ مکانات کے نمونے بتاتے ہیں۔ کہ اس وقت کا تمدن کیا تھا؟

مقیاس الماء سب سے پہلے میں دریائے نیل کے کنارے اس مقیاس الماء کے دیکھنے کو گیا۔ جو صحابہ کے زمانہ سے بنا ہوا ہے۔ یہ ایک برج ہے۔ اور ایسے اصول پر تعمیر کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر مقیاس الماء آجتک ایجاد نہیں ہوا دریائے نیل میں کتنا پانی ہے۔ اس سے اسکا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ ایک قلعہ کا برج ہے۔ اور قلعہ بعد میں کسی ملوک کے قبضہ میں رہا۔ اور اب تک انہی کے پسماندگان میں چلا آتا ہے۔ اس قلعہ میں آم کے درخت بکثرت ہیں۔ اور سب سے زیادہ آمدنی انہیں درختوں کی ہے۔

مصر قدیم میں **مقوقس** کے محل کو میں نے دیکھا۔ اور اسلامی تاریخ کے ساتھ اس کے تعلقات کا ایک صفحہ میری آنکھوں کے سامنے سے اس طرح پر گذر گیا جیسے سینما کی کوئی فلم گذر جاتی ہے۔ وہاں کھنڈرات کے سوائے اب کچھ نہیں قلعہ میں بہت بڑا گرجا ہے۔ اس کے نیچے کا حصہ قدیم ہے۔ دوسری اور تیسری منزل پر لاکھوں روپے کے خرچ سے نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ رومیوں کے قبضہ میں ہے۔ یہ رومی پادری نہایت بد اخلاق اور جاہل ہیں۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ اس گرجا کے متعلق کوئی تاریخی سلسلہ بیان کیجئے کہنے لگا مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔

یہاں کی آبادی قبطی لوگوں کی ہے۔ اور وہ سب کے سب نصرانی ہیں۔ اور آرتھوڈکس یونانی گرجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں بھی متعدد گرجے ہیں جو بہت پرانے بتائے جاتے ہیں۔ وہاں کے پادری بھی زائرین سے خیرات مانگنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور مانگتے ہیں یہی حالت بالکل خانقاہوں کے مجاوروں کی سی ہے۔ علوم دینیہ سے محض ناواقف۔ اور اپنے مذہبی علمی تعلیم سے فارغ۔ سوائے اس کے کہ آنے والے مسافروں کو کچھ تصویریں دکھا دیں۔ اور اس کے بعد گرجے کی خدمت کیلئے روپیہ کا سوال کر دیں اور کچھ نہیں۔ انکی ہمت اور مقصد کا دائرہ اسی ایک امر پر کھنچا گیا ہے۔ ان گرجوں میں **قدامت** کو قائم رکھنے کیلئے شاید صفائی کو بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ایک گرجے کے منبر پر اتنی گرد جمی ہوئی تھی۔ کہ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے لطیفہ کے طور پر کہا۔ کہ

یہ گرد بھی تو قدیم زمانہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے شاید بہت متبرک ہوگی

میرے اس لطیفہ پر پادری صاحب بھی بے اختیار ہنس پڑے اور کہا کہ نہیں یہ تو جدید ہی ہے۔
مصر قدیم کو اس طرح پر دیکھتا ہوا میں ایک اور گرجے میں گیا۔ پادری صاحب سے بھی ملاقات

ہوئی۔ ایک موقعہ پر دیوار پر ایک مرقع تھا جس میں حضرت مریم کی تصویر تھی۔ اور دائیں بائیں فرشتوں کی پردار پریوں کی دو تصویریں تھیں میں نے پادری صاحب سے پوچھا کہ یہ کس کی تصویریں ہیں۔ کہا فرشتوں کی میں نے پوچھا کہ ان تصویروں کا ماخذ کیا ہے۔ کہاں سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی ایسی تصویریں ہوتی ہیں۔ پادری صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلگیا۔ کہ یہ فرضی اور وہمی ہیں۔ اس سلسلہ کلام میں پادری صاحب سے حضرت مسیح علیہ السلام کے یوم پیدائش پر کچھ تبادلہ خیالات ہوا۔

عرفانی۔ جناب کو معلوم ہے کہ عیسائی عام طور پر ۲۵۔ دسمبر کو حضرت مسیح علیہ السلام کی عید میلاد مناتے ہیں۔ اسکا تاریخی ثبوت کیا ہے؟

پادری۔ ہم ۷ جنوری کو مناتے ہیں۔

عرفانی بہت خوب معلوم ہوا اس میں اختلاف ہے۔ خیر کچھ ہرج نہیں۔ ۷ جنوری ہی سہی۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟

پادری۔ کیا آپ نے نیا عہد نامہ پڑھا ہے؟

عرفانی۔ ایک زمانہ گذرا۔ جب میں نے پڑھا تھا۔

پادری۔ نئے عہد نامہ سے پتہ لگتا ہے۔

عرفانی۔ کس مقام پر ہے۔ مجھے تو ہمیشہ تعجب ہوا کہ حضرت مسیح کا نسب نامہ دیا گیا۔ یوسف کے ساتھ منگنی کا۔ روح القدس سے حاملہ ہونے کا۔ پیدائش کا معرکہ بھاگنے۔ غرض اس قسم کے واقعات کا تو ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی حواری نہیں بتاتا۔ کہ آپ پیدا کس تاریخ ہوئے؟

پادری صاحب کو کچھ گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ اور انہوں نے کہا کہ میں رئیس الکنیسہ کو بلاتا ہوں میں نے کہا بہتر ہے۔ انکی زیارت ہو جائیگی۔

ایک خادم گیا۔ اور خبر لایا کہ نہیں ہیں۔ مگر جب ہم گرجے سے نکل رہے تھے۔ تو وہ دروازے پر مل گئے۔ اور بڑے اخلاق اور مہربانی سے اُنہوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔ اور پادری صاحب نے ان سے میرا سوال دوہرایا۔

رئیس الکنیسہ۔ صحیح تاریخ کا تو پتہ نہیں ہے۔ مگر اسکا کوئی اثر اصل مذہب پر نہیں ہے۔

عرفانی۔ میرے خیال میں تو اسکا بہت بُرا اثر ہے۔ کیونکہ ایک شخص کہہ سکتا ہے۔ کہ جو دُو بات

اس عید میلاد پر کیجاتی ہیں۔ بعینہ یہ شراب کے دیوتا بیکس کی پیدائش کے دن کیجاتی تھیں۔ اور اس کی پیدائش کا یہی موقعہ قرار دیا گیا ہے۔ یونانی علم الاید صنام اس کی حقیقت بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ انکی ہی پرستش ہے۔ صرف نام بدلدیا۔ اور یہ فرضی داستان ہے۔ اس موضوع پر مختلف باتیں ہوئیں۔ آخر رئیس الکنیسہ نے کہا کہ کچھ بعید نہیں کہ یہ خیالات وہاں سے آئے ہوں
اس کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہو کر جامع عمرو ابن العاص کو دیکھنے گئے۔

جامع عمرو بن العاص

یہ جامع جہاں ایک زمانہ میں صحابہ کی پیشانیاں رب العالمین کے حضور عبادت کیلئے جھکتی تھیں۔ آجکل نہایت ویران حالت میں ہے۔ اور اس میں نماز بھی باقاعدہ نہیں ہوتی۔ بلکہ مسجد کے باہر ایک اور مسجد اس غرض کیلئے بنائی گئی ہے۔ جامع کے ایک گوشہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مزار ہے میں نے اس مزار پر کھڑے ہو کر دعا کی اور حضرت فضل عمر کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت میں اس مسجد کی آبادی اور مصر پر احمدیت کی روحانیت کے انتشار اور صحابہ مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ فتح باب کیلئے رب کریم کے حضور التجائیں کیں میں محسوس کر رہا تھا کہ روح پر ایک مسرت آمیز اثر پڑ رہا ہے۔

مسجد کے صحن میں فرش بالکل نہیں رہا۔ اب صرف ریت ہے اور وہ جگہ ہے۔ جہاں افضل الانبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار صحابہؓ کے سر سجدات شکر بجا لاتے تھے آہ! آج اس جگہ لوگ جوتیاں لئے پھرتے ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک کنواں وضو کے لئے بنایا گیا ہے جو بہت گہرا ہے۔ ستارہ کیطرح پانی نظر آتا ہے۔ اور سب پتھر کا ہے۔ کوئی دو فیٹ سے کم قطر کا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وضو خانہ تھا۔ غرض یہ مسجد ہر طرح سے شکستہ حالت میں پڑی ہوئی مصریوں اور حکومت مصر کی ایمانی حالت پر نوحہ کناں ہے۔

اس مسجد کے قریب ہی پرانے گرجوں کو قائم رکھنے کے لئے لاکھوں روپیہ مسیحی لوگ خرچ کرکے ان یادگاروں کو زندہ کر رہے ہیں۔ اور یہ مسجد مسلمانوں کے فقدان ایمان پر ماتم کر رہی ہے میرے خیال میں اگر مصر کے قہوہ خانوں۔ تھیٹروں اور دوسرے ملاعب اور شراب خانوں کی ایکدن کے اخراجات سلماً دیدیں تو اس مسجد کی مرمت نہایت عمدگی سے ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی نے چلتے وقت کہا۔ کہ مصری گورنمنٹ نے اسکی مرمت کا ارادہ کیا ہے۔ کاش یہ بات سچ ہو۔ اور اس مسجد کو زمانہ کے

ہاتھوں سے بچایا جائے۔

شہر میں اور بھی بہت سی مسجدیں مقفل پڑی ہوئی ہیں۔ اور دن بدن گر رہی ہیں۔ مصر جدید کو جاتے ہوئے میں نے ایک مسجد کو دیکھا جس کو گرا کر وہاں ایک نہایت خوبصورت پارک بنا دیا گیا ہے ہندوستان میں کانپور کی مسجد کے غسل خانے گرائے جانے پر وہ طوفان بے تمیزی پیدا ہوا تھا۔ کہ اسکی یاد سے بھی طبیعت پر ایک صدمہ ہوتا ہے لیکن یہاں مصر میں مساجد کی حالت کو دیکھ رونا آتا ہے۔ شاید کانپور کی مسجد کے غسلخانے پر شور مچانے والے اگر مصر آجاویں۔ تو اس حالت کو دیکھ کر خودکشی کرلیں۔

مصر کی عید

میں جب مصر قدیم کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اور پھر واپس آرہا تھا۔ تو بیسیوں چھکڑے عورتوں سے بھرے ہوئے دیکھے جو کھجور کی ٹہنیاں لیکر جا رہی تھیں۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عورتیں قبرستان کو جا رہی ہیں۔ اور آج رات وہاں گذاریں گی۔ اور بعض دو تین دن میں بھی واپس آتی ہیں۔ گویا ان کی عید قبرستان میں ہوتی ہے میں نے ایک مسلمان سے اس علم کے بعد پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ وہ اس وقت تک میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آرہا تھا۔ اور مجھے ایک اجنبی مسلمان سمجھ کر ہمدردی کر رہا تھا۔ جب میں نے سوال کیا۔ تو اس کا رنگ بدل گیا اور اسے میرے اسلام پر شبہ پیدا ہوا۔ اور اس نے کہا کہ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ جب میرا جواب اس نے سنا کہ میں مسلمان ہوں۔ تو اس کا تعجب بڑھ گیا۔ کہ گویا میں اسلام سے اس قدر ناواقف ہوں۔ کہ نہیں جانتا عید کے دن قبرستان میں جا کر رہنا ضروری ہے۔

خیر میں یہ معلوم کرکے حیرت میں تھا۔ کہ یہ کیا بیہودہ رسم ہے اور اسے اس پر تعجب تھا۔ کہ میں اسلام کے اس رکن سے ناواقف ہوں۔ آخر شام کو میں قبرستان میں پہنچا۔ قبرستان کیا ہے اچھے خاصے محل ہیں۔ جہاں یہ قافلے جا کر اترتے ہیں، ہر خاندان کا اپنی حیثیت کے لحاظ سے قبرستان بنا ہوا ہے۔ اور نہایت عالی شان عمارتیں ہیں۔ جہاں یہ لوگ جا کر من مانی موجیں کرتے ہیں۔ یہ ہے حالت اسلام۔ فلیبک علی الاسلام من کان باکیاً (جو رونا چاہے وہ حالت اسلام پر نوحہ زن ہو) ان مقابر پر ان قصور کے اندر جو کچھ ہوتا ہے بہتر ہے کہ اسکا ذکر نہ کیا جائے خدا جانے ان روحوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ جن کے جوار میں بڑے بڑے افعال شنیعہ کا ارتکاب ہوتا ہے

مصری اخلاق کا معیار

اشتہارات کسی قوم کے اخلاق کا بہترین معیار ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر شراب کے اشتہارات کثرت سے ہوں تو ہمیں کہنا پڑے گا۔ کہ شراب کی مانگ بہت ہے ایسا ہی مختلف قسم کی دکانیں بھی ملک کی ضروریات کا اندازہ بتا دیتی ہیں۔ مصری زندگی کا بہترین اندازہ یہاں کے قہوہ خانوں سے ہوتا ہے۔ یہ قہوہ خانے مصری اخلاق فاضلہ کو دن بدن گرا رہے ہیں۔ اور مصریوں میں سستی کاہلی خود پسندی مفت خوری اور بیسیوں قسم کے عیوب پیدا کرتے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ان قہوہ خانوں نے مصر کے اخلاق کو سخت دھکا لگایا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان گرے ہوئے اخلاق کا ذکر کروں۔ جو یہاں پائے جاتے ہیں۔ اور بدکاری کس سرعت اور زور سے پھیل رہی ہے محکمہ قضا شرعی میں جاکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورتوں کی کیا حالت ہے۔ اس کیفیت نے انگلستان کیطرح عورتوں سے نفور مرد اور مردوں سے نفور عورتوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے۔

تکیہ ہنود

شام کو میں تکیہ ہنود کے دیکھنے کو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ جسمیں تین حجرے ہیں۔ اور ایک چھوٹی سی مسجد اس کے ساتھ اندر ہی واقعہ ہے جس میں ایک فوارہ بھی ہے۔ مصر کے اوقاف کی بہت بڑی آمدنی ہے۔ اور ان اوقاف میں بہت سے مکانات اور مساجد ہیں میں نے دیکھا کہ اکثر بڑے بڑے عظیم الشان مکان جو وقف ہیں کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور کثیر التعداد مسجدیں غیر آباد ہیں۔ یہ تکیہ بھی اپنی ظاہری حالت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی بدقسمتی کا ایک عجیب نظارہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ مصری حکومت قابل شکرگذاری ہے۔ جس نے تیرہ خاک ہند کے آوارہ وطنوں کیلئے اپنے ملک میں کم از کم سر کہنے کے لئے جگہ دیدی ہے۔ اس تکیے کا شیخ ایک امرتسری کشمیری ہے میں جسوقت وہاں گیا شیخ تو موجود نہ تھا۔ ایک مسافر جو وہاں ہی رہتا ہے۔ اپنی شکستہ حالی کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ اور

صورت ببیں حالش مپرس

کا مصداق تھا۔ اس تکیہ میں رہنے والوں کو رمضان میں فی کس ایک پونڈ مصری ملتا ہے۔ اور محکمہ اوقاف کے کارکن خود آکر تقسیم کرتے ہیں۔

اس سے پہلے یہ طریق تھا کہ ساکنین تکیہ کو روٹیاں آٹا اور گوشت کیلئے بکرے تقسیم ہوا کرتے تھے

مگر چونکہ ناظمان تکیہ اُنکی تقسیم وغیرہ میں محتاط ثابت نہ ہوئے اس لئے مصری محکمہ اوقاف نے اجناس کی تقسیم سوقوف کرکے نقدی کردی۔ اور وہ بھی کارکنان صیغہ اوقاف کے ذریعہ مسجد بالکل غیر آباد ہے۔ اور مصر کی اکثر مساجد کیطرح وہاں نماز کبھی کبھار پڑھی جاتی ہوگی۔

جو ہندی یہاں رہتے ہیں اُنہوں نے ممالک غیر میں جانے سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھایا۔ نہ علم سیکھا اور نہ کوئی فن۔ البتہ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ اس نے قریباً تمام ملک کا سفر کیا ہے۔ وہ کاغذوں کے پھول وغیرہ بناتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے ہی اپنی روزی اور ضروریات سفر مہیا کرتا ہے۔ اسنے اپنے واقعات میں بتایا۔ کہ جب میں سفر کرتا ہوں۔ تو اس قسم کی چیزوں کی قیمت میں روپیہ وصول نہیں کرتا بلکہ دیہات میں انڈے۔ مرغی۔ گھی۔ آٹا وغیرہ اور جہاں کرایہ کیضرورت ہو وہاں کچھ نقدی لے لیتا ہوں اور اس وجہ سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہوں۔ یہ شخص بہت نیک اور شریف مزاج تھا۔ میں نے اسے احمدیت کے متعلق کھول کر تبلیغ کی۔ اور جب میں انگلستان پہنچگیا تو عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ

وہ احمدی ہوگیا

میرے خیال میں تھا کہ اگر یہ شخص احمدی ہوجائے تو اسے کردستان وغیرہ علاقوں میں تبلیغ کے لئے بھیجا جائے۔ غرض تکیہ ہنود کی حالت کسی حالت میں ہندوستانی تکیہ سے بہتر نہ تھی۔ البتہ اتنا فرق تھا۔ کہ مصر کے تکیہ میں

بھنگ اور چرس کے دم نہ لگتے تھے

مصر جدید

رات کو میں مصر جدید دیکھنے کے لئے گیا۔ یہاں لوگ اسے Helis Polis کہتے ہیں۔ قاہرہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا رقبہ بلجیم کی ایک کمپنی نے اجارہ پر لیا ہے۔ اور یورپین طرز کے نہایت عالی شان مکان اور عیش منزل ہوٹل۔ تفریح گاہیں۔ سینما۔ تھیٹر وغیرہ بنائے ہیں۔ یہاں کا ہوٹل بہت ہی عظیم الشان ہے۔ ایام جنگ میں وہ نہایت آباد تھا لیکن اب اسمیں اس کثرت سے مسافر نہیں آتے۔ تاہم وہ اسی شان و شوکت سے رکھا گیا ہے۔ سڑکیں نہایت کشادہ ہیں۔ قاہرہ سے اسے ٹرام کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مصری رؤسا اور امراء اپنے شاندار مکانوں کو چھوڑ کر مصر جدید میں آکر

مکانات کرایہ پر لے کر رہتے ہیں۔ اور اپنے روپے کو اس قسم کی فضولیوں میں اڑاتے ہیں۔ خصوصاً جن ایام میں امریکن اور یوروپی سیاح مصر آتے ہیں۔ ان ایام میں تو مصری رؤسا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ہوٹلوں میں جاکر لطف زندگی نہ اٹھائیں۔ مسلمانوں کی اس قسم کی فضول خرچیوں کو دیکھ کر دل کباب ہوتا ہے۔ کہ وہ اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام اور رفاہِ عام کے کاموں میں روپیہ خرچ کرنے سے مضائقہ کرتے ہیں۔ اور اس قسم کی لغویات میں لیرہیں۔

غرض مصر جدید کی شان و شوکت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے گرچہ ابھی تک پورے طور پر یہ بارونق نہیں ہے لیکن دن بدن اس کی آبادی بڑہتی جاتی ہے۔ یہاں ایک تفریح گاہ یورپین طریق پر بھی بنایا گیا ہے جسمیں مختلف قسم کے تماشے اور دل لگی کے سامان ہیں کشتی رانی اور پہاڑی ریلوے کے نمونے عجیب دلکش ہیں مگر سب سے زیادہ یہاں جو امر رکھا گیا ہے۔ وہ قمار بازی کا ولایتی شوق ہے میں چونکہ تفصیل سے دوسرے موقعہ پر ان امور کا ذکر کروں گا۔ اس لئے یہاں صرف اتنا ہی اشارہ کر جاتا ہوں کہ اس تفرج گاہ کا اخلاقی نتیجہ اہل مصر کے حق میں مضر ثابت ہونے والا ہے۔ عورتوں اور مردوں کا ایک حد تک آزادانہ خلا ملا قابل افسوس ہے۔ مصر جدید گویا مصر میں ولایتی طریق زندگی کو عام پسند بنانے کے لئے آباد کیا گیا ہے۔ اور لوگوں میں اس اثر کو قبول کرنے کے لئے رجحان پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑے چوک میں ایک عالی شان گرجا تعمیر کیا گیا ہے۔ اور باوجود عیسائیت سے کوئی دلچسپی نہ ہونے کے پھر بھی گرجے کا بنانا بتاتا ہے

کہ یوروپ اپنے مذہب کی نمائش میں کسقدر آگے ہے

مصری حمام

غسل کیلئے میں مصری حمام میں گیا۔ اور میرا خیال تھا کہ انتظام بہت اچھا اور معقول ہوگا میرے مکرم دوست شیخ شہزادی صاحب میرے ساتھ تھے میں نے سال گذشتہ کے سفر میں دمشق (شام) کے ایک حمام میں جاکر غسل کیا تھا۔ شامی حمام مصری حمام سے بہت بہتر اور مکلّف معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے میں یہاں کے ایک معمولی حمام میں گیا ہوں۔

حمام کے اندر داخل ہونے سے پیشتر دروازہ کے ایک طرف ایک کمرہ ہوتا ہے۔ جہاں کپڑے اتارے جاتے ہیں۔ کپڑے اتار کر ایک تولئے میں باندھ کر رکھ دئے جاتے ہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ یا چوری کا اندیشہ نہیں۔ اس کمرے کے ساتھ ہی اندر ایک اور کمرہ تھا۔ جہاں لوگ غسل کرکے آکر سستاتے ہیں۔ اور بیٹھتے ہیں بعضے لیٹ بھی جاتے ہیں۔

کپڑے اُتارنے کے بعد غسل کرنے والے کو تہ بند وغیرہ بند ہوا کر لکڑی کی کھڑاویں دیدی جاتی ہیں۔ اور بازو سے پکڑ کر ایک شخص اندر لیجاتا ہے۔ غسل خانہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور کمرہ ہوتا ہے جہاں بعض لوگ اصلاح بنواتے ہیں۔ پھر اندر جاکر ایک عام غسلخانہ ہے۔ جو گنبد دار مکان ہوتا ہے۔ اور اسکا فرش نہایت عمدہ سنگ مرمر کا ہوتا ہے۔ یہاں مختلف غسل خانے ہیں۔ جنمیں سرد اور گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے حوض بھی ہیں۔ اور مسی طشتریوں سے پانی لیکر غسل کرلو۔

لوگ عام طور پر آپ ہی نہا لیتے ہیں لیکن کیسہ بھی کرتے ہیں۔ میں نے تو آپ ہی غسل کرنا پسند کیا غسل کر چکنے کے بعد تولیوں سے بدن پونچھ لیا جاتا ہے۔ اور متعدد تولیے اس مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور جب پھر غسل کرکے اس کمرہ میں آتے ہیں جہاں کپڑے اُتارے تھے۔ تو پھر تولئے بدل دئے جاتے ہیں غرض تولیے بہت استعمال ہوتے ہیں۔ اب اگر چاہو جیسا کہ یہ عام قاعدہ یا دستور ہے۔ تو کچھ دیر یہاں لیٹے رہو یا بیٹھے رہو۔ مگر میں نے اپنے معمول کے مطابق غسل کیا اور کپڑے پہن لئے۔ اور اُجرت دیکر رخصت ہوا۔ حماموں میں بعض ایام مخصوص عورتوں کیلئے ہیں۔ اس روز مرد وہاں نہیں جاتے۔

عید کی نماز

عید کی نماز کیلئے شیخ محمود احمد صاحب کے مکان ہی میں انتظام کیا تھا۔ احمدی احباب کے علاوہ ایک غیر احمدی صاحب بھی موجود تھے۔

مصر میں عید کی نماز طلوع آفتاب کے معاً بعد ۶ اور ۷ کے درمیان ہو جاتی ہے۔ اور عام طور پر لوگ اپنی اپنی مساجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ نماز کیلئے کوئی خاص اہتمام اور جوش نہیں پایا جاتا۔

جامع عمرو بن عاص میں عید کی عام نماز بھی ہوتی ہے جس میں بادشاہ اور دوسرے ارکان دولت اور بڑے لوگ بھی جاتے ہیں۔ میں اس نماز کو دیکھنے جاتا مگر میرے لئے یہ مشکل تھی کہ نماز پڑھ کر وہاں جانے تک موقعہ نہ رہتا۔

قربانی کیلئے لوگ زیادہ تر قبرستانوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں قربانیاں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے عید کا عام نظارہ قبرستانوں میں دیکھنا چاہئے۔ تین دن تک **تکبیروں** کا اعلان ہر نماز سے پہلے ۲۱ توپ سے ہوتا ہے۔ میں چونکہ مصر میں عید کا عام منظر نہیں دیکھ سکا۔ اس لئے یہاں بیان نہیں کرتا البتہ سماعی طور پر اپنے معلومات کا اظہار ممکن ہوا تو اس جلد میں کروں گا۔ جو بلاد اسلامیہ کیلئے مخصوص ہو یوں تو عام طور پر لوگ لہو ولعب میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اخلاقی معیار روز بروز گرتا جاتا ہے

مگر یوم العید تو آخر عید ہی کا دن سمجھا گیا ہے۔ مسلمانوں نے بدقسمتی سے اس مبارک دن کو جو گناہ

جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

کا مصداق ٹھہرا رکھا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خطبہ عید عید کی نماز میں نے ہی پڑھائی۔ اور ایک مختصر سا خطبۂ عید دیا۔ جس کو میرے بعد میرے عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب نے مرتجلاً عربی زبان میں بیان کیا۔ میں اس کی روانی کو سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا۔ کہ

چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

میں نے سورہ کوثر کی تلاوت کی اور اس میں بتایا۔ کہ

یہ سورۃ مکی ہے۔ اور مکی سورتوں کے موافق اس میں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت اور قرآن مجید کی حقانیت کے دلائل عظیم الشان پیشگوئیوں کے طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی ایام ابتلا تھے۔ اور وہ تکالیف اور مشکلات کا عہد تھا۔ ہر طرح سے آپ کو اور آپ کے خدام کو دکھ دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں خدا تعالیٰ سے وحی پاکر آپ نے اعلان فرمایا۔ کہ میرا خدا مجھے فرماتا ہے۔ اِنّا اعطینک الکوثر۔ بے شک ہم نے تجھ کو کوثر عطا کیا ہے۔ ایک ناداں واقعات سے ناواقف اور خدا تعالیٰ کے وعدوں سے بیخبر انسان مکی حالت کو دیکھتے ہوئے اور حضور کے اس اعلان کو سنکر کہہ سکتا تھا کہ حالت تو مصیبت و مشکلات کی ہے۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ کوثر ملا ہے لیکن واقعات کے رنگ میں دیکھو کہ کیا فی الحقیقت کوثر عطا نہیں ہوا؟۔ ایسا کوثر کہ آج بھی دہریہ اور امپیریلیسٹ پر حجت ہے۔

آپ کی رسالت کا دامن زمانہ کے لحاظ سے دیکھو تو قیامت تک وسیع ہے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں جو شریعت لیکر آئے۔ یا آپ کے فیض اور اتباع کے بغیر اس دولت کو پاسکے۔ جب تک خاتم النبیین کی مہر اس پر نہ ہو۔ یہ دروازہ ہی بند ہے۔

اور پھر دعوت عامہ کے لحاظ سے آپ کی نبوت ایسی عالمگیر۔ کہ

انی رسول اللہ الیکم جمیعًا

اور "وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین" آپ کی نبوت کا دائرہ نسل انسانی پر کھینچا گیا ہے۔ اور جس طرح پر

رب العالمین کی ربوبیّت عامہ ہے۔ اسی طرح رب العالمین کا رسولِ رحمتہ اللعالمین ہے

کتاب جو آپ کو عطا کیگئی اسکی شان یہ کہ فیہا کتبٌ قیمہ. کل دنیا کی صداقتیں اور مضبوط کتابیں سب کی سب قرآن مجید میں محفوظ اور موجود ہیں۔

پھر اس کتاب کی حفاظت کیلئے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کہکر دائمی اور ابدی وعدہ حفاظت کا کر دیا۔ اور آج ساڑھے تیرہ صدیاں گذرنے پر بھی وہ ویسا ہی تازہ ہے حفاظت کی لئے متعدد اسباب اور ذرائع کے سوا ایک ایسا مضبوط ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنا دیا۔ کہ ہر صدی پر ایک **مجدد** اسلام مبعوث ہوتا ہے۔ اور اسی امت میں **مسیح موعود** علیہ السلام چودھویں صدی کا مجدد اعظم اور مہدی ہو کر آیا۔

پھر مدنی زندگی میں جو اکثر حضور اور آپ کے صحابہ کو ملا وہ بھی دنیا نے دیکھا۔ اور آج بھی تاریخ اسپر شہادت دیتی ہے۔ یہ مصر کی سرزمین جہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی۔ فرعون انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور مصری اس کے پرستار تھے لیکن **لوائے اسلام** یہاں بھی بلند ہوا۔ اور وہ تمام بت اور ان کے پوجاری بت شکن ہو کر آج **اللہ اکبر** کی صدا بلند کرتے ہیں۔

عطائے کوثر پر انسان کے دو کام ہوتے ہیں تعظیم الامر اللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ۔ خلق اللہ پر شفقت کے لئے قربانی ایک ضروری چیز ہے۔

اور یہ یوم العید اسی قربانی کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان قربانی کو کون نہیں جانتا میں اسکی تفصیلات کو بیان نہیں کرسکتا۔ نہ وقت اجازت دیتا ہے۔ اور نہ صراحت و تفصیل کیلئے کافی الفاظ۔

ابراہیم علیہ السلام نے خیالات اپنے رشتہ داران اور عزیزوں کی قربانی سے ابتدا کی اور بالآخر اپنی مالوف محبوب چیز اولاد نرینہ تک کو قربان کرنے کیلئے طیار ہو گیا۔ اس میں سبق ہے کہ جب تک انسان اپنی سب سے پیاری چیز کو خدا کی راہ میں دینے کیلئے تیار نہیں ہو جاتا۔ وہ اس کوثر کا وارث نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک اور آپ کا وجود باجود

ایک عظیم الشان کوثر ہی

اور یہ کوثر دنیا کو ابراہیمی قربانی کے ثمرہ اور نتیجہ میں ملا پس جب تک ہم کامل طور پر آنحضرت

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں گم نہیں ہوجاتے۔ اور آپ کے رنگ میں کامل رنگین ہونے کی سعی نہیں کرتے۔ اسوقت تک وہ فیض نہیں پاسکتا۔ اسی لئے آپ **ساقی کوثر** کہلاتے ہیں جیسے جب تک کوئی نل بڑے نل سے نہ لگا ہوا ہو۔ خواہ وہ کیسا ہی عمدہ اور مضبوط ہو۔ اس میں پانی نہیں آسکتا۔ اسی طرح جب تک ہم اس مقام اطاعت پر کھڑے نہیں ہوتے۔ ہم اس کوثر سے دور رہتے ہیں۔

دنیا کا سارا کارخانہ قربانیوں کا سبق دیتا ہے۔ اور کیجن ہمارے لئے قربان ہو رہی ہے عناصر پر غور کرو۔ کہ وہ کس طرح دوسروں کیلئے مایہ حیات بننے کے لئے اپنی قربانی کرتے ہیں پس جب تک ہم ایثار اور قربانی کی یہ روح اپنے اندر پیدا نہ کریں۔

ہم خود زندہ اور دوسروں کی زندگی کا باعث نہیں ہو سکتے

اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بروز کامل حضرت مسیح موعود کو نازل کرکے قربانی کی حقیقت اور کوثر کا لطف ہمارے سامنے رکھدیا ہے۔ یہ آیات حضرت مسیح علیہ السلام پر وحی ہوئی تھیں۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ برکات اور ثمرات اب دوبارہ ملنے والے ہیں لیکن انکے پانے کے لئے ہم کو بہت بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم انکو ادا نہیں کرتے ان ثمرات کو پا نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک موقعہ پر فرمایا ہے۔

"اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ چاہتا ہے۔ اور وہ کیا ہمارا اسی راہ میں مرنا"

جبتک اس موت کو ہم خوشی سے اختیار نہیں کرتے ہم زندہ نہیں ہوسکتے۔ اسلام تو زندہ ہے۔ اور وہ زندہ خدا کا مذہب ہے۔ اسلام کی زندگی سے ہماری ذاتی زندگی وابستہ ہے۔ اور وہ قربانیاں کبھی تو خیالات کی قربانیاں ہیں کبھی ملکی اور قومی رسم ورواج اور تعلقات کی قربانی ہوگی۔ کبھی اسکا اثر ہمارے اموال پر پڑے گا۔ اور کبھی نشر و اشاعت حق کے لئے ہم کو اپنا وقت جو زندگی کا ایک قیمتی جزو ہے۔ قربان کرنا پڑے گا۔ جب تک یہ حقیقت ہم اپنے اندر پیدا نہ کریں حقیقت میں ہم زندہ نہیں مردہ ہیں۔ اور اپنے نفس کی قبروں میں دبے پڑے ہیں پس سنو کہ مسیح موعود بشارت دیتا ہے کہ

وہ جو قبروں میں دبے پڑے ہیں اٹھ کھڑے ہوں

یہی سچی نفس سے زندہ ہونے والے مردے ہیں۔ انکی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہنچ چکی ہے

ہیں جو تم میں بوتا ہوں۔ اسی کے نفس سے زندہ ہوا۔ او آپ منہ بولی شہادت ہوں۔ تم جو یہاں بیٹھے ہوا کو زندگی بخش جام کا ثبوت ہو۔ جن کو خدا تعالیٰ نے توفیق دی۔

اے عزیزو اور بھائیو! یہی راہ ہے۔ خدا کو پانے کی۔ اور یہی وہ زندگی بخش جام ہے۔ جو اس کوثر سے لبریز ہے۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ اور جسے پھر مسیح موعود لیکر آیا ہے۔ جو اس کوثر سے پیئیگا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ اور اس پر موت کا ہاتھ قابو نہ پاسکیگا۔ اس کو پی کر انسان کی وہ حالت ہوتی ہے کہ وہ پکار اُٹھتا ہے۔

ان صلوٰتی ونسکی ومحیایٔ ومماتی للہ رب العالمین

اس کے ہر کام میں خدا کی رضا مقصود ہوتی ہے۔ وہ اسی مقصود کیلئے جیتا ہے۔ اور پھر اس کی ہمدردی اتنی وسیع ہو جاتی ہے۔ کہ وہ تنہا نہیں رہتا۔ بلکہ کل کائنات کو اپنا وجود سمجھتا ہے۔ اور جس طرح اپنے نفس سے ہمدردی کرتا ہے۔ اور اسکی غور و پرداخت کرتا ہے۔ اسی طرح پر وہ کل مخلوق سے اس لئے کہ وہ اسے غیر نہیں سمجھتا۔ پس انسانی ہمدردی کیلئے اپنے اندر وسعت پیدا کرو۔ اخوت اور خلت کا مقام دوسرا ہے۔ وہ مومنین سے مخصوص ہے لیکن اگر چاہتے ہو کہ رب العالمین کی تجلیات سے حصّہ لو۔ اور اس کے پرتو کے نیچے آکر فیض پاؤ۔ تو اس نکتہ کو یاد رکھ لو۔ اپنے اندر وہی وسعت پیدا کرلو۔ جو رب العالمین کا لفظ چاہتا ہے۔ جبتک اتنی وسعت نہ ہوگی۔ رب العالمین کی صفت کے تم مظہر نہیں ہوسکتے۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے قربانی کی۔ وہی قربانی جسکی یاد آج کا دن دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپکو توفیق دے۔ کہ ہم اس مقصد عظیم کو حاصل کرسکیں۔ آمین!

ماسٹر فتح محمد صاحب کی دعوت

نماز عید کے بعد احباب کو رخصت کیا۔ اور میں عزیز مکرّم شیخ محمود احمد صاحب کے ہمراہ ماسٹر فتح محمد صاحب ٹیلر ماسٹر کے ہاں مصر جدید میں کھانا کھانے کے لئے گیا۔ یہ صاحب پنجابی ہیں۔ اور عرصہ سے مصر میں خیاطی کا کام کرتے ہیں احمدی تو نہیں لیکن اسلامی ہمدردی اور احمدیوں کے اسلامی خدمات کیلئے ان کے دل میں محبت اور اخلاص رکھتے ہیں شیخ محمود احمد صاحب نے مصر جا کر ہندوستانیوں کے اتحاد اور ان کے وقار کو قائم رکھنے کیلئے جو کوششیں کیں انکی وجہ سے وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ جب انکو معلوم ہوا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ تو انہوں نے اخلاص سے دعوت کی اور میں نے قبول دعوت کی سنت پر عمل کیا۔ فتح محمد صاحب نے مصر ہی میں شادی کرلی ہے اور

فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بھی بہت سے درزی یہاں کام کرتے ہیں۔ اور سب کے سب آسودہ حال ہیں میرے خیال میں ہندوستان کے اس قسم کے پیشہ وروں کیلئے مصر میں بہت اچھا موقعہ ہے پیر ہے ولایت سے مشاہدات عرفانی کی جو اقساط الفضل میں شائع کرائی ہیں۔ ان میں سے کسی میں میں نے لکھا تھا کہ اگر ہندوستانی درزی یا حجام یہاں آجاویں بشرطیکہ وہ اپنے فن میں ہوشیار اور ماہر ہوں۔ اور انگریزی زبان بھی کسیقدر جانتے ہوں۔ تو ان کے لئے اچھا میدان ہے۔ اسی طرح مصر میں بھی ہندوستانی درزیوں اور حجاموں کیلئے میری رائے میں اچھا موقعہ ہے لیکن مشکل اور مصیبت یہ ہے۔ کہ ہندوستانی جہاں جاتے ہیں وہ آپس میں اتحاد نہ رکھ سکنے کے باعث ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کے اونے سیار کے باعث لوگوں کی نظروں میں حقیر بنجاتے ہیں۔ ورنہ انہیں ایسی قابلیت اور جفاکشی ہے کہ وہ

ہر جگہ کامیاب ہو سکتے ہیں ؎

میں ہندوستانی پیشہ وروں اور عموماً مسلمان پیشہ وروں اور خصوصاً احمدی درزیوں اور حجاموں اور تر کھانوں کو مشورہ دوں گا۔ کہ وہ مصر جائیں اور کام کریں۔ اس سے ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں میں تعلقات اخوت و یگانگت پیدا ہوں گے۔ اور وہ اپنے کاروبار کے لئے ایک عمدہ موقعہ اور میدان پاسکیں گے۔ مگر میں پھر کہوں گا۔ کہ اس غرض کیلئے نکلنے والوں میں جفاکش محنتی دیانت دار اور بلند حوصلہ نوجوان ہوں۔ اور ان میں

دینداری کی رُوح ہو

دعوت مصری طرز کی تھی۔ اور محبت واخلاص کے جذبات کا ایک وسیع دسترخوان تھا۔ ماسٹر فتح محمد صاحب کا کنبہ نہایت بشاش اور مسرور تھا۔ اور میری دعوت کو ایک خاندانی خوشی کی تقریب سمجھتا تھا۔ دعوت پُر تکلف تھی۔ سب سے زیادہ جو چیز مجھے مسرور کر رہی تھی۔ وہ ان کا اخلاق اور محبت و اخوت اسلامی کا جذبہ تھا میں کئی ہزار میل پر بھی اپنے پنجابی بھائیوں کے زمرہ میں

پنجاب ہی کی سرزمین سمجھتا تھا ؎

چونکہ مجھے کل اسکندریہ سے جانے والے جہاز پر سوار ہو جانا ہے۔ اس لئے آج میں اپنے وقت کو پوری کفایت اور پابندی سے خرچ کر رہا ہوں میں نے روانہ ہونے سے پہلے شیخ ابراہیم انصاری کو ایکبار اور ملنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ میری غیر حاضری میں میری فرودگاہ پر

ملاقات کیلئے آئے تھے۔ اور میں موجود نہ تھا۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ ان سے ملوں۔ پس وہاں سے رخصت ہوکر میں اور عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب ان کے مکان پر گئے۔ انصاری صاحب بہت اخلاق اور محبت سے ملے۔ اور انہوں نے چار کیلئے مجبور کیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر میں نے پسند کیا۔ کہ خلیج مصری کے راستہ سے جاؤں۔ اور یاد محبوب کو تازہ کروں۔

خلیج مصری میں یاد محبوب

حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے ہمراہ گذشتہ سال جب میں مصر آیا تھا۔ اور حضرت نے اپنے کرم بیجد۔ اور غریب نوازی کے صدقے عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کے مکان پر اترنا پسند فرمایا تھا۔ باوجودیکہ مصر کے بڑے بڑے ہوٹل میں حضور ٹھہر سکتے تھے۔ مگر یہ خادم نوازی کا ایک شاندار مظاہرہ تھا۔ کہ حضرت نے باوجود تنگی مکان کے وہیں اترنا پسند فرمایا۔ یہ مکان خلیج مصری میں واقع ہے۔ میں نے اس کوچہ سے مصر میں آکر گذرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ہم دونوں باپ بیٹا خلیج مصری میں ہوتے ہوئے اپنے مکان واقع شارع محمد علی صاحب میں آپہنچے۔ تاکہ اسکندریہ کیلئے روانہ ہوں۔ چنانچہ رخت سفر جو پہلے سے تیار تھا۔ حمال کے ذریعہ موٹر پر پہونچایا۔ اور ہم سٹیشن کو روانہ ہوئے۔ قبل اس کے کہ میں اسکندریہ کے راستہ کے متعلق کچھ لکھوں۔ میں خلیج مصری کا ذکر کئے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔ اور اس کے متعلق میں اسی بیان کو کافی سمجھتا ہوں۔ کہ جو عزیز شیخ محمود احمد صاحب نے ایک وجدانی حالت میں لکھا ہوا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ کے اس سفر کی برکات سے جہاں تشنہ اور پیاسی قومیں سیراب ہوئیں۔ وہاں پر اس خادم کو بھی حیثی از بیش برکات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔

اس غریب و حقیر کے مکان میں مرشدی حضرت خلیفۃ المسیح مع اپنے تجربہ کار جرنیلوں کے قیام فرما ہوئے۔ اور تین روز تک میں نے ان نوروں سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ خدا کی قدرت ہے کہ یہ مقام کہ جو شارع الخلیج المصری میں واقع تھا۔ ایک نہایت ہی اہم اور تاریخی مقام گذشتہ صدیوں سے چلا آتا ہے۔ خدا کے نہاں در نہاں رازوں کو انسان نہیں جان سکتا۔ اور وہ اپنے وقت پر آکر کھلتے ہیں۔ یہ شارع الخلیج دراصل ایک نہر تھی۔ جسکو حضرت عمرو بن العاص نے رضی اللہ عنہ فاتح مصر نے اپنی گورنری کے زمانہ میں قاہرہ کے لوگوں کو پانی کی تکلیف سے نجات دینے کے لئے بنوایا تھا۔ اس نہر کا منہ مصر قدیم کے پاس ہے۔ جس کو اس
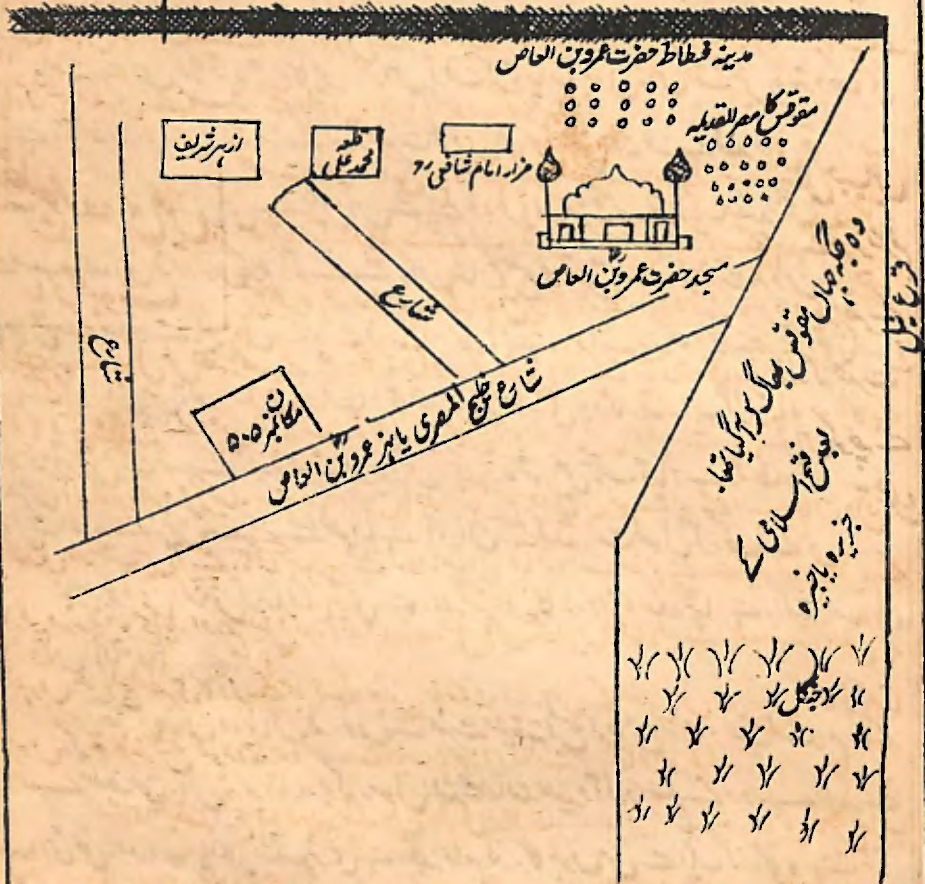
وقت تک فم الخلیج کہا جاتا ہے۔ یہ مصر القدیم وہ شہر ہے کہ جو دراصل مقوقس کا شہر تھا۔ اس کے محلّات کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ اور اس کا شہر قصر الشمع کا ایک حصہ اب تک زمانے کی دست برد سے محفوظ ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں وہ بھاگ کر نیل کے دوسری طرف چلا گیا۔ اور حضرت عمروؓ اس کے قصر الشمع میں چند روز قیام فرما ہوئے۔ اس کے قریب ہی مدینہ فسطاط آباد کیا گیا۔ اور جامع عمرو ابن العاص بنائی گئی۔ شہر کے سامنے بالکل نیل بہہ رہا تھا۔ جو کہ اب تک بدستور بہہ رہا ہے۔ اس جگہ نیل کے پانی کو معلوم کرنے کے لئے مقیاس بنوایا گیا۔ اور یہ سب امور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ میں ہوئے۔ اس مقام کو زیادہ کھول کر بتانے کے لئے میں نے اوپر کا

نقشہ دینے کی کوشش کی ہے کیونکہ جن لوگوں نے کسی شہر کو نہیں دیکھا ہوتا۔ وہ محض عبارت سے صحیح طور پر کسی مقام کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ گو مجھ کو اس کا افسوس ہے کہ میں نقشہ بنانا نہیں جانتا میں نے محض لکیروں کی مدد سے احباب کو بتلانے کی سعی کی ہے۔

یہ نقشہ ہے اس علاقہ کا جس کا میں ذکر اس وقت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نقشہ میں جو نہر دکھائی گئی ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کھدوائی تھی۔ اب خشک ہو کر عام گذرگاہ بن گئی ہے لیکن اس سے پہلے وہ غربا اور امرا کے لئے ایک مفید لنگر تھا۔ جس سے سب لوگ اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ اس شارع خلیج کا تعلق سیدنا حضرت عمروؓ بن العاص کی جامع کے ساتھ ہے یعنی اس کے بہت قریب اسکا دہانہ ہے۔ جو اب بند ہو چکا ہے مگر ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ اور اسطرح سے فسطاط کا شہر بھی جو صحابہ کی یادگار تھا۔ اب گر کر تباہ ہو چکا ہے حالانکہ مقوقس کے شہر کے آثار نہ صرف موجود ہیں۔ بلکہ وہ شہر ابھی تک آباد ہے۔ فسطاط کو اب حکومت مصریہ نے زمین کے نیچے سے نکلوایا ہے۔ اور ان کے کھنڈرات کھول کر رکھدئے ہیں۔

جامع عمروؓ بن العاص قریباً ٹوٹی پڑی ہے۔ اور اکثر اس کا دروازہ بند رہتا ہے۔ البتہ عید کی نماز وہاں ادا کی جاتی ہے۔

پس خدا کی نہاں در نہاں قدرتوں نے حضرت خلیفۃ المسیح کو جو مسیح موعود علیہ السلام کے دوسرے خلیفہ ہیں۔ اس نہر پر اتارا۔ جو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے خلیفہ نے کھدوائی تھی۔ اور اب بالکل خشک پڑی ہے۔ بلکہ عام گذرگاہوں میں سے ایک گذرگاہ ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اس سڑک پر اتارا جس کا تعلق حضرت عمروؓ کے بنائے ہوئے شہر فسطاط کے ساتھ اس وقت تک ہے۔ اور فسطاط اپنی خاموش زبان سے کہہ رہا ہے کہ دنیا میں اس قدر فسق و فجور پھیل گیا ہے کہ ان قدیم مبارک مکانات کی حفاظت کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ اور صلحاء کے مکانات کھنڈرات بن گئے۔

عمرو بن العاص کی مسجد کے تالے اپنی خاموشی سے کہہ رہے ہیں کہ عبادتوں کے مقامات اس زمانے میں تالوں اور قفلوں کے ذریعہ آباد کئے جاتے ہیں پس خدا نے چاہا۔ کہ خلیفۃ المسیح ان کھنڈرات کے اوپر آ اترے۔ اور پھر وہ اپنی دعاؤں سے ان گذشتہ مردوں کو زندہ کرے۔

میں ایک عرصہ سے کوشش کر رہا تھا۔ کہ میں اس مکان کو چھوڑ دوں۔ مگر مشیت الٰہی نے ایسی ایسی تاخیریں پیدا کر دیں۔ کہ میں اسکو اس وقت تک نہ چھوڑ سکا۔ اور حضرت کو مصر کی زمین سے گئے ہوئے ابھی دو ہفتہ نہیں گذرے تھے۔ کہ میں اس مکان کو چھوڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس لئے کہ اس کے چھوڑنے میں میرے لئے بعض خاص دقتیں تھیں۔ مگر خدا نے عجیب طریق سے انکو پورا کر دیا۔

پس میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت خلیفۃ المسیح کا اس مقام پر قیام خدا کی کسی مصلحت کے ماتحت ہے اور اس مصلحت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک گونہ تعلق معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ خدا اپنے فضل سے اس خلیفۃ المسیح ثانی کے ذریعہ ان مقامات پر پھر کوئی جلوہ دکھلائے۔ الغرض یہ مقامات جو تاریخی ہیں۔ اور صحابہؓ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب مٹ چکے ہیں۔ فقط ان کے آثار باقی ہیں۔

ان کے بنانے والوں کی روحیں آسمان پر رب العرش سے انکی آبادی کیلئے ضرور دعائیں کر رہی ہوں گی۔ میری مراد یہ نہیں کہ نہر خلیج کو اب پھر نہر کر دیا جائے۔ بلکہ یہ نہر ایک روحانی فیضان کیطرف اشارہ کرتی تھی۔ جو کہ منقطع ہوگیا۔

فسطاط پاکیزہ اور صلحا کے مکانوں کا ایک مجموعہ تھا۔ جہاں سے ذکر الٰہی کی آواز آتی تھی وہ کھنڈرات بنگیا۔ اور اب وہاں کوئی چیز خدا کو یاد کرنے والی نہ رہی پس میری مراد روح سے ہے نہ مادے سے اور یہی وہ راز ہے جس کے لئے خدا نے مسیح موعود کے خلیفہ کو اس جگہ اتارا۔

مصر میں ہندوستانی

قاہرہ (مصر) سے روانگی سے پیشتر میں ایک اور امر کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں اور وہ مصر میں ہندوستانی ہیں۔ جیسے سمندر اپنے اندر ہزاروں قسم کی مخلوق رکھتا ہے۔ اور ان کے ساتھ یکساں معاملہ کرتا ہے۔ ویسے ہی سمندری سفر کے شروع ہو جانے کے ساتھ ہی ذات پات۔ چھوت چھات۔ ہندوستانی عادات۔ قومیت۔ رواج ہر ایک چھوٹ کر ایک ہی سطح پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات کسی غیر ملک کی طرف رخ کرنے کے ساتھ ہی انسان میں بہت سی تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے میں قبل اس کے کہ مصر کے ہندوستانیوں کے متعلق کچھ لکھوں ایک دلچسپ واقعہ لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

میں ایکدفعہ سکندر آباد دکن کیطرف جا رہا تھا پنجاب میل میں میں نے سیکنڈ کلاس کی ایک سیٹ بک

کرائی۔ اسمیں دو ہندو جنٹلمین سوار ہوئے۔ جو انگلستان بغرض تعلیم جا رہے تھے۔ اور ایک امرت سر کے کپڑے کا ایک بڑا تاجر تھا۔ ہمارا کھانا ریلوے کار سے آیا۔ اور اس تاجر کا بھی۔ اس کے اور ہمارے کھانے میں جو گوشت آیا۔ وہ بڑا گوشت تھا۔ اس ہندو تاجر نے شوق سے کھایا۔ اور ہماری صراحی سے پانی پیا۔ میں نے تعجب سے اسکو پوچھا کہ تم نے یہ گوشت کیسے کھا لیا۔ تو اس نے کہا کہ ہم کو سب کچھ ہضم ہو جاتا ہے۔ اب وہ ولایتی مسافر نوجوان حیران تھے۔ کہ کیا کہائیں۔ ان کا بیان تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی گوشت استعمال نہیں کیا۔ وہ دیگر مسافروں سے پوچھتے تھے۔ کہ جہاز میں کیا غذا ملتی ہے ولایت میں کیا کھانا ملتا ہے۔ اسپر انکو گوشت انڈا وغیرہ کے متعلق جواب ملتا۔ وہ حیرانی سے سنتے اور عزم کرتے کہ ہم نہیں کھائیں گے۔ مگر ابھی دہلی تک نہیں پہنچے تھے۔ کہ ایک کا عزم ٹوٹ گیا۔ اور اس نے کہا کہ مجھ کو ابھی سے تجربہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے کچھ انڈے منگوائے اور وہ نہایت ہی عجیب طریق سے کھائے۔ بہرحال وہ منماڑ پہنچنے سے پیشتر گوشت خور ہو گیا۔ میرا اس واقعہ کے بتلانے سے یہ منشا ہے کہ ہندوستان سے غیر ملکوں کیطرف جانے کے ساتھ ہی انسانی طبائع میں تغیر شروع ہو جاتا ہے لیکن جہاز میں سوار ہونے کے ساتھ وہ تغیر نمایاں ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کسی ملک میں پہنچکر سب تفرقات مٹ کر صرف انڈین یا ہندی کا عرف باقی رہجاتا ہے۔

مصر میں ہندو مسلم تمیز بہت کم ہے۔ عام طور پر ہندی ہی کہدینا کافی ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ہندوستانی کا کسی غیر ملک میں برا نمونہ دکھانا سارے ملک کو بدنام کر دینے کے مترادف ہے کیونکہ وہ چند افراد جو کسی ملک میں ہوتے ہیں۔ گویا کہ وہ اس ملک کی نیابت کرتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستانیوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ جو ہندوستان سے باہر جا کر اپنے ملک کے متعلق نیک خیال کو دل میں محفوظ رکھیں۔

مصر میں ہندو تاجر

مصر میں سندھی ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ جو مصر کے اہم اور مشہور مقامات پر لنگر ڈالے ہوتے ہیں۔ وہ عربی زبان کو بہت عمدگی سے بولتے ہیں۔ اور لاکھوں روپے کا کاروبار کرتے ہیں۔ سویز۔ پورٹ سعید۔ قاہرہ۔ الگزینڈریا اقصر میں انکی کثرت سے دوکانیں ہیں۔ ہر جگہ نہایت عمدہ بازاروں میں چکدار رنگ و روغن کی دکانیں رات کے وقت تیز بجلی کی روشنی میں سے ان کے ہندوانہ نام پڑھے جاتے ہیں۔

قاہرہ میں مندرجہ ذیل دکانیں بہت مشہور ہیں۔ پاہومل برادرس۔ چیلارام برادرس۔ ہوت چند اینڈ سنز۔ دیال داس کلاچند وغیرہ۔ چیلارام کی دکان پر گورو نانک رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر ہندو بزرگوں کی تصاویر دوکان کے منہ کیطرف بنی ہوئی ہیں۔

ایک ایک دوکان کئی کئی لاکھ کی تجارت کر رہی ہے۔ اور ان میں کام کرنے والے سب سندھی نوجوان ہیں۔ جو سب کے سب ایک ہی قسم کی پوشاک پہنتے ہیں۔ وہ کئی زبانیں بول سکتے ہیں۔ مثلاً سندھی اردو۔ انگریزی۔ عربی۔ فرنچ۔ اٹالین۔ گریک۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان زبانوں کے علماء ہیں۔ مگر وہ عمدگی سے اپنے کاروبار اس زبان میں چلا سکتے ہیں۔ وہ اپنے کھانے کے لئے باورچی تک ہندوستان سے لیجاتے ہیں۔ ان کا کاروبار زیادہ تر یورپین سیاحوں پر موقوف ہے۔ امریکہ اور انگلستان۔ فرانس کے سیاح ہر سال کثرت سے آتے ہیں۔ ان ہندوؤں کی دوکانیں مصر کے مشہور ترین ہوٹلوں کے دامن میں ہیں۔ اور سیاح ہوٹل سے نکلکر سیدھے وہاں آجاتے ہیں۔

یہ سب دوکاندار دہرم اتھ کے نام سے کچھ روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب نے مجھے بتایا کہ اسکو پاہومل فرم کے مینجر نے کہا کہ ہمارے پاس اس مدمیں کئی لاکھ روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ جو ہم کسی وقت کسی بڑے ہسپتال یا کسی خیراتی کام میں صرف کریں گے۔

یہ لوگ ہندوستان کے نام پر تجارت کرتے ہیں۔ مگر ہندوستانی مال کے سوا جاپان اور دیگر ممالک کا سامان بھی بیچ لیتے ہیں۔

الغرض انکی زندگی نہایت اعلیٰ اور پرامن واقع ہوئی ہے۔ اور وہ بہت عمدگی سے کام کرتے ہیں ایک فرم کا کوئی ملازم اگر ملازمت چھوڑ دے۔ کوئی دوسری فرم اسکو نہیں لیگی۔ اور اسکی کوئی مدد نہیں کرے گی حتیٰ کہ روٹی تک بھی نہیں دینگے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر اس فرم میں معافی مانگ کر آتا ہے۔ برٹش قونصل بھی ان فرموں کا ہر طرح لحاظ رکھتی ہے۔

وہ نہایت ضبط کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور کبھی انکی کوئی قابل شکایت حالت نہیں پائی گئی عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں اپنے اہل ملک سے محبت اور ہمدردی کے جذبات بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی ہندوستانی وہاں چلا جائے۔ تو وہ حتی الوسع ضرورت کے وقت انکی اخلاقی اور مادی مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ اور اس میں وہ کسی قسم کا تفرقہ قوم و مذہب کا بھی روا نہیں رکھتے۔ گو یہ قدرتی امر ہے کہ وہ اپنے

ہم قوم یا ہم مذہب لوگوں سے بوجہ اقرب ہونے کے سلوک خریدکریں۔

مُسلمان تاجر مسلمان تاجروں کا مصر میں بھی وہی حال ہے۔ جو ہندوستان میں ہے۔ وہاں مسلمان تاجر یا توکشمیری ہیں۔ یا گجراتی۔ اور کچھ پنجابی ہیں۔ کشمیری تو وہاں کے باشندے ہوگئے ہیں۔ اور اب کسی ہندوستانی کو ملنے کی خواہش ان کے دل میں باقی نہیں رہی۔

گجراتی تاجر بھی بہت خشک واقع ہوئے ہیں۔ انکی دوکانیں اور انکی زندگی بھی بالکل اس طرح سے واقع ہوئی ہے گویا کہ انکو ہندوستان سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ مصری لباس پہنتے ہیں۔ اور حتی الوسع ہندوستانیوں سے الگ رہتے ہیں۔ انہیں سے اکثر سکتہ الحدید اور خان خلیل میں تجارت کرتے ہیں۔ جو ازہر کے بہت پرانے بازار ہیں۔ ہندوستانی لباس اور شکل و شباہت میں کچھ پنجابی وہاں نظر آتے ہیں۔ اور درزی کا کام کرتے ہیں۔ انکی ایک بڑی جماعت وہاں ہے۔ اکثر ان میں سے انگریزی فوج میں کپڑوں کی سلائی کے ٹھیکیدار ہیں۔ اور دو تین دوکاندار بھی ہیں جنہیں سے قابل ذکر چار۔ دوکانیں ہیں۔ حاجی امام الدین اینڈ سنز میراں بخش اینڈ سنز۔ عمرالدین اینڈ سنز۔ نظام الدین ٹیلر ماسٹر۔ مگر بدقسمتی سے ان مسلمانوں میں باہم اتفاق و اتحاد کا کوئی نام نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ اسلام اخوتِ اسلامی کا زبردست اور سب سے بڑھ کر نمونہ اور تعلیم پیش کرتا ہے۔ نہ مذہب انکو متحد رکھتا ہے۔ اور نہ قومیت۔ نہ پیشہ، نہ ملک۔ میں جب اس امر کا اظہار کرتا ہوں۔ تو مجھے سخت دُکھ ہوتا ہے۔ آہ!

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا

اس اتفاق و اتحاد کے فقدان نے انکی حالت کو غیر ملک میں جاکر بھی کسی حیثیت سے بہتر بنانے میں مساعدت نہیں کی بعض اوقات باہمی جھگڑے عدالتوں تک لمبے ہوجاتے ہیں۔ اور نہ صرف ان کے مال پر موثر ہوتے ہیں۔ جو قدرتی امر ہے۔ بلکہ ہندوستان اور اسلامی ہند کے وقار کو بھی اس سے نقصان پہونچتا ہے۔ انہیں سے بعض لوگوں نے مالی حیثیت سے بہت کچھ کمایا بھی۔ مگر مجھے یہ کہنے میں تامل ہوتا ہے کہ اس روپے سے انکی ذات یا اسلام یا ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچا ہو۔ مسرفانہ زندگی نے اچھا اثر نہیں کیا۔

بعض ہندوستانی مسلمان جو اس طرح پر وہاں گئے۔ اور وہیں مقیم ہوگئے۔ فوت ہوچکے ہیں اور اب اولاد نہ ادھر کی رہی نہ اُدھر کی۔

پنجابی راول

درزیوں کے علاوہ پنجابی راولوں کا بھی ایک گروہ مصر میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ راول قوم اپنی سفروں کی عادت اور ذہین فطرت کیوجہ سے مشہور ہے۔ یہ لوگ علی العموم دنیا کے ہر حصہ میں جانے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر ملک کی زبان نہایت آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ مصر میں وہ علی العموم رمالی اور ہاتھ دیکھنے کا کام کرتے ہیں۔ لوگوں کی قسمت بتا کر اپنی قسمت بناتے ہیں۔ اور بعض طبیب جسمانی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اور خوب روپیہ کماتے ہیں۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے وجود سے بھی اسلام یا ہندوستانیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا میں ایک رات مصر کے بازاروں میں پھر رہا تھا۔ ہر قہوہ خانے پر میں کسی نہ کسی راول کو قسمت بتاتے دیکھ کر افسوس کرتا تھا۔ کہ کیوں یہ لوگ اپنے ذہین و زیرک دماغ کو کسی اور کام میں لگا کر رزق حاصل نہیں کرتے سب سے بڑا افسوس مجھے یہ ہوا کہ اس طریق عمل نے مصریوں کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ شاید ہر ہندوستانی رمال ہی ہوتا ہے۔ راول کانفرنس اگر توجہ کرے۔ تو وہ اپنی قوم کی بہت بڑی اصلاح کر سکتی ہے۔ اور مسلمان ان لوگوں کی تنظیم اور اصلاح سے مسلمانوں کے لئے ایک مفید اور قیمتی جزو قوم کا طیار کر سکتے ہیں۔

فقرا

اس کے علاوہ ایک جماعت فقرا کی وہاں ہر سال آتی ہے۔ جو قابل شرم طریق سے مانگتے ہیں۔ ہندوستان میں جیسے عرب بدنام ہیں۔ ویسے یہ لوگ وہاں بدنام ہیں۔ یہ لوگ پیدل تمام عرب کا چکر کاٹ کر آتے ہیں۔ اور عجیب عجیب قسم کے بہانے کر کے مانگتے ہیں۔ اور ہر سال یہ ایک بڑی تعداد آتی ہے میرے خیال میں ایسے لوگوں کا کوئی انسداد ہو سکے تو بہت مفید ہوگا۔

ہندوستانی طلباء

ہندوستانی طلبا کی ایک جماعت ازہر میں تعلیم حاصل کرتی ہے بعض نہایت فقر اور ذلت سے زندگی بسر کرتے ہیں بعض انہیں بارہ سال سے پڑے ہوئے ہیں۔ انکو مصری گورنمنٹ کی طرف سے روٹی اور کچھ پیسے ملتے ہیں۔ ہندوستان جو ساری دنیا کے مسلمانوں کو تکلیف کیوقت مدد دینے کیلئے پیش پیش رہتا ہے۔ ان غریب طلبا کے لئے آجتک کچھ نہ کر سکا۔ اور یہ شرم کی بات ہے اول تو ہمیں ہندوستان میں کم از کم ایک مدرسہ اس پایہ کا قائم کرنا چاہیئے جسمیں عربی کی تعلیم کے لئے ازہر کے نمایاں گریجویٹ یا شام بیروت کی یونیورسٹیوں کے ممتاز فارغ التحصیل آکر زباندانی کا درس دیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہندوستان کیطرف سے مصر میں نہایت ممتاز اور ذہین و شوقین طالب علم بھیجے جاویں اور ان کے لئے اخراجات کا معقول انتظام کیا جاوے۔

احمدی جماعت اس معاملہ میں خدا کے فضل سے پیش پیش ہے۔ جو ۱۹۱۲ء سے اپنے طالب علم اور مبلغ بھیج رہی ہے۔ ان سب کے علاوہ ہزار بارہ سو کے قریب ایسے ہندوستانی بھی آباد ہیں۔ جو اپنے ہندوستانی بزرگوں کی نسبت کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون تھے۔ اب وہ خالص مصری ہو چکے ہیں بعض انہیں سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔

دلاور بیگ ایک اوقاف کا آفیسر ہے۔ ایک ایسے ہی ہندوستانی نے پارلیمنٹ مصر کی ممبری کیلئے اپنے آپ کو کھڑا کیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے مجھ کو ایک لیڈی ڈاکٹر مسلمان عورت لیلی نام ملی تھی جسکی بہت بڑی جائیداد تھی۔ وہ رامپور ریاست کے باشندے قاسم علی خاں کی بیٹی تھی۔ ان ہندوستانیوں کے ہزاروں روپے کی زمین مکانات ملک ہیں۔

ایک ہندوستانی کئی لاکھ پونڈ کی جائیداد وقف کر گیا۔ مگر اس نے اپنے ملک کے غرباء کے لئے ایک پائی نہیں چھوڑی۔ افسوس!

نواب ما ل و پیپ میں یہ بھی ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ وہاں سلطان عماد الدین اسکندر ایک ہندوستانی سلطان عرصہ سے نظر بند ہے۔ جو اب بہت قابل رحم حالت میں ہے۔

الغرض مصر میں مسلمان ہندوستانیوں کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ اور بعض ان میں غربت اور بیکسی کیحالت میں بھوکوں مر رہے ہیں۔ میں مشاہدات عرفانی کی اس جلد میں جو بلاد اسلامیہ کے لئے مخصوص ہے۔ ان اور دوسرے امور پر انشاءاللہ تفصیل سے لکھوں گا۔ یہاں صرف سرسری تذکرہ کیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی تو بلاد اسلامیہ میں میرے مشاہدات ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے والے ہوں گے۔ انشاءاللہ العزیز۔

قاہرہ سے اسکندریہ کو روانگی

چونکہ کل ۳ر جولائی ۱۹۲۵ء بروز جمعہ اسکندریہ سے جہاز پر سوار ہونے کا میں نے انتظام کر لیا تھا اسکندریہ کو آج ہی عزیز مکرم شیخ محمود احمد صاحب کے ہمراہ جانے کے لئے ریلوے سٹیشن کو روانہ ہوا اسکندریہ قاہرہ سے ۱۳۰ میل دور ہے۔ اور چھوٹے بڑے ۱۳ سٹیشن ہیں۔

قاہرہ سٹیشن پر نوک جھونک میں قاہرہ سٹیشن پر پہنچا۔ حمال میرا سامان لئے ہوئے اندر جا رہا

تھا۔ کہ دروازہ پر متعینہ ٹکٹ کلکٹر نے اسے روکا۔ اور کہا کہ سامان کھول کر دکھاؤ۔ کہ کیا کیا چیزیں قابل محصول ہیں۔ اسکا یہ جملہ سن کر میرے تعجب اور حیرت کی حد نہ رہی۔ اگرچہ عزیز محمود احمد میرے ساتھ تھے۔ مگر میں نے خود اس سے انگریزی میں گفتگو کی۔

عرفانی۔ یہ ریلوے سٹیشن ہے یا کسٹم ہوس۔

ٹکٹ کلکٹر۔ یہاں ہر قسم کا سامان دیکھا جاتا ہے۔ اور قابل محصول ہو تو لیا جاتا ہے۔

عرفانی۔ تم نے مجھے اجنبی سمجھ کر یہ بات کہی ہے میں انگریزی رعایا ہوں اور جانے سے پہلے برٹش قونصل کو اسکی شکایت کروں گا۔ تم اجنبی مسافروں کو تنگ کرتے ہو محصول آنے والے مال پر ہوا کرتا ہے یا جو مصر سے باہر جائے۔؟

میں نے یہ کہا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں کھلگئیں۔ اور وہ معذرت کرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ اچھا اچھا آپ جائیے۔

واقعہ یہ نہایت معمولی تھا۔ مگر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ان لوگوں کی اخلاقی حالت کیسی گر گئی ہے اور نیز یہ بھی مجھے معلوم ہوا کہ برطانی حکومت کا کسقدر رعب ہے۔ یونہی میں نے نام لیا کہ میں انگریزی رعایا ہوں۔ گو اُسے پہلے ہی اپنی بیہودگی کا علم تھا۔ اور اس نے میری اجنبیت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا تھا۔ مگر انگریزی رعایا کے الفاظ نے اسے چوکنا کر دیا۔ اور اسے سوائے معذرت اور اظہار افسوس کے اور چارہ کار نظر نہ آیا۔ بہرحال ہم دونوں باپ بیٹا گاڑی میں سوار ہوئے۔ مصری ریل گاڑیوں کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

اسکندریہ اسکندریہ کے اسٹیشن پر جس وقت ہم پہنچے۔ تو طامس کک کا نمایندہ موجود تھا۔ یہ ایام اسکندریہ میں ازبس مصروفیت کے ہوتے ہیں۔ چونکہ موسم گرما میں حکومت مصر اور بڑے بڑے عمائد اور ارکان دولت کے علاوہ مصر کے روسا اور بیرونی سیاح بھی اسکندریہ آجاتے ہیں۔ اس لئے ہوٹلوں میں جگہ ملنی بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہم دو تین ہوٹلوں میں گئے کہیں جگہ نہ ملی۔ اور آخر

ہوٹل سکوا

میں قیام کیا۔ نہایت ہی معمولی درجہ کا ہوٹل تھا۔ اور محض شب باشی کیلئے ۱۶ پیاسٹر یعنی اڑہائی روپیہ

کے قریب نی کس ادا کیا۔

طنطا اور حضرت سید احمد بدوی علیہ الرحمتہ

قاہرہ سے اسکندریہ جاتے ہوئے راستہ میں طنطا ایک بہت بڑا سٹیشن ہے۔ جو حضرت سید احمد بدوی کے مزار کیوجہ سے بہت مشہور ہے۔ حضرت سید احمد بدوی کا نام عربی طریق اسم نویسی کیوں ہے۔

احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن ابی بکر القدسی ۔ اور چونکہ وہ ہمیشہ اپنے منہ پر ڈھاٹھہ رکھا کرتے تھے۔ انکو ملثم کہتے تھے۔ ۵۹۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۶۰۹ھ ہجری میں وہ اپنے والد بکرم کے ساتھ حج کو تشریف لیگئے۔ اور مکہ معظمہ ہی میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ ان کے والد ماجد نے ۲۰ویں سال انتقال کیا۔ اور بدوی اس لئے مشہور ہو گئے تھے کہ منہ پر ڈھاٹھ رکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ عام بدویوں کا طریق ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دو ٹھلے تھے استعمال کئے۔ جنکو انہوں نے کبھی جدا نہ کیا۔ وہ ساری عمر مجرد رہے۔ قرآن کریم کے حافظ تھے۔ اور امام شافعیؒ کے پیرو تھے۔ لوگوں نے ان کے زمانے میں انکو بہت تکالیف دیں آخر انہوں نے ترک کلام کر لیا۔ اور کسی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ البتہ اشارات سے بات چیت کر لیتے۔ اور ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ۶۳۳ھ ہجری میں ایک رویا کی بنا پر اپنے بھائی کے ساتھ عراق کا سفر کیا۔ روزے بکثرت رکھتے تھے اور اکثر اوقات کھانا نہ کھاتے تھے۔ اسی طرح اکثر آسمان کیطرف دیکھا کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں سُرخ رہتی تھیں ۶۳۴ھ میں واپس مصر آگئے۔ اور طنطا میں قیام کیا۔ اور عموماً مکان کی چھت پر رہا کرتے تھے قد لمبا اور موٹی پنڈلیاں۔ مضبوط بازو۔ بڑا چہرہ تھا۔ اور رنگ سفید گندم گون تھا بہت سی کرامات انکی طرف منسوب کیجاتی ہیں۔ بروز منگل ۱۲ ربیع الاول ۶۷۵ھ کو طنطا میں وفات پائی۔ یہ مختصر تذکرہ **جلال الدین سیوطی** نے لکھا ہے۔

حضرت سید احمد بدوی کے مزار پر اس جگہ سال میں دو مرتبہ میلا لگتا ہے۔ اور ہر مرتبہ ایک ایک ہفتہ رہتا ہے۔ گورنمنٹ مصر کے حکم سے وزیر اوقاف وہاں ہر میلہ پر موجود رہتا ہے۔ اور وہ گویا اس تقریب پر بادشاہ کا قائمقام ہوتا ہے۔ غرباء کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور نقد خیرات بھی تقسیم کی جاتی ہے۔ اس مزار کے متعلق بھی بہت بڑا وقف ہے۔

ہر میلہ پر قریباً ایک لاکھ آدمی جمع ہوتے ہیں۔ اور مصر کے مختلف حصوں سے آتے ہیں۔ لوگوں کی عقیدت اور ارادت کا یہ حال ہے کہ بعض اپنے گھروں سے رقص کرتے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ اور

یاسید احمد بدوی

کے نعرے مارتے ہیں۔ حضرت سید احمد بدوی کی مصریوں میں وہی شان اور عزت ہے۔ جو حضرت سید عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی مشرق میں ہے۔ مشرقی گور پرست یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ پکارتے ہیں تو مصری یا سید احمد بدوی کے نعرے لگاتے ہیں۔ اس مزار کو لوگوں نے قبلہ حاجات بنا رکھا ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ مصریوں میں قبر پرستی بڑھتی جاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ تو مذہب سے بے پرواہ اور مغربی فیشن کا متبع اور غلام ہو رہا ہے۔ اور عوام میں مردہ پرستی کی روح حلول کر رہی ہے۔ جس طرح پر ہر ملک میں عام طور پر قبروں پر عورتوں کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت بدوی کا مزار بھی مستورات کے ہجوم سے گھرا رہتا ہے مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ تعجب ہوا ہے کہ اسلام جو ایک زندہ مذہب ہے۔ اور جو قبر پرستی اور مردہ پرستی کی لعنت سے بچانے کے لئے آیا تھا جس نے ہر قسم کے شرک اور رسوم و رواج کے اغلال سے دنیا کو نجات دی تھی۔ آج اس کے ماننے والوں میں الا ماشاء اللہ یہ بیماری ہر ملک میں ترقی کر رہی ہے۔ اور اس کے ماننے والے ہر جگہ

مُردہ پرستی

میں مبتلا ہو کر اپنی روح کو ہلاک کر رہے ہیں۔ ہر زمانہ میں جب خدا کی طرف سے کوئی مامور ہو کر آیا۔ یا خدا تعالیٰ نے کسی نیک بندے کو اصلاح خلق کے لئے کھڑا کیا۔ یا اسے اپنے قرب کا مقام عطا فرمایا تو اندھی دنیا نے انکی مخالفت کی۔ لیکن جب وہ فوت ہو گئے۔ تو انکی

قبروں پر سجدے ہونے لگے

اور وہ جو زندگی میں کافر تھے۔ اور زندیق سمجھے جاتے تھے۔ خدا کے قرب کے مقام سے ہٹا کر خدا یا انکی قدرتوں میں شریک اور سہیم قرار دئے جانے لگے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسی اصول کے موافق حضرت احمد بدوی کو لوگوں نے انکی زندگی میں بہت سی تکالیف دیں۔ اور انکو مجبور کر دیا کہ وہ ترک کلام کریں۔ اور لوگوں سے نہ ملیں مگر آج انکی قبر مرجع خلائق اور قبلہ حاجات بنی ہوئی ہے میں یقیناً جانتا ہوں کہ جب یہ لوگ انکی مزار پر جمع ہو کر رقص و ترنم کرتے ہیں۔ اور یا سید احمد بدوی کے نعرے مارتے ہوئے انکو پکارتے اور حل مشکلات چاہتے ہیں۔ تو انکو زبانِ حال یہ جواب ملتا ہے کہ

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

انکی روح یقیناً ان رقص کرنے والوں سے ناخوش اور ان سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ اور زندہ مذہب کے پرستاروں میں اس گور پرستی نے روحانی طور پر ایسی مردنی پیدا کر دی ہے کہ وہ اس کھلے کھلے شرک کا بھی احساس نہیں کر سکتے ہیں اس سٹیشن پر تیسری مرتبہ آتا ہوں، ہر مرتبہ میں نے یہاں گذرتے ہوئے حضرت سید احمد بدوی کو اپنا سلام پہنچایا۔ اور میں نے اس کے نام میں احمد قادیانی کی خوشبو کو سونگھا اور اس خوشبو میں

احمد مکی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشام نے معطر کر دیا

اور میں درود شریف پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اسکندریہ کی تاریخی حیثیت

اسکندریہ کی عظمت اور قدامت تاریخی حیثیت سے عظیم الشان ہے میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اسلامی تاریخ کے ساتھ اس کا بہت بڑا تعلق ہے۔ اور مذہبی حیثیت سے اسکندریہ تاریخ مذاہب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ اسکندریہ کے علمی خزانوں کی یاد اس کی مشہور عالم لائبریری کے نام سے ہمیشہ قائم رہیگی۔ مسلمانوں کی علم پروری اور علم دوستی پر حملہ کرنے کے لئے اس کتب خانے کو جلانے کا الزام دشمنان اسلام نے لگایا ہے۔ اور میں جبکہ اسکندریہ کے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھ رہا ہوں، اور خدا تعالےٰ نے اپنے فضل سے ایک مرتبہ نہیں پورے چار مرتبہ مجھے اس شہر میں نزول اور قیام کا کافی موقعہ دیا ہے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اصلی حقیقت سے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو آگاہ کروں۔ پوری تفصیل سے میں انشاء اللہ العزیز بلاد اسلامیہ والی جلد میں لکھوں گا۔ یہاں صرف اس شہر کی تاریخی حیثیت پر کچھ مختصر سا لکھ جاتا ہوں۔

اسکندریہ یا اسکندرون دنیا کی تاریخ میں بہت پرانا شہر ہے۔ اگرچہ اسکی بنیاد سکندر اعظم نے ۳۳۲ قبل مسیح رکھی تھی لیکن جس مقام پر سکندریہ آباد ہوا۔ وہاں اس سے بھی پہلے بحری قزاقوں نے اپنی پناہ گاہ بنائی ہوئی تھی لیکن جب سکندر نے اسے آباد کیا۔ تو یونانی اور رومی حکومت کے عہد میں اسکندریہ اس وقت کی معلوم دنیا میں بہت بڑا شہر تھا۔ یہ شہر سمندر کو پاٹ کر ہی بنایا گیا تھا۔ ایک زمانہ میں یہ شہر اپنے علمی فیضان کے لحاظ سے عدیم المثل تھا۔ اقلیدس جیسا ہندسی بطلیموس اور ایراٹو تھینز جیسے جغرافیہ دان اور ہپارکس مشہور عالم ہیئت دان اپنے علمی فیضان کے دریا بہا رہے تھے۔ عیسائی رہنماؤں اور فلاسفروں

کے درمیان مذہبی مناظرات کی تاریخ اسکندریہ اپنی جگہ بہت دلچسپ ہے۔ بڑے بڑے معرکہ کے مباحثات یہاں ہوئے ہیں۔

اسلامی تاریخ کا تعلق اسکندریہ سے اس وقت ہوا۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ۶۴۲ء میں اس کو ۱۴ مہینے کے شدید محاصرہ کے بعد فتح کیا۔ محاصرہ کے اس قدر عرصہ تک ممتد ہونے سے بھی اس شہر کی مضبوطی اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مسلمان جرنیل کی اولوالعزمی، اور اسلامی افواج قاہرہ کی مستقل مزاجی اور علو ہمتی اور بہادری کا پتہ اس سے ملتا ہے۔ عرب کے بادیہ نشین دنیا کے اس بڑے تاریخی شہر پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور چودہ مہینے تک برابر محاصرہ کئے ہوئے ہر قسم کی سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر

فتح کئے بغیر نہیں رہتے

اسکندریہ میں مختلف حکومتوں۔ سلطنتوں۔ اور مختلف زمانوں کے علمی۔ مذہبی۔ اور اقتصادی کارناموں کی ایک دلچسپ تاریخ مدفون ہے۔

حضرت عمرو ابن العاص نے فاروق اعظم کو جو فتح نامہ لکھا۔ اس میں یہ بھی تحریر تھا۔ کہ اس شہر میں چار ہزار حمام۔ چار ہزار عظیم الشان محلات۔ بارہ ہزار تاجران تیل۔ بارہ ہزار مالی۔ اور چالیس ہزار یہودی جو جزیہ دیتے ہیں۔ اور چار سو تھیٹر (تفریح گاہیں) ہیں۔ اس سے شہر کی عظمت کا کس قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

غرض اسکندریہ کی اسلامی تاریخ ۶۴۲ء سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس طرح یہ سکندریہ قریباً تیرہ سو سال کی اسلامی تاریخ کا امین ہے۔ اور بہت سے انقلاب اس سرزمین نے دیکھے ہیں۔ وہ شہر جو صدیوں تک مرجع خلائق تھا۔ جہاں ہر علم و فن کے باکمال رہتے تھے۔ جو اپنی تجارتی اور بحری پوزیشن کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں وہ ایک معمولی قصبہ رہ گیا تھا۔ اور صرف چھ ہزار باشندے اس میں رہتے تھے۔ یہ محمد علی پاشا خدیو مصر کے عہد حکومت کی بات ہے۔ اسکندریہ کی غیر آبادی یا بربادی کے مختلف اور متعدد اسباب میں سے ایک یہ بھی تھا۔ کہ ہندوستان کو جہازات راس امید کیطرف سے جانے لگے۔ اور تجارتی ترقی کی موج اس طرف بدل گئی۔

یہ پہلا موقعہ نہ تھا کہ اسکندریہ اس طرح پر غیر آباد ہوا ہو۔ بلکہ اس پر ایسے متعدد دور آچکے تھے

عہد اسلامی میں جب قاہرہ دارالحکومت ہوگیا۔ تو اسکی اہمیت اور عظمت کو ایک دھکا لگا۔ مگر پھر آباد ہوا اور اس کی شان و شوکت میں خلیفہ مروان بن عبدالعزیز کے عہد حکومت میں ایسی ترقی ہوئی کہ یہ غیر آباد شہر دولاکھ باشندوں کا مسکن ہوگیا۔ لیکن جب صلیبی جنگوں کا طوفان یورپ سے اُٹھا۔ تو اس نے اسکندریہ کی عظمت پر اثر ڈالا۔ اور اس بارونق شہر کو برباد کردیا۔

محمد علی پاشا کے عہد حکومت میں اسکندریہ کی آبادی صرف چھ ہزار کے قریب رہ گئی تھی لیکن اسنے اسکندریہ کی تاریخی عظمت کو ہی نہیں بلکہ اس کے محل وقوع کی سیاسی اور تجارتی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی ترقی اور آبادی کیطرف خاص توجہ کی۔ اور اس مقصد کے لئے جو اسباب اور ذرائع اس نے اختیار کئے ان میں سے ایک نہر محمدیہ کا افتتاح واجرا تھا۔ جو ۱۸۲۰ء میں عمل میں آیا۔ اسکی تکمیل تین لاکھ پونڈ کے صرف سے ہوئی۔ چونکہ انتظام مکمل اور کافی نہ تھا۔ اسکی تعمیر اور تکمیل میں بہت سا جانی نقصان بھی ہوا۔ یہ نہر پچاس میل لمبی اور ایک سو فیٹ چوڑی ہے۔

موجودہ شہر کی ترقی کی یہی ابتدا سمجھنی چاہیئے۔ اور اب جبکہ وہ اسکندریہ جہاز رانی کے لئے ایک مرکزی مقام ہوگیا ہے۔ یوماً فیوماً ترقی کر رہا ہے۔ اب یہاں سے انگلستان۔ مارسیلز۔ برنڈسی قسطنطنیہ وغیرہ کے ساتھ بحری تعلقات رکھتا ہے۔ اور براعظم افریقہ کا ایک بہت بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ جہاں سے مختلف اطراف میں خشکی کے راستہ انسان جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۱ء میں قاہرہ اور اسکندریہ کو بذریعہ ریلوے ملانے کی تجویز ہوئی۔ اور ۱۸۵۶ء میں یہ ریلوے جاری ہوگئی۔ اور جلد ہی سویز تک اس کو ممتد کیا گیا اور بہت سے دوسرے شہروں تک شاخیں نکالدی گئیں۔ جو اپنی روئی کی تجارتی منڈیوں کے لئے اب ممتاز اور خوشحال ہیں۔ ایک چھوٹی سی ریلوے یہاں سے رملہ تک گئی ہے۔ جو ایک سمندری قصبہ ہے۔

انگریزی تاریخ میں اسکندریہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان واقعات کے سلسلہ میں یہ ایک زبردست کڑی ہے۔ جنہوں نے ۱۸۸۲ء میں انگریزی قبضہ مصر پر کرادیا۔ ۱۱ جون ۱۸۸۲ء کو جو فساد اسکندریہ میں ہوا۔ وہ عرابی پاشا کی جنگی بلند پروازیوں کے لئے ایک چنگاری ثابت ہوا۔ اور اس سلسلہ میں ۱۱ جون ۱۸۸۲ء کو انگریزی گولہ باری اس شہر پر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس شہر کی آبادی اور رونق میں پھر ترقی شروع ہوئی۔ اور اب یہ نہایت ہی شاندار اور خوبصورت شہر افریقہ کے ساحل پر ہے۔

اسکندریہ پر ایک سرسری نظر

اسکندریہ کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد میں اس شہر پر ایک سرسری نظر کرنا چاہتا ہوں۔ اسلئے کہ تفصیلی طور پر میں موعودہ جلد میں انشاءاللہ لکھونگا اور سب سے زیادہ موقع مجھے اس شہر میں ایسی ہی کے وقت ملا ہے۔ جبکہ میں قریبًا ایک ہفتہ تک یہاں مقیم رہا۔ اور میں نے پوری آزادی اور فرصت کے ساتھ یہاں کی زندگی (مذہبی سیاسی اور تجارتی کام کا مطالعہ کیا۔ اور قابل دید مقامات پر جاکر انکو دیکھا اور ان میں یہاں کی تاریخ کا منظر دیکھا۔ میں بعض مقامات پر کئی صدیاں پیچھے چلا گیا۔ اور اسکندریہ کے در و دیوار کو اس عہد کے آفتاب کی روشنی میں گھنٹوں تک دیکھتا رہا۔

اسکندریہ کی عمارات نہایت عظیم الشان اور اپنی عظمت۔ ساخت۔ اور خوبصورتی کے لحاظ سے یورپ کے کسی بڑے سے بڑے شہر کی عمارات سے کم نہیں ہیں۔

اسمیں بھی شبہ نہیں کہ بعض حصے نہایت غلیظ اور بدنما بھی ہیں۔ مگر وہ بہت ہی کم ہیں۔ اور شہر اب اپنی عالی شان عمارتوں اور دوسری ترقیات کے لحاظ سے ہر آن بڑھ رہا ہے۔ گذشتہ سال بھی میں اس شہر میں آیا تھا۔ اور یہاں سے گذرا تھا۔ مگر اب ایک سال ہی کے اندر اسمیں نمایاں تبدیلی ہو چکی ہے۔

منشیہ

شہر کا بہترین اور خوبصورت حصہ منشیہ ہے۔ یہ بہت بڑا چوک ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نہایت خوبصورت گلزار چلا گیا ہے۔ اور جہاں چاروں راستے آکر ملتے ہیں۔ اس حصہ کے علاوہ باقی دور تک یہ گلزار نہایت خوبصورت تفریح گاہ ہے۔

اس منشیہ میں ہائیکورٹ اور صرافہ کی شاندار عمارتیں ہیں۔ میں ذیل میں ایک خاکہ اس چوک کا دیتا ہوں
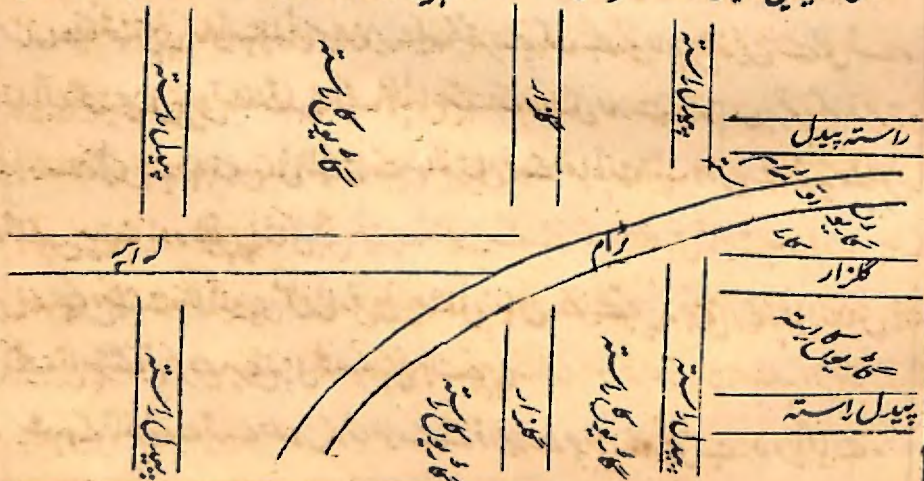
اس خاکہ میں جو راستہ پیدل چلنے والوں کیلئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عالیشان مکانات کا سلسلہ چاروں طرف دور تک چلا گیا ہے۔ اور یہ مکانات نیچے دوکانیں ہیں اور اوپر کی منزلوں میں لوگ رہتے ہیں منظر نہایت خوبصورت اور دلچسپ دلکش مرقع پیش کرتا ہے۔

میں جب سال گذشتہ آیا تھا۔ اور یہاں سے مکرمی چودھری فتح محمد صاحب کے ساتھ یہاں سے گذرا تھا تو اسی منشیہ میں آکر ایک ہوٹل میں اترا تھا۔ اور واپسی کے وقت بھی منشیہ کے قریب ہی ایک بڑے ہوٹل میں مقیم رہا۔

منشیہ میں خدیو محمد علی پاشا کا رو ئین مجسمہ اسپ سوار لقب ہے۔ محمد علی پاشا عمامہ پہنے ہوئے ہیں انکی ڈاڑھی نہایت خوبصورت اور شکل وصورت سے تدبر مستقل مزاجی اور بہادری کے صفات نمایاں ہیں۔ یہ بہلاہت عمامہ والا ہے۔ مصر کے مشہور چوک ازبکیہ میں ابراہیم پاشا کا مجسمہ بھی میں نے دیکھا ہے لیکن وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔ یہ مجسمے ان مصری نجات دہندوں کی اولو العزمیوں اور شاندار کامیابیوں کے مجسمے اور تاریخ ہیں۔ کاش یہ بت اہل مصر میں اپنی روح عزم پیدا کر سکتے۔

بہر حال مصر اور اسکندریہ کے ان پر رونق بازاروں میں یہ مجسمے اہل مصر کو ایک سبق دیتے۔ اور حیات ملی کی روح کیطرف پکارتے ہیں۔ مگر ان کی آواز جو زبانِ حال سے نکلتی ہے۔ وہ

سن قلوب اور بہرے کانوں پر پڑتی ہے

منشیہ کی دوکانیں یوروپین منڈیوں کے ہر قسم کے اسباب تنعم و تعیش کا شاندار منظر اور مظاہرہ ہیں :-

میں نے نقشہ میں دکھایا ہے کہ درمیان میں ایک مختصر سا پارک ہے۔ یہ عام سطح زمین سے کس قدر اونچا بنایا گیا ہے۔ جہاں ہر وقت لوگوں کا ایک جمگھٹا رہتا ہے۔ صرافہ کی عمارت کے پاس ہر قسم کے اخبارات کی فروخت کا مرکز ہے۔ ہندوستانی زبان کے سوا ہر زبان کے اخبارات آپ وہاں سے خرید سکتے ہیں گو وہ قیمتیں بہت زیادہ لیتے ہیں۔

یوروپین اخبارات انگریزی۔ اٹالین۔ فرنچ۔ یونانی زبان کے ملتے ہیں۔ جرمنی کے اخبارات میں نے نہیں دیکھے۔ قاہرہ کے اخبارات ہر روز اسی شام کو پہنچ جاتے ہیں۔

شہر کے تمام بڑے بڑے حصوں کو ٹراموے کے ذریعہ سے جو بجلی سے چلتی ہے۔ ملا دیا گیا ہے۔

غرض۔ اس تاریخی شہر میں اپنے بیٹے کے ہمراہ پھرتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اس سرزمین پر چلتا ہوں۔ جہاں اسکندر یونانی اور اس کی افواج قاہرہ نے ڈیرے ڈالے تھے۔ اور جہاں ساتویں صدی عیسوی میں عمرو بن العاص اور آپ کی فوجیں محاصرہ کئے ہوئے پڑی تھیں۔ اور میں اپنی خوبیٔ قسمت پر اس لئے ناز کرتا تھا۔ کہ حضرت فضل عمر خلیفۂ ثانی کے عہد کو پایا۔ اور اس کے ہی عہد میں میں اس شہر میں دوسری مرتبہ آرہا ہوں۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۵ء کو اسکندریہ سے اٹلی جانے والے جہاز پر روانگی کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس لئے زیادہ قیام کا موقعہ نہ تھا۔

۲۵ جولائی ۱۹۳۵ء یوم جمعہ اسکندریہ سے روانگی

علی الصباح ضروریات سے فارغ ہو کر ہوٹل کے بل ادا کئے۔ اور ناشتہ وغیرہ کر کے بعض ضروری اشیاء آنے والے سفر کے لئے خرید کرنے گیا۔ اور اس تاریخی شہر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بندرگاہ کو چلا گیا۔

اسکندریہ کے دلالوں سے بچو

میں نے مکرمی منشی محبوب عالم صاحب کے سفرنامہ میں اسکندریہ کے دلالوں کے متعلق ایک نوٹ پڑھا تھا۔ اور میں پہلے ہی ایجبا کسی قدر تجربہ کر چکا تھا۔ مگر باوجود اس پہلے تجربہ اور علم کے اور باوجودیکہ میرا بیٹا جو مصر میں تین سال رہ کر یہاں کے حالات سے کما حقہٗ واقف ہے اور شیخ محمود احمد صاحب میرے ساتھ تھا۔ پھر بھی ان کا شکار ہونے سے نہ بچ سکا۔ جونہی ہم بندرگاہ پر پہنچے۔ ایک شخص ہمارے ساتھ ہو گیا۔ اور ہر چند اسے کہا گیا۔ کہ ہمیں ضرورت نہیں شیخ محمود احمد صاحب نے اپنی زبان دانی اور مصری واقفیت کے پورے اثر کو استعمال کیا مگر سب بے سود۔ وہ حضرت نہ ٹلنے والے تھے۔ کوئی دقیقہ اسکو ہٹانے اور دور کرنے کا ہم نے باقی نہ رکھا۔ زجر و توبیخ پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دی مگر کوئی چیز کارگر نہ ہوئی۔ اور وہ حضرت ہمارے ساتھ لگے رہے۔ اور بالآخر ہم ہار گئے۔ اس کا استقلال غالب آیا۔ اور تختہ جہاز تک وہ ہمارے ساتھ چلا ہی گیا۔ اور آپ ہی ایک حمال بغیر اسباب پر ہاتھ ڈال دیا۔ اور ہم اپنی مروت یا صحیح معنوں میں اخلاقی جرأت کی کمزوری کے باعث خاموش رہے۔ اور وہ اسباب لیکر ہمارے ساتھ اوپر چلا۔

اسکندریہ کا بندرگاہ

اسکندریہ کا بندرگاہ نہایت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ جہاز سید ناگودی

ساتھ آلگتا ہے۔ اور موٹریں اور گاڑیاں جہاز کی سیڑھی کے ساتھ تک آجاتی ہیں۔ جس جہاز پر میں جارہا ہوں۔ اسکانام دی آنا ہے۔ یہ اٹالین کمپنی کا جہاز ہے۔ جہاں سے اٹلی کے مختلف بندرگاہوں کو جہاز جاتے ہیں۔ لیکن یہ جہاز وینس اور ٹریسٹ کو جانے والا ہے۔ میں وینس اُتر جاؤں گا۔ قرنطینہ وغیرہ کی فیس ادا کر کے ہم جہاز پر چلے گئے۔ عزیزی شیخ محمود احمد صاحب تختہ جہاز تک میرے ساتھ تھے اب جبکہ میں جہاز پر سوار ہوگیا۔ تو

دلّال صاحب تنگ لائے

اس نے اپنی اُجرت یا دھینگا شاہی حق الخدمت کا مطالبہ کیا۔ اور نہایت سختی سے مطالبہ کیا۔ بہت ممکن تھا کہ میں اس کے بل کو اسی قدر ادا کر دیتا جو وہ مانگتا تھا مگر شیخ محمود احمد صاحب نے جو انکی چالوں سے بخوبی واقف تھے۔ اسے ڈانٹا۔ اور مناسب اُجرت دینی چاہی۔ اور وہ اس پر قریباً رضامند ہوگیا تھا۔ میں نے محض یہ سمجھ کر اسے کچھ زائد دیدیا کہ ایسے موقعہ پر زیادہ بحث اور جھگڑا فضول ہے۔ میں نے یہاں سے وینس تک ڈیک کا ٹکٹ خرید کیا تھا۔ اب اسی دلال کو کچھ اور وصول کرنے کا فکر ہوا۔ اور وہ جھٹ جہاز کے ایک خلاصی کو لے آیا کہ آپ اس کا حجرہ لے لیں بہت آرام ملیگا۔

خلاصیوں کے حجرے یا کمرے

جہازوں پر خلاصی عموماً اپنے کمرے کرایہ پر دیدیتے ہیں۔ اور بہت سے تاجر مسافر جو اس قسم کے حالات سے واقف ہوتے ہیں عموماً یہی کرتے ہیں کہ وہ ڈیک کا ٹکٹ لے لیتے ہیں۔ اور جہاز پر جاکر خلاصیوں سے ان کا بستر کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ خلاصیوں کیلئے بڑے بڑے کمرے ہوتے ہیں۔ جنمیں سے ہر ایک میں ضرورت کے موافق چار سے لیکر دس بارہ تک کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ جو خلاصی اپنی سیٹ دیدیتا ہے۔ وہ اس اپنے کرایہ دار کو ہر طرح آرام پہنچاتا ہے۔ پانی لا دیتا ہے۔ کھانا اور دوسری ضروریات کا انتظام کردیتا ہے ایک قسم کا نوکر بن جاتا ہے۔ مجھے بھی اسکا علم تھا۔ اس لئے دلال صاحب جھٹ ایک خلاصی کو لے آئے اور میں چاہتا تھا کہ یہ انتظام ہو جاوے لیکن آخر مجھے یہ بہتر معلوم ہوا کہ جہاز روانہ ہو جاوے تو کمرہ لینا مفید ہوگا۔ اس لئے کہ جن لوگوں نے لینا ہے۔ وہ لے چکیں گے اور پھر کم کرایہ پر ملیگا۔

بہر حال دلّال صاحب نے جب دیکھا کہ میں اسوقت کمرہ لینے کو آمادہ نہیں۔ تو وہ بادل ناشاد رخصت ہوئے۔ میں نے پھر ایکبار اپنے لخت جگر کو مناسب موقعہ ہدایات اور وصایا دیکر رخصت کرنا چاہا۔

اس لئے کہ جہاز اب روانہ ہونے کو تھا۔ اور پہلا وہسل ہو چکا تھا۔ اور چند ہی منٹ میں بحیرہ روم کے پانی کہیں سے کہیں لیجانے کو طیار تھے۔ محبت پدری کے جذبات نے گرم گرم قطرات اشک سے محمود کے منہ کو دھویا۔ جبکہ میں انکی پیشانی پر بوسہ دے رہا تھا۔ وہ خوشی اور افسردگی کے ملے ہوئے جذبات کے ساتھ مجھ سے الگ ہو کر خشکی پر چلا گیا۔ اور کنارہ جہاز سے آنکھوں کی چمک، اور جذبات قلبی کی لاسلکی کے ذریعہ بسلامت روی و باز آئی کہہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھیک، ایک بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ اور میں پھر بحری مسافر ہو گیا۔

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

محمود ساحل پر کھڑا تھا۔ اور میں تختۂ جہاز پر پدری محبت اور فرزندانہ سعادت کے احساسات سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ساحل پر فوٹو گرافر فوٹو لینے میں مصروف تھے۔ اور بہت سے لوگ جو اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ رومال ہلا ہلا کر ایکدوسرے کے ساتھ اپنے اخلاص کے جذبات کا تبادلہ کرتے رہے۔ قریباً آدھ گھنٹہ تک اسکندریہ اور اسکی عمارتیں اور زمین نظر آتی رہی رفتہ رفتہ یہ سب اوجھل ہو گئیں۔ اور پھر نیچے سمندر کا نیلگون پانی تھا۔ اور اوپر نیلگون آسمان۔ مسافر اپنی اپنی جگہوں پر سامان قرینے سے رکھ کر اطمینان کا سانس لینے لگے۔ تھرڈ کلاس یا ڈیک کے مسافروں میں باوجود کثرت کے کسی قسم کی چپقلش اور منازعت نہ تھی۔ ایکدوسرے کے لئے مناسب ایثار کے لئے تیار تھا۔ میرے پاس بستر وغیرہ تو تھا ہی نہیں۔ صرف ایک کمبل تھا۔ میں اسے خواہ نیچے بچھا لیتا۔ یا اوپر لے لیتا۔ میرے ہر دو ٹرنک بے ترتیب سے پڑے ہوئے تھے۔

خدا خود میر سامان است
ارباب توکل را

اور میں اس فکر میں تھا۔ کہ انکو ایک ترتیب سے ایک طرف لگا کر اپنے لئے جگہ بنا لوں میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ایک یہودی خاتون رجو اپنے دو قریب بہ بلوغ بچوں اور ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ سفر کر رہی تھی) نے اپنے دونوں بچوں کو اشارہ کیا کہ وہ میرے ٹرنک ترتیب سے لگا دیں۔ چنانچہ جب اُنہوں نے انکی درستی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اسکا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ ما انا من المتکلفین اس نے کہا کچھ ہرج نہیں۔ اور خود ان کے ساتھ ہو کر میرے ٹرنک اس ترتیب سے رکھ دئے۔ کہ ایک میرے پاؤں کیطرف تھا اور دوسرا سر کی طرف۔ اور میں ان کے درمیان آسانی سے سو سکتا تھا چونکہ

ان کے پاس کافی بستر تھا۔ اس نے جھٹ ایک گدا بچھا کر اور ایک تکیہ رکھکر میرا بستر بنا دیا۔ میں نے ہر چند کہا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ لیکن میں جس قدر انکار کرتا تھا۔ اسی قدر اس کا اصرار بڑھتا تھا۔ میں نے بھی اسے خداداد عطیہ سمجھ کر آخر شکر گذاری سے قبول کر لیا۔

جب میرے لئے بستر وغیرہ کا انتظام ہو گیا۔ اور وہ سب تو پہلے ہی اپنے لئے سامان آرام کر چکے تھے۔ تو انہوں نے جھٹ چار کا انتظام کیا۔ اور چار تیار کر کے سب سے پہلے میرے سامنے پیش کی۔ اب میں نے انکار ناپسند کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے

چار نوشی سے لطف اٹھایا

میرے ساتھ شیخ محمود احمد صاحب نے کچھ سامان خورد و نوش کر دیا تھا۔ میں نے اب اسے اپنے پاس رکھنا غیر ضروری سمجھا۔ اور وہ سب کا سب انکے حوالے کرنا چاہا۔ اور انہوں نے انکار پر اصرار کیا۔ آخر میں نے کہا کہ جب تم میرے لئے انتظام کرتے ہو۔ تو میں اسے فروخت کرنے کے لئے نہیں لیجا رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اور میں بظاہر اپنے سفر میں کھانے پینے کی تکالیف سے نجات پا گیا۔

ایک ہندوستانی خلاصی

اسکندریہ میں ہی ابھی جہاز کھڑا تھا۔ جب ہم سوار ہوئے تھے۔ تو ایک ہندوستانی خلاصی محمود کو کہیں مل گیا۔ وہ آکر اس وقت ملا تھا۔ اور اس نے ہر قسم کی خدمت آرام و آسانی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی فرصت پا کر میرے پاس آ گیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ مجھے اچھا خاصہ خدمتگذار مل چکا ہے۔ تو اسے حیرت اور تعجب ہوا۔ اور خوشی بھی ہوئی۔ پانی کیلئے بعض اوقات دقت کا خطرہ تھا۔ میں نے اسے کہا اور اس نے ایسا انتظام کر دیا۔ کہ ہم نہ صرف خود با فراط رکھ سکتے تھے۔ بلکہ اپنے بعض رفیقوں کو بھی کافی دے سکتے تھے۔ اس فعل نے میری ہر دلعزیزی کو بڑھا دیا۔

غرض خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر قسم کا سامان نہایت آسانی سے بدون میری کسی خاص کوشش اور سعی کے کر دیا۔

کیبن کی فکر

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں۔ کہ جہاز پر خلاصیوں کے کیبن علی العموم ملجاتے ہیں۔ اور میں نے اسکندریہ میں ہی کیبن لینا چاہا تھا۔ مگر پھر یہ مشورہ ملا کہ رستہ میں کسی جگہ لے لیں گے۔ اس طرح پر سستا ملیگا۔ اب جبکہ جہاز کچھ دور نکل گیا۔ اور تمام کام باقاعدہ ہونے لگ گیا۔ وہ افراتفری اور دوڑ دھوپ جو عموماً روانگی کے وقت ہوتی ہے۔ دور ہو چکی۔ اور اب سوائے

گپ زنی اور مناظر بحر سے لطف اٹھانے کے سوا کوئی کام نہ رہا تھا۔ تو بعض خلاصیوں نے یکے بعد دیگرے آ آکر کیبن کے لئے پوچھنا چاہا۔ میں حیران تھا کہ کیبن لوں یا نہ لوں۔ اس لئے کہ آرام کے لحاظ سے اب کیبن کی ضرورت باقی نہ رہی تھی لیکن اس خیال سے کہ اگر سرد ہوا شروع ہوئی یا سردی زیادہ ہوئی تو کیبن میں بہر حال آرام میں رہوں گا۔ دل میں فیصلہ کرتا تھا کہ کیبن لے لینی چاہئے۔ تاہم میں نے اپنی بے رغبتی کا اظہار کیا۔ اور کل پر فیصلہ چھوڑا۔

جہاز کے مسافر

جہاز کے ہر درجہ میں بہت مسافر ہیں۔ اور جہاز بھرا ہوا ہے۔ بہت سے رومن کیتھولک عیسائی روما جا رہے ہیں۔ ان ایام میں ہاں پوپ کی زیارت میں آسانیاں ہوتی ہیں اسلئے وہ اظہار ارادت کیلئے جا رہے ہیں۔ اول اول مجھے شبہ ہوا انہوں نے رومی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اور ہاتھ میں تسبیح تھی شکلیں بالکل مسلمانوں کی سی ہیں میں نے سمجھا یہ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس لئے کہ وہ عموماً تاجر لوگ تھے۔ جو مصر اور اسکندریہ وغیرہ تجارت کرتے ہیں۔ اور اب یک کرشمہ دو کار سیاحت اور زیارت کے دونوں مقصد لیکر جا رہے تھے میں نے جب ان سے گفتگو کی۔ تو بھی تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ عیسائی ہیں۔ انہیں سے بعض باوجود خوب فارغ البال ہونے کے تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے۔ اور اپنے تجربہ سفر کی بنا پر خلاصیوں کے حجرے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ چند فادر بھی سوار تھے۔ وہ تو پورے مشائخ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی ویسی ہی ٹوپیاں اور لمبے جبّے میں نے دیکھا کہ میرے لئے دلچسپی کا کافی سامان ہے۔

بہر حال آج تو میں نے اسی جگہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نمازیں میں نے جمع کر کے پڑھیں۔ اور میری نماز نے میرے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

تختۂ جہاز پر چار مسلمان بھی تھے۔ جو یوگوسلاویہ کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی مجھ میں اور میں نے انہیں دلچسپی لینی شروع کی۔ ہم نے باہم باوجود مسافر ہونے کے ایک دوسرے کے ساتھ اکرام ضیف کے جذبات کا تبادلہ کیا۔ میں یہودی کمپنی کو اب چاء وغیرہ کیلئے بآسانی کہہ سکتا تھا کیونکہ خوردنی اشیاء کا تھوڑا بہت ذخیرہ ان کے حوالہ کر چکا تھا جس میں پھل بھی تھے اور بسکٹ وغیرہ بھی۔ وہ اپنا انتظام آپ کرتے تھے۔

یہ دن تو اسی طرح سے گذر گیا۔ رات چاندنی تھی۔ کچھ عرصہ تک میں جہاز کے مختلف حصوں میں پھرتے ہوئے اس چاندنی کا لطف اٹھاتا رہا۔ اور آخر سو گیا۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۵ء یوم ہفتہ (تختۂ جہاز)

خواب رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ اور سو رہا ہوں۔ اور ایک چراغ روشن ہے۔ اتنے میں دروازہ پر مولوی عبدالرحمٰن جٹ کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ جلد دروازہ کھولو۔ تو وہ بہت بڑی سینی میں کھانا لے کر آئے ہیں۔ اس میں سے کچھ گرا بھی ہے۔ کیونکہ بہت گرم تھا۔ اس لئے مولوی صاحب کو گھبراہٹ تھی میں نے پوچھا کہ کیا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ

حضرت صاحب کے چھوٹے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے **خلیل احمد** نام رکھا ہے۔ اسکی دعوت عقیقہ ہے اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنی ڈائری میں یہ خواب لکھتے ہوئے لکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ خواب کو حقیقت بناوے آمین

اب اسوقت جبکہ میں مشاہدات کی پہلی جلد شائع کر رہا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے اس خواب کو حقیقت بنا دیا ہے۔ میں نے اپنا یہ خواب **لنڈن اور جدہ** میں اپنے دوستوں سے بیان کیا تھا۔ الحمد للہ علےٰ ذالک۔

صبح اُٹھ کر حوائج اور نماز سے فارغ ہو کر میں ایک جانب تلاوت کے لئے چلا گیا۔ اور ایک سورۃ پڑھی۔ واپس آیا تو ناشتہ تیار تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد پھر میں لیٹ گیا۔ اور سو گیا۔ پھر ایک رؤیا میں دیکھا کہ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب یورپ جا رہے ہیں۔ اور میرے پاس بیٹھے ہیں۔ خواجہ کمال الدین صاحب بھی اسی جہاز پر ہیں۔ تحریک مصالحت کے متعلق ایک خط لکھا جا رہا ہے۔ پھر کچھ ذکر خلافت راشدہ کے متعلق آیا۔ ان کے پاس ایک یورپین لیڈی بیٹھی ہے۔ اور وہ انگریزی کا ترجمہ اردو میں بتاتے ہیں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ واللہ اعلم۔

آفتاب پوری شان سے نکلا ہوا ہے۔ اور مسافر خوش و خورم مختلف قسم کی تفریحوں اور کھیلوں میں مصروف ہیں۔

ایک جرمن پادری سے مکالمہ میں نے تختۂ جہاز پر ایک شخص کو دیکھا۔ کہ وہ ایرانی لباس پہنے ہوئے پھر رہا ہے۔ مجھے خیال گذرا کہ شاید یہ ایرانی ہے۔ جہاز پر ایکدوسرے سے تعارف پیدا کرنے کے لئے کسی انٹرڈیوس کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم جس سے چاہو بے تکلف

ل تو ہر شخص چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے ملیں۔ تاکہ بات چیت میں وقت گذرے۔ میں اس کا ایرانی لباس دیکھ کر اس کے پاس گیا۔ اور اس سے حسب ذیل مکالمہ ہوا

عرفانی۔ السلام علیکم۔

جرمن پادری۔ وعلیکم السلام۔ مزاج شما!

عرفانی۔ الحمد للہ! جناب آغا! آپ خیریت سے ہیں۔

مزاج پرسی وغیرہ کے بعد معلوم ہوا۔ کہ آپ جرمن پادری ہیں۔ اور ایران میں عرصہ دراز تک کام کرتے رہے ہیں۔ اور اب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ملنے جا رہے ہیں۔ انکی والدہ اور بیوی بچے بھی ساتھ تھے پادری صاحب نے **اسلامیات** سے اپنی واقفیت کا بہت کچھ اظہار کیا۔ میں نے اُن سے ایران کے حالات پوچھے۔ اس نے کہا عیسائیت کا نفوذ ایران میں ہو رہا ہے۔ یہ سنکر مجھے قدرتی طور پر تکلیف ہوئی۔ میں نے اس وقت مناسب نہ سمجھا کہ اس سے مذہبی گفتگو کا سلسلہ چھیڑوں۔ تاکہ وہ پہلی ہی ملاقات میں وحشت نہ کرے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے آج دوپہر کے بعد پھر ملنے اور تبادلہ خیالات کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اڑھائی بجے کے قریب پادری صاحب پھر تشریف لائے۔ اور ہم نے باہم گفتگو شروع کی۔ ہم فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ مگر میں فائدہ عام کیلئے اُسے اردو میں دیتا ہوں۔

پادری صاحب۔ میں نے اسلام کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اور مسلمانوں ہی میں کام کرتا ہوں مجھے کوئی خوبی اسلام میں نظر نہیں آئی۔

عرفانی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپکو اسلام میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ اگر آپکو نظر نہ آئے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ اسلام میں کوئی خوبی ہی نہیں؟

پادری۔ نہیں میں تو یہ نہیں کہتا کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوگی۔ لیکن مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوتی۔ جو عیسائیت کے مقابلہ میں لائے تو کیا کم از کم اس جیسی ہی ہو۔

عرفانی۔ عیسائیت جو آپ پیش کرتے ہیں۔ یا جو میں نے پادریوں سے سنی ہے۔ اور انکی تصانیف میں پڑھی ہے۔ اصولی طور پر کوئی خوبی ہی نہیں۔ تو اسلام اس تعلیم کو کیونکر مان سکتا ہے۔ اور اسلامی تعلیم کا اس سے مقابلہ کرنا میں تو اسلام کی ہتک سمجھتا ہوں۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک مردہ کا زندہ کا کیا مقابلہ کیا جاوے۔

پادری۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ قرآن مجید تو انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

عرفانی۔ میں نے کب کہا ہے کہ وہ تصدیق نہیں کرتا۔ بیشک انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ انجیل کیا تھی؟ آپ کسے کہتے ہیں۔ یہ متنازعہ فیہ بات ہے۔

پادری۔ کیا آپ اس انجیل کو جو ہمارے پاس ہے نہیں مانتے!

عرفانی۔ آپ اسکو انجیل کہتے ہیں۔ میں اس قدر مانتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

پادری۔ کیا وہ خدا کا کلام نہیں!

عرفانی۔ میں نے انجیل کو جسے آپ پیش کرتے ہیں، پڑھا ہے۔ میں نے نہیں پڑھا کہ اس نے کہیں دعویٰ کیا ہو۔ کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہے۔ تو مجھے وہ آیت سنا دیں جس میں کہا گیا۔ کہ

یہ انجیل خدا کا کلام ہے

ہماری یہ گفتگو فارسی میں ہو رہی تھی۔ دوسرے مسافروں نے یہ ایک عجیب اور نئی زبان سنکر اس میں دلچسپی لی۔ اور یہ ایک اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔ اور ان میں سے بعض نے دریافت کیا۔ کہ یہ کونسی زبان ہے پادری صاحب نے ہی انہیں بتایا کہ یہ فارسی ہے۔ اور ہم دونوں اسلام اور عیسائیت پر گفتگو کر رہے ہیں پادری صاحب نے یہ مفہوم ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بیان کیا۔ میں نے سمجھا کہ ہم دونوں اس خصوص میں بھی برابر ہیں۔ اسلئے میں تیار ہو گیا کہ اگر انگریزی میں گفتگو ہو گی۔ تو میں اپنے مافی الضمیر کو اس طرح پر ادا کر سکوں گا چنانچہ بعض نے کہدیا کہ بہتر ہو۔ اگر آپ انگریزی میں گفتگو کریں۔ اسپر ہم نے فارسی چھوڑ کر انگریزی شروع کر دی۔ مجھے اگرچہ اس طرح پر آزادانہ گفتگو کرنے کا پورا موقعہ نہ ملا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو قادر الکلام نہ سمجھتا تھا۔ مگر جرمن پادری کی انگریزی نے مجھے حوصلہ دلا دیا۔ کہ میں ساتھ چل سکوں گا۔ تاہم میں نے یہ کہدینا ضروری سمجھا۔ کہ میں پورے طور پر شاید اپنے خیالات کو ظاہر نہ کر سکوں لیکن میں کوشش کروں گا۔ کہ ا سے سمجھا دوں۔ یہ کہکر پھر ہم نے سلسلہ کلام شروع کرنے سے پہلے پہلی گفتگو کا مختصراً اعادہ کیا۔ اور میں نے کہا۔

عرفانی۔ پادری صاحب کہتے ہیں۔ کہ یہ انجیل جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس انجیل میں پادری صاحب مجھے یہ دکھا دیں۔ کہ انجیل نے خود کہا ہو کہ

یہ خدا کا کلام ہے

یا جن لوگوں نے انجیل کو لکھا ہے۔ اُنہوں نے ہی کہا ہو۔ کہ خدا کے الہام سے ہم یہ لکھ رہے ہیں۔

اور یہ خدا کا الہام ہے۔ میں پادری صاحب کے اپنے دلائل نہیں سننا چاہتا۔ لُوقا۔ مرقس متی اور یوحنا کی کتابوں میں صاف صاف سننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ کتابیں خود دعویٰ نہ کریں۔ یا ان کے لکھنے والے خاموش رہیں۔ تو پادری صاحب یا کسی اور کا کیا حق ہے کہ وہ انکو خدا کا کلام کہیں

پادری صاحب۔ میں انجیل کے خدا کا کلام ہونے کا ثبوت اس کتاب سے دوں گا جسکو آپ خدا کا کلام کہتے ہیں یعنی قرآن شریف۔ جب قرآن شریف انجیل کو خدا کا کلام کہتا ہے۔ تو آپ کا انکار قرآن شریف کا انکار ہو گا۔

عرفانی۔ دیکھئے صاحب! میں نے سوال یہ کیا ہے کہ کیا اس انجیل نے خود یا اس کے لکھنے والوں نے اس انجیل کے خدا کا کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یا نہیں؟

جواب ہاں یا نہیں ہے۔ اگر جواب ہاں ہے تو میرا مطالبہ ہے کہ انجیل کی وہ آیت پیش کر دو۔ جہاں ایسا دعویٰ ہے۔ اگر نہیں تو دیانتداری سے یہ اقرار کر لو۔ کہ انجیل نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ پھر میں آپ کو اجازت دوں گا۔ کہ آپ قرآن شریف کو بطور گواہ پیش کریں۔ اسوقت ہم قرآن شریف کی شہادت کو پڑھیں گے۔

(حاضرین میں سے ایک) پادری صاحب! سوال بہت صاف ہے۔ آپ کا جواب صرف ہاں یا نہیں سے ادا ہو جاتا ہے۔ یہ دلچسپ گفتگو ہے۔ آپ **مسلم جنٹلمین** کے سوال کا جواب دیں۔

پادری صاحب۔ میں افسوس کرتا ہوں۔ کہ ہم نے آپکو اس فیصلہ کے لئے جج نہیں بنایا یہ میرا کام ہے کہ میں جواب ہاں یا نہ سے دوں۔ یا کسی اور طریق پر۔

وہی صاحب۔ یہ سچ ہے کہ میں جج نہیں۔ لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے۔ کہ یہ مشترک معاملہ ہے۔ آپ بھی عیسائی ہیں اور میں بھی۔ اور آپ ہمارے وکیل ہیں۔ بس اگر میں اپنے وکیل کو اصل نقطہ پر لانے کے لئے عرض کروں تو اس کا دیانتدارانہ فرض ہے کہ اُسے مان لے۔

پادری صاحب۔ کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ اگر میں آپ کے ساتھ اتفاق نہ کر کے مسٹر عرفانی سے ہی گفتگو کروں۔

وہی صاحب۔ مجھے افسوس ہے کہ آپکو میرے دخل دینے سے تکلیف ہوئی۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں آپکو صحیح مشورہ دے رہا تھا۔ آپ میری بات نہیں سننا چاہتے۔ تو میں آپ کی ہی سنتا رہوں گا۔

پادری۔ شکریہ ہے۔ اور یہ کہکر میری طرف خطاب شروع کیا۔

آپ مجھ سے ہاں یا نہیں میں جواب چاہتے ہیں۔ میں بھی آپ سے ہاں یا نہیں میں جواب چاہتا ہوں کہ قرآن شریف نے انجیل شریف کو خدا کا کلام کہا ہے یا نہیں؟

عرفانی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اور اپنی اخلاقی ذمہ واری کو محسوس کر کے کہتا ہوں کہ آپ کے سوال کا ہاں یا نہیں میں جواب دوں گا۔ مگر اوّلاً آپ کو مجھے جواب دینا چاہیئے۔

پادری صاحب۔ میرے سوالوں کا جواب آپ دیں گے۔ تو آپ کے سوال کا جواب اس میں موجود ہے۔

عرفانی۔ پادری صاحب! مجھے ڈر ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ بہت اچھا۔ میں منزل کو قریب کرنے کے لئے آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ مگر دیکھئے صاحب! آپ اپنی پوزیشن کو نازک بنا لینگے سنئے۔ قرآن شریف نے کہیں بھی انجیل متی۔ لوقا۔ مرقس اور یوحنا کو خدا کا کلام نہیں کہا۔ اب فرمائیے آپ کی انجیل نے خدا کا کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے؟

پادری صاحب۔ یوحنا کی انجیل کے شروع میں لکھا ہے۔

ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خود خدا تھا۔

عرفانی۔ میں حاضرین پر انصاف چھوڑ دیتا ہوں۔ کہ کیا یہ میرے سوال کا جواب ہے؟ اور اس میں یہ کہاں دعویٰ ہے کہ یہ انجیل خدا کا کلام ہے؟ اور یہ آیت تو بجائے خود غلط ہے۔ کیونکہ اگر اسکا مضمون درست ہے۔ تو جبکی ابتدا ہو۔ اسکی انتہا لازمی ہے۔ اور اگر کلام خدا تھا۔ تو کیا خدا کی ابتدا ہے اور کسی وقت وہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اسپر بیسیوں اعتراض ہو سکتے ہیں۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اب بھی آپ کو ہاں یا نہ میں جواب دینا چاہیئے۔

پادری صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ انجیل صاف طور پر دعویٰ نہیں کرتی۔ کہ خدا کا کلام ہو

عرفانی۔ بہت ٹھیک۔ جب انجیل خود دعویٰ نہیں کرتی۔ تو آپ کا کیا حق ہے۔ کہ آپ اسکی طرف وہ بات منسوب کریں جبکو وہ خود نہیں مانتی۔

پادری صاحب۔ انجیل کی تعلیم نے عملی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ خدا کا کلام ہے۔

عرفانی۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ انجیل نے دعویٰ نہیں کیا۔ اب آپ کہتے ہیں کہ انجیل کی تعلیم نے عملاً ثابت کر دیا ہے۔ بہت اچھا۔ آپ کے اس دعویٰ کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔

پادری صاحب ۔ آپ کا طریق دیانتدارانہ ہے۔ اس سے فیصلہ ہو جائیگا۔ انجیل شریف ہی کے ذریعہ گناہ سے نجات ملتی ہے۔

عرفانی ۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے یہ حقیقت سمجھا دیں۔ کہ انجیل کے ذریعہ گناہ سے نجات ملتی ہے۔ مہربانی کرکے فرمایئے وہ طریق نجات کیا ہے۔

پادری صاحب ۔ بہت آسان طریق ہے۔ مسیح کا خون تمام گناہوں سے نجات دلاتا ہے۔ ایمان کی ضرورت ہے۔

عرفانی ۔ آپ کا کیا مطلب ہے مسیح کے خون کو کیا کرنا چاہیئے؟ اور روز روز کہاں سے ملیگا؟

پادری صاحب ۔ خون کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسپر ایمان رکھنا چاہیئے۔ کہ مسیح ہمارے لئے مارا گیا۔

عرفانی ۔ اس قدر ایمان سے کیا گناہ سے نجات مل سکتی ہے؟ اور کیا کوئی نظیر اسکی موجود ہے؟

پادری صاحب ۔ ہاں لاکھوں کروڑوں مثالیں موجود ہیں میں خود اس کا نمونہ موجود ہوں

عرفانی ۔ کیا آپ دعوٰی کر سکتے ہیں کہ آپ بیگناہ ہیں۔ اور کوئی گناہ بھی آپ سے سرزد نہیں ہوتا۔

پادری صاحب ۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ میرے گناہ معاف ہو گئے ہیں

عرفانی ۔ میں پھر آپ سے پوچھوں گا۔ کیا آپ سے گناہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً معاف ہو جاتا ہے۔

پادری ۔ نہیں میں یہ نہیں کہتا۔ کہ مجھ سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ گناہ معاف ہو جاتا ہے۔

عرفانی ۔ تو پھر گناہ سے تو نجات نہیں ہوئی۔ رہی یہ بات کہ وہ معاف ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر معاف ہو جاتا تو پھر گناہ پر جرأت نہ ہوتی۔

پادری ۔ نہیں جرأت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ فضل ہے۔ کہ اگر گناہ ہو جاوے تو وہ صاف کر دیا جاوے

عرفانی ۔ یہ تو خیالی پلاؤ ہے۔ جس سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ہر شخص کہہ سکتا ہے۔ کہ میرا گناہ معاف ہو گیا۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا مسیح کے خون پر ایمان لانے سے گناہ نہیں ہوتا۔ اور اگر نہیں ہوتا۔ تو عملی طور

جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا تھا۔ اسکا ثبوت نہیں۔ آپ خود مانتے ہیں کہ گناہ کرتے ہیں۔

پادری۔ ہاں گناہ کرنے کی طاقت بھی رُوح القدس کی مدد سے سلب ہو جاتی ہے۔

عرفانی۔ مسیح کے حواریوں کو یقیناً آپ سے زیادہ مسیح کے خون پر ایمان ہوگا۔

پادری۔ اس میں شبہ ہی کیا ہے۔

عرفانی۔ ابھی تو یہ حالت تھی کہ ایک نے انہیں سے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ اور مسیح کا انکار کیا۔ حالانکہ وہ بہشت کی کنجیوں کا کلید بردار تھا۔ اور دوسرے نے تیس روپیہ لیکر اپنے نجات دہندہ کو یہودیوں کو پکڑوا دیا۔ یہ تو اس زمانے کے لوگوں کی گناہ سے نجات کا نتیجہ ہے۔ اور آج جبکہ عیسائی مذہب پوری شان و شوکت سے دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اپنے مرکز یورپ میں جو نتائج پیدا کر رہا ہے۔ وہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ خدا کیلئے انصاف تو کیجئے کہ

کیا اس خون نے گناہ پیدا کیا۔ یا گناہ دُور کیا

پادری۔ کسی ایک شخص یا قوم یا ملک کی حالت سے مذہب کی حقیقت کا اندازہ کرنا صحیح نہیں کیا مسلمانوں میں ایسے لوگ نہیں۔ جو گناہ کرتے ہوں۔

عرفانی۔ میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے۔ اسلام تو گناہ سے نجات دہندہ کسی کو نہیں ٹھیراتا۔ پھر اگر آپ مسلمانوں کے کسی گناہ کو پیش کریں۔ تو اس سے اعتراض نہیں آسکتا۔ آپ کے دعوے اور اعتراض میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ عملی طور پر گناہ سے نجات ملتی ہے۔ وہ میں نے واقعات سے دکھایا ہے۔ کہ مسیح کے خون پر ایمان لانے والوں نے

گناہ کا سیلاب پیدا کر دیا ہے

پادری۔ آپ اسلام میں ایسی اعلےٰ تعلیم گناہ سے معافی کی پیش کریں۔ اعتراض کچھ چیز نہیں۔

عرفانی۔ مجھے دیانت داری سے اعتراف ہے۔ کہ اسلام خون مسیح کیطرح کوئی ایسی تعلیم نہیں دیتا۔ جس سے دنیا گناہ میں مبتلا ہو جائے۔ اور اسلام کا ایسے گناہ آفریں عقیدہ کی تعلیم نہ دینا اسکی خوبی ہے۔ نقص نہیں ہیں۔ میں تو بحیثیت ایک مسلمان کے اس پر فخر کرتا ہوں آپکو میں خیال کرتا ہوں۔ شاید اس بات پر ناز ہے کہ

خونِ مسیح سے دُنیا میں گناہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ خوبی کی بات ہے

اور ہر قسم کی بد اخلاقی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ چار کے پیالوں اور چون پر بھی "مجھے نہ بھولئے" اور ایک بوسہ دیجئے کے فقرے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

میرے اس کہنے پر اکثر سامعین ہنس پڑے۔ اور ایک نے تو پادری صاحب کو کہہ ہی دیا۔ کہ آپ کیوں اس مسلم جنٹلمین سے مباحثہ کرتے ہیں جبکہ آپ جواب نہیں دے سکتے ہیں نے انکو مخاطب کر کے کہا۔ یہ مباحثہ نہیں ہم تو تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ اور پادری صاحب گناہ کی بشارت دیتے ہیں۔ (اس فقرے پر پھر لوگ ہنس پڑے)

پادری۔ جناب! اب آپ سنجیدہ نہیں ہے۔ آپ مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔

عرفانی۔ اعوذ باللہ ان اکون من الجاہلین میں آپ سے ہرگز ٹھٹھا نہیں کرتا۔ بلکہ واقعات پیش کرتا ہوں۔ اگر میں صحیح نہیں کہتا تو آپ اپنے ان دوستوں سے پوچھ لیجئے۔ جو کم از کم

شیطان کیساتھ انصاف

کرنے کی ضرب المثل کو جانتے ہیں (لوگ پھر ہنس پڑے)

پادری۔ میں تو یہ کہوں گا کہ مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ یہ گفتگو جاری رہے تو آپکو بہت سنجیدہ ہونا چاہیے۔

عرفانی۔ میں اس دلچسپ گفتگو کو بڑے شوق سے جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اور اگر سنجیدگی سے آپکی یہ مراد ہے۔ کہ میں ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسری پھیر دوں۔ تو اسکا نمونہ آپکو ضرورت کیوقت دکھانا چاہیئے۔ اور اگر سنجیدگی سے مراد معقول بات کہنا ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ میں بہت سنجیدہ ہوں۔

پادری۔ نہیں میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہم گفتگو میں معقولیت کا پہلو نہ چھوڑیں۔

عرفانی۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں اور آپ سے اتفاق۔ آپ ہی میرا فیصلہ کریں۔ کہ کیا آپ نے میرے سوال کا معقول جواب دیا ہے۔

پادری۔ بے شک۔ بے شک۔

عرفانی۔ شاید مجھے غلطی لگی ہو۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ آپ کے ہم مذہب دوستوں سے پوچھ لوں۔ کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

پادری۔ میرا مقدمہ جوری کے سامنے نہیں۔ اور میں اپنے آپکو جوری کے رحم پر نہیں چھوڑنا چاہتا

عرفانی۔ آپ اپنی جوری پر اعتماد کریں۔ وہ سب شریف اور معقول آدمی ہیں۔ اور آپ کے ہم مذہب اور ہم وطن بھی۔ میں خود بھی غریب الوطن ہوں۔ اور میرے مذہب سے بھی الگ وہ دور ہیں لیکن میں انپر اعتماد کرتا ہوں۔

ایک جنٹلمین۔ پادری صاحب اس پیالہ کو پینا نہیں چاہتے۔ اور وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یہ پیالہ ٹل جائے۔

پادری صاحب۔ دیکھئے صاحب۔ خدا ٹھٹھوں میں نہیں اڑایا جاتا۔

وہی جنٹلمین۔ بالکل درست ہے۔ مگر آپ تو خدا کے ایک عاجز بندے ہیں۔ آپ ایسا دعوےٰ کیوں کرتے ہیں۔

پادری صاحب۔ میں تو خدا ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتا۔ خدا کے کلام سے ہنسی کرنا بھی خدا سے ہنسی کرنا ہوتا ہے۔

وہی جنٹلمین۔ مقدس جناب! اگر آپ جیسے لوگ عیسائی مذہب کے وکیل ہوں۔ تو کوئی عقلمند اسے قبول نہیں کر سکتا۔ کیا آپ اسی علم سے پرشیا کو عیسائی بنانے کا کام کر رہے ہیں۔

پادری صاحب۔ معاف کیجئے میں جواب نہیں دوں گا۔

میں نے دیکھا کہ اب پادری صاحب کچھ کھسیانے سے ہوگئے ہیں۔ اور وقت بھی کچھ زیادہ ہوگیا تھا میں نے کہا بہتر ہے پادری صاحب پھر کل تبادلہ خیالات کریں گے۔ یارات کی چاندنی میں اچھا موقعہ ہوگا۔ اور امید کرتا ہوں کہ ہمارا سفر نہایت دلچسپ ہوگا۔ پادری صاحب نے بھی اسے غنیمت سمجھا۔ اور وہ تشریف لیگئے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے اب راہ و رسم پیدا کی۔ اور مناسب معرفت کی راہ نکالی۔

جرمن پادری کا آیندہ ہیڈ کوارٹر حیفہ ہوگا۔ (بہائی تحریک)

شام کے قریب پھر جرمن پادری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت کوئی مذہبی گفتگو نہیں ہوئی۔ بلکہ میرے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ اب وہ حیفہ میں کام کرے گا۔ حیفہ کا نام سن کر مجھے طبعی طور پر حیفہ اور اپنی گذشتہ سال کی دلچسپیوں کا قصہ یاد آگیا جبکہ میں شوقی آفندی کے گھر گیا تھا۔ اور آخر یل اور اپنے پیارے قافلہ سے بچھڑ گیا تھا۔ میں نے پادری صاحب سے پوچھا کہ ایران میں بہائی تحریک کا کیا حال ہے۔ پادری صاحب نے کہا کہ ایران بہائی تحریک کا مولد

ضرور ہے لیکن اس تحریک کو کوئی کامیابی وہاں حاصل نہیں۔ اب بھی بعض لوگ اس خیال کے پائے جاتے ہیں پادری نے یہ بھی کہا کہ یہ مذہبی تحریک نہیں ہے۔ ہمیشہ سے ایک سیاسی تحریک سمجھی گئی ہے۔ گو اس کے ماننے والے اسے مذہب سمجھتے ہیں۔ اور عالمگیر اخوت کے مدعی ہیں۔

میں نے اسکو حیفہ اور عکہ کے اپنے تجربے بتائے۔ اور اس سے پوچھا کہ کیا آپ کی بہائیوں سے کبھی اعتقادات پر گفتگو ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ ان سے مذہبی مباحثہ کبھی نہیں ہوا۔ وہ عیسویت کے کسی اصول کی تردید یا اس کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ انکی برادری میں ایک شخص عیسائی ہوکر اور رہکر بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اختلاف مذہب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے انکو مذہبی مناظرات سے نجات حاصل ہے۔

میرے دریافت کرنے پر کہ ایران میں بہائیت کا اثر غالب ہوگا یا نہیں۔ اس نے کہا۔ کہ ایران پر شیعی اثر اس قدر ہے کہ وہ کسی دوسرے اثر کو قبول نہیں کرتے۔ ہمارا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ ایران یا تو شیعہ رہیگا۔ اور یہ بہت اغلب ہے کہ وہ سیاسی تحریکوں میں مذہب کو چھوڑ کر ترکی کے طریق عمل کو اختیار کرے۔ اور اگر ایسا ہوا تو عیسائیوں کو کامیاب ہو جانے کی بہت بڑی امید ہے۔ اور عیسائی مشن وہاں بہت جوش سے کام بھی کر رہے ہیں۔

فارسی میں کافی لٹریچر ان کے لئے مہیا کیا گیا ہے۔ ایران کے بڑے بڑے شہروں میں مشن قائم ہیں۔

اور ایرانی دلچسپی سے عیسائی لٹریچر کو پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ ایرانی عیسائی بھی ہوتے ہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ ہاں بعض لوگ عیسائی ہو رہے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پہلے مخالفت عام ہوتی تھی۔ عیسائی مشنوں کی کامیابی اس قدر ہو چکی ہے کہ ویسی مخالفت نہیں رہی میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ کہ عیسائی مشنوں کی اس قدر کامیابی کا ذریعہ مشنوں کا تعلیمی اور طبّی کام ہے۔ جسکی وجہ سے لوگ عام ہمدردی کا احساس کرتے ہیں۔ اور اس سے دلچسپی لینے لگے ہیں۔

نوجوانوں میں مذہب کیطرف سے آزادی اور بے پروائی تو ظاہر کیجاتی ہے مگر قومیت اور ایران پرستی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔

جہاز پر قوالی کا لطف

جہاز پر جو رومن کیتھولک زائرین جا رہے ہیں۔ انہوں نے جہاز کے خلاصیوں سے ملکر حجرہ کرائے کر لئے ہیں۔ اور ان میں انہوں نے اپنا ڈیرہ ڈالدیا۔ شام کا کھانا کھا کر میں مغرب اور عشا کی نماز پڑھکر اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ کہ یکایک مجھے دلکش ترانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ موسیقی قدرتی طور پر جاذب قلوب ہے۔ میں اُٹھا اور جدھر سے آوازیں آرہی تھیں اس طرف چلا۔ تھوڑی دور جاکر ایک سیڑھی سے اتر کر نیچے گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ زائرین پوپ کا ایک قافلہ بڑے سرور و ترنگ میں گا رہا ہے۔ اور ایک اٹالین اپنا ساز بجا رہا ہے۔ اس قافلے میں دو تین پادری (جو بالکل شانخ معلوم ہوتے تھے) بھی شریک تھے۔ اور سب سے زیادہ سرور و طرب میں وہی تھے۔ شراب کی بوتلیں کھلی ہوئی تھیں۔ جام پر جام اُڑتا تھا۔ اور انکی مستی میں وہ ایسے سوز اور شوق سے گا رہے تھے۔ کہ

قوالی کا لطف آتا تھا

انہیں سے ایک صاحب جنکو میں نے اوّلاً مسلمان سمجھا تھا۔ مجھے پہچانتے تھے۔ اور جہاز پر ان سے واقفیت ہو چکی تھی۔ انہوں نے مجھے بڑی محبّت سے آگے بلایا۔ اور نہایت عزت و اکرام سے میرے لئے جگہ بنائی گئی۔ میں بھی ہمہ شوق اس محفل میں حضرت مولانا کا ہم نوا ہوتے ہوئے

جفت خوشحالان و بدحالان شدم	من بہر جمعیتے نالاں شدم
وز درون من نجست اسرار من	ہر کسے از ظن خود شد یار من

وہاں جا بیٹھا۔ مجھے دیکھکر پادری صاحبان کی ترنگ بڑھ گئی۔ پھر تو انہوں نے اپنے کمال کا پورا نمونہ دکھایا۔ میں انکی زبان تو سمجھتا نہ تھا۔ وہ اٹالین گانا گا رہے تھے۔ مگر انکی آواز کے زیر و بم سے لطف اُٹھا رہا تھا۔ جو کچھ وہ گا رہے تھے وہ مذہبی گیت تھے۔ اور جس طرح پر صوفی ذکر جہر کرتے ہیں۔ اس طرح پر وہ ایک قسم کا ذکر تھا۔ اور وہ اپنی آواز اور سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک مستی کی کیفیت پیدا کرتے تھے۔ قریبا ایک گھنٹہ ٹھیک تک یہ محفل جاری رہی میں نے اس کے بعد شکستہ عربی میں انکا شکریہ ادا کیا۔ اور شام بخیر کہکر اُٹھ آیا۔ آج میں نے اٹالین زبان میں گوڈ نائٹ کہنا سیکھ لیا۔ اور یہ بونا نوتے ہے۔ وہاں سے نکلا تو ٹھنڈی ہوا شروع ہو گئی تھی۔ اور خوب ٹھنڈی تھی۔ اب مجھے کیبن کی قدر اور ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر میں اپنے بستر پر آیا۔ اور میں نے یہودی خاتون کو اشارہ کیا۔ کہ

میں چارج لینا چاہتا ہوں

اس نے جھٹ اپنے بچے کو کہا اور وہ دوڑ کر گرم پانی لے آیا۔ اور چند منٹ میں چارج کا دور شروع ہو گیا۔

جزیرہ کریٹ یا قریطش کے سامنے

میں یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ آج ہم جزیرہ کریٹ یا قریطش یا کانڈیا کے سامنے سے گذرے۔ اس جزیرہ کو دیکھ کر دل دردمند کو ایک اور ٹھوکر لگی۔ اس جزیرہ میں گیارہ سو برس کی اسلامی تاریخ کا تعلق ہے۔ اور سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ایک نشان کا تعلق بھی اس کے ساتھ ہے۔ جس کا ذکر میں آگے چلکر کروں گا۔

اس جزیرہ کی تاریخی حیثیت کے لحاظ سے اسلامی تعلقات اور واقعات کی ایک فلم میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگی۔ جب کہ دوسرے لوگ عرشہ جہاز سے اس کے مناظر اور فرسودہ کناروں کو دیکھتے تھے۔ میں انکی طرف دیکھتا تھا۔ اور حسرت زدہ دل کے ساتھ۔

اپنی گم شدہ متاع کے واپس لینے کے لئے دعا کرتا تھا

وہ سرزمین جہاں خدائے وحید کے پرستاروں نے اپنی جبین نیاز کو اپنے مولیٰ کے حضور رکھا تھا اور جہاں سے اللہ اکبر کی صداؤں نے سمندری موجوں پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ آج وہاں کی حالت دگرگوں ہو اور اسلامی عظمت و جلال ان کھنڈرات میں دفن ہے۔

جغرافیائی حالت

اس جزیرہ کا نام انگریزی جغرافیہ میں کریٹ یا کانڈیا لکھا ہے۔ اور کانڈیا ہی اسلامی گذشتہ شان و شوکت کا ایک تاریخی ثبوت ہے۔ یہ لفظ یورپی زبانوں سے مشتق نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ عربی لفظ خندق سے بگڑا ہوا ہے۔ یورپی لب لہجہ نے خندق کو پورے طور پر ادا کرنے کی ناقابلیت کے باعث خندق کو کانڈک پکارا۔ اور پھر

کانڈک سے بگڑ کر کانڈیا ہو گیا

ادھر زمانہ کے ہیر پھیر کو دیکھیے۔ کہ مسلمان جغرافیہ دان اپنے نام کو بھول گئے۔ اور خندق اپنے دئیے ہوئے نام کو فراموش کر کے اب عربی جغرافیوں اور نقشوں میں بجائے خندق کے قندیہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور اس طرح پر انہوں نے گویا ایک یورپی لفظ کو معرب بنا لیا۔ بے شک عربوں نے کریٹ کو معرب بنایا تھا اور وہ اسے قریطیہ۔ قریطش یا اقریطش کہتے تھے۔ اور اسکا قدیمی نام کریٹ ہی تھا۔ عربوں نے اسکو خندق کے

نام سے ۸۲۵ء ہو یا ۸۲۵ء میں موسوم کیا جب کہ انہوں نے اسے فتح کرکے اس کے شمالی ساحل پر خندق نام ایک شہر آباد کیا۔ اور وہ اپنی شہرت میں اس قدر بڑھا کہ لوگ اس جزیرہ ہی کو خندق کہنے لگے۔

یہ جزیرہ مجمع الجزائر یونان کے یونانی ساحل پر ہے۔ اس طرح پر یہ گویا یورپ کا جنوبی نقطہ ہے۔ ایشیاکوچک سے صرف ۱۱۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور اس لحاظ سے یورپ اور ایشیا کے درمیان ملانے والی کڑی ہے۔

اس کا دور ۶۰۰ میل سے کچھ کم نہیں۔ طول ۱۱۰ میل اور عرض عام طور پر ۲۴ میل اور بعض تنگ مقامات پر ۱۰ اور ۶ میل تک بھی ہے۔

عام طور پر اس جزیرہ کی سطح کوہستانی ہے۔ اور یہ سلسلہ کوہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا جزیرہ کے وسط میں سب سے زیادہ اونچا پہاڑ کوہ ایڈا (عیدا) ہے۔ جو ۶۰۰۰ فیٹ سے کم اونچا نہیں۔ باوجودیکہ یہ کوہستانی جزیرہ ہے۔ لیکن زمین زرخیز ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی نہروں اور ندیوں سے جزیرہ شاداب اور سرسبز ہے۔ زیتون کے درخت اپنی سرسبزی کی بہار دکھاتے ہیں۔ اور میوہ جات بکثرت ہوتے ہیں۔

انگور، نارنگی، لیموں، کشمش، بادام۔ بافراط پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری پیداوار بھی بہت ہے۔ آب وہوا خوشگوار، فرحت بخش اور صحت افزا ہے۔

کریٹش کی تاریخی عظمت

جزیرہ کریٹ کی ابتدائی تاریخ۔ یونان کی ابتدائی تاریخ کی طرح آسان نہیں ہے یونانی اصنام پرستی کی تاریخ اپنے اندر جس قسم کی دلچسپیاں رکھتی ہے۔ اس کے بیان کرنے کا یہاں موقعہ نہیں۔ مگر اہل کریٹ بھی اپنی ابتدائی تاریخ اسی قسم کے افسانوں اور اصنام پرستی کے کارناموں میں مرقوم سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ یونانیوں سے بھی آگے چلتے ہیں۔

اہل یونان کی مائی تھالوجی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس پہاڑی پر کاریبی منیز (قرنطوس) نے یونانیوں کے مشہور ومعروف دیوتا جوپیٹر کو درس ہدایت دیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ طب یونانی کی ابتدائی اصول اس جزیرہ کی ایجاد ہیں۔ افیتمون (اکاس بیل) جو عموماً ہندوستان میں بیری کے درختوں پر ہوتی ہے ایک مشہور دوائی ہے۔ اسکے خواص کو سب سے اوّل اس جزیرہ کے رہنے والوں نے دریافت کیا تھا۔

غرض تاریخ قدیم نے اس جزیرہ کے رہنے والوں کے علم وفضل کی موید ومظہر ہے۔ میں مشاہدات کے پڑھنے والوں کو یونانی مائی تھیالوجی اور اس جزیرہ کے متعلق قدیم روایات کی بھول بھلیوں میں لے جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ انہیں بہت قریب لے آنا چاہتا ہوں۔ اور اسلامی تاریخ کے شروع سے بعض ضروری حالات دیدینا پسند کرتا ہوں۔

آخری دور حکومت اس جزیرہ میں وینیشین (اہل وینس) کا تھا۔ اس عہد حکومت میں لوگ پورے امن اور سکون سے رہتے تھے۔ اور کسی سے کسی قسم کی پرخاش نہ تھی۔ ہمسایہ اقوام سے بھی تعلقات اچھے اور درست تھے۔ مگر اسلامی تاریخ کے آغاز کیوقت اس جزیرہ پر رومیوں یا اہل اٹلی کا قبضہ تھا۔ اور مسلمانوں نے اوّل ہی اوّل اس جزیرہ کو ر

رومیوں ہی کے ہاتھوں سے فتح کیا تھا

اسلامی تاریخ جزیرہ کریٹ میں

جزیرہ کریٹ میں اسلامی تاریخ کی ابتدا ۲۳ھ یا ۲۵ھ ہجری سے ہوئی ہے۔ جبکہ حضرت امیر معاویہ سربرآرائے سلطنت اسلامی تھے۔

اسلامی فتوحات کی بنیاد اس جزیرہ میں امیر معاویہ کے جرنیل جنادہ ابن ابی امیہ نے رکھی۔ امیر معاویہ کے عہد میں مشرق میں فتوحات کا سلسلہ نہیں ہوا۔ بلکہ مشرق کے بعض صوبوں میں جہاں جہاں بغاوت ہوئی اُسے فرو کیا۔ ہاں امیر معاویہ کی توجہ زیادہ تر رومیوں کیطرف مصروف رہی انکی وجہ یہ تھی۔ کہ رومی سلطنت ابھی تک زوروں پر تھی۔ اور اپنی قوت اور شوکت کے لحاظ سے ممتاز اسلئے انکی توجہ اسی طرف تھی۔ چنانچہ جنادہ ابن ابی امیہ نے اس جزیرہ پر فوج کشی کی۔ اور ۲۳ھ میں عربوں نے اس کے کچھ حصہ کو چھین لیا۔ اور پھر ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں بھی جزیرہ مذکور کا ایک حصہ فتح ہوا۔ پھر ہارون رشید کے زمانہ میں حمید بن میغوف نے جو انکی بحری فوج کا سپہ سالار تھا۔ کریٹ پر حملہ کیا۔ اور اس کے بعض حصّوں پر قابض ومتصرف ہوگیا۔ اس کے بعد مامون رشید کے جنرل ابوحفص اندلسی نے حملہ کیا۔ اور فتح کے بعد پہلے اس نے ایک قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ پھر بتدریج جوانمردی اور دلاوری سے معرکہ آرائیاں کرکے فتوحات حاصل کیں۔ اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ۸۲۵ء میں اہل اسلام نے جزیرہ کریٹ کو پورے طور پر فتح کرکے اس پر قابض ہوگئے۔ اور اس کے تمام قلعے برباد ومسمار کردئے۔ اور عرصہ دراز تک مسلمانوں نے اس پر اپنا قبضہ رکھا۔ ان ایام میں یہ جزیرہ بحیرہ روم میں مسلمانوں کا بحری مرکز تھا۔

عباسی خلیفہ مطیع اللہ کے عہدِ حکومت میں تغفور ابن فقاس نے اس جزیرہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد سنہ ۳۴۹ھ ۹۶۱ء میں ارمانوس بن قسطنطین نے بہتر ہزار فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ اور ایک سال تک محاصرہ کئے پڑا رہا۔ اور بزورِ شمشیر فتح کر لیا۔ اور عبدالعزیز شعیب کو جو خلیفہ کی طرف سے یہاں کا گورنر تھا۔ اور مامون رشید کے جنرل ابو حفص اندلسی کی اولاد میں تھا گرفتار کر کے اس جزیرہ میں قتلِ عام کر دیا۔ قلعہ کو برباد ومسمار کر کے اس کے پتھر سمندر میں ڈال دئے۔ جب ارمانوس اس جزیرہ کو فتح کر کے واپس قسطنطنیہ گیا۔ تو مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے تین سو جہاز اس کے ساتھ تھے۔

سنہ ۱۲۱۰ھ میں وینس کی جمہوری سلطنت کے ہاتھ اسکو فروخت کیا گیا۔ اور سنہ ۱۳۶۴ء میں ایک بڑا بھاری غدر ہوا۔ جو بہت کشت وخون کے بعد فرو ہوا۔ پھر سنہ ۱۶۴۵ء میں ترکوں کا بڑی بہادری سے ۲۴ برس کے متواتر حملوں اور محاصروں کے بعد جنمیں دو لاکھ سے زیادہ آدمی طرفین کے قتل ہوئے سنہ ۱۶۶۷ء مطابق سنہ ۱۰۸۰ھ میں

تمام جزیرے پر پھر اسلامی قبضہ ہو گیا

اسوقت سلطان محمد خاں رابع کا عہدِ حکومت بڑے عروج پر تھا۔ اس وقت سے بار دیگر اس جزیرہ پر اسلامی قبضہ ہوا۔ اور یہ ترکوں کے قبضہ میں آیا۔ اس فتح کے بعد یہاں کے باشندوں میں سے بہت بڑی جماعت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس سے پہلے یہاں اسلام کا نشوونما بہ حیثیت ایک تبلیغی مذہب کے نہیں ہوا تھا۔ نا قابلِ ذکر تبدیلی ہوئی تو کیا اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا جاتا۔ تو کریٹ سارے کا سارا بہت صدیاں پیشتر مسلمان ہو گیا ہوتا یہ قدرتی امر تھا کہ جب باشندوں کے بہت بڑے حصہ نے اسلام قبول کر لیا۔ تو انہوں نے حکومت میں خاص اقتدار اور اثر اور حصہ لے لیا۔ ترکوں کیلئے یہ ایام نہایت ابتلا اور مصیبت کے ایام تھے محمد خاں رابعہ ابھی شیر خوار بچہ تھا۔ احمد پاشا پسر کو برلی محمد وزیر اعظم اور در اصل عملاً حکمران بادشاہ تھا۔ یورپ والوں سے متواتر جنگ، ٹرکی مختلف زلازل کیوجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔ اور مرض طاعون کا بھی حملہ ہوا۔

اسی زمانہ میں ایک یہودی مسیح ابن مریم ہونے کا اور ایک مسلمان نے مہدی موعود ہونے کا اعلان کر دیا۔ بہر حال ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر نئے حاکموں کو وہاں کے شورہ پشت باشندوں نے

چین نہ لینے دیا۔ آئے دن بغاوتیں ہوتی ہتیں۔ یونانی جو ترکوں کے زیر حکومت تھے۔ وہ ہر وقت فساد کرتے اور کریٹ والے کوہستانی باغیوں کے سہارے اور آسرے پر آگ لگائے رکھتے۔ ۱۸۳۰ء تک یہی حالت رہی۔ اور آخر ایسی بغاوت ہوئی کہ ترکی کے مدبروں اور بہادروں کی طاقت سے باہر ہوگئی۔

اتحادی مداخلت آخر جب یہ بغاوت فرو نہ ہوئی تو اتحادی مداخلت لازمی ہوگئی۔ انگلستان فرانس۔ اور روس۔ جو اسوقت کا مشہور اتحاد ثلاثہ تھا بیچ میں آکودا۔ اور کریٹ کی حکومت خدیو محمد علی پاشا۔ خدیو مصر کے حوالہ کردی۔ اس عرصہ میں کچھ امن وامان قائم ہوگیا۔ اور حالت سنبھل چلی تھی۔ کہ پھر ادہر اُدھر کی ریشہ دوانیوں نے کریٹ ترکوں کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور ۱۸۴۰ء میں دوبارہ ترکوں کو ملا۔ اور اسی سال پھر بغاوت ہوئی۔ اور ۱۸۴۱ء میں فرو ہوئی۔ اب یہاں کے طریق حکومت میں اصلاحیں اور مراعات ملنے لگیں اور بہترین حکومت ہوگئی۔ ۱۸ سال تک ترکوں کے زیر سلطنت اہل کریٹ نے ترقی کی اور اپنی حالت کو درست کرلیا۔ ترکی حکومت بھی اس وقت عہد شباب پر تھی۔ اور اس کے اوج وعروج کے ایام تھے۔ بحیرہ روم کے چاروں طرف کے ملک ان کے قبضہ میں تھے۔ یورپ ایشیاء۔ افریقہ۔ کے اکثر حلقے ان کے قبضہ میں تھے۔ خود یونان ٹرکی کا ایک صوبہ تھا جسکو ۱۸۲۹ء میں ترکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ اسکا اثر کریٹ پر لازمی تھا۔ اور یونان محسن کشی کرکے انکی مدد کرنے لگا تاکہ کریٹ کو اپنے ساتھ ملالے۔ ان سازشوں اور شورشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۹ء میں پھر بغاوت ہوکر اور کشت وخون پر اسکا خاتمہ ہوا۔ اور لگاتار یہ سلسلہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جاری رہا۔ مسلمانوں نے اس سے غفلت برتی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۶ء میں بغاوتوں کا ایسا فتنہ پیدا ہوا کہ تین سال تک چلا گیا۔ مسلمانوں پر ایسے مظالم ہوئے کہ کوئی مورخ ایسا نہیں جس نے ان بدعنوانیوں اور مظالم پر اظہار جوش نہ کیا ہو۔ یونانی حکومت نے اب کھلم کھلا حصہ لینا شروع کر دیا۔ غرض یہ بغاوتوں اور مخالفتوں کا سلسلہ جو پہلے صرف کریٹ سے تھا۔ اب یونان کی شمولیت سے اور بھی تیز ہوگیا۔ مگر ۱۸۶۸ء میں اسے ترکوں نے فرو کر دیا اور کریٹ میں داخل یونانیوں کو نکال دیا۔ اور اس طرح پر ۱۸۸۹ء تک امن رہا۔ پھر نئی بغاوت ہوئی۔ مگر یورپی سلطنتوں نے مداخلت کرکے ترکوں سے اہل کریٹ کو بہت سی مراعات دلادیں۔ مگر یہ کفران نعمت قوم پھر بغاوت پر آمادہ ہوئی۔ اور محمد علی پاشا نے اسے فرو کیا۔ آخر ۱۸۹۶ء میں ہوم رول کا مطالبہ کیا۔ اور حضور سلطان نے کریٹ کا مطالبہ تسلیم کرکے ہوم رول دیدیا۔ مگر ۱۸۹۷ء میں انکی

ناقابلیت ثابت ہوگئی جب کہ فساد کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ اور یورپ کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے کا یورپ کے اخبار نویسوں نے عمدہ موقعہ پایا۔ ترک جس قدر رحم کرتے اور مراعات دیتے اتنے ہی بدنام ہوتے رہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ

زبردست اسلامی قوت کمزور اور بیمار ہوگئی

۱۸۹۵ء میں پھر بغاوت ہوئی اور نہایت خطرناک اور وحشیانہ تھی۔ مسلمانوں پر جو مظالم کئے گئے انکے بیان سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں، مردوں کے کان۔ اور ناک کاٹ ڈالے ہیں ان ایام میں امرت سر میں اخبار فیروز کا ایڈیٹر تھا۔ لارڈ کرزن اس وقت فارن سیکرٹری تھے۔ انہوں نے ہوس آف کامنز میں اعتراف کیا تھا۔ کہ

کریٹ کے مسلمانوں پر بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسی سبب سے ہندوستان مصر۔ جرمنی اور دیگر ممالک سے ان بدنصیب مسلمانوں کے لئے چندے جمع کئے گئے

یہ بغاوت ۱۸۹۵ء کے آخیر میں شروع ہوئی۔ اور ۱۸۹۶ء میں اسکا بہت جوش رہا۔ اور آخر فرو کیا گیا مگر دول یورپ نے پھر مزید تجاویز کیں۔ جو ۲۵ اگست ۱۸۹۶ء کو باب عالی نے منظور کرلیں۔ اور کریٹ کا پہلا عیسائی گورنر مقرر ہوگیا۔ کاش یہ جدید انتظام بھی امن کا کفیل ہوتا۔ بعض تو مسلمانوں کا وہاں رہنا ناگوار تھا۔ اور ہر طرح سے انکو تکلیف دیجاتی رہی۔ یہاں تک کہ آخر پادریوں نے عام لیکچروں کے ذریعہ یہ تعلیم دینی شروع کی

کہ مسلمانوں کو ہر طرح سے تکلیف دیجاوے

کریٹ کی داستان ایک خونی داستان اور مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کی کہانی ہے کہ کس طرح حکمران ہو کر بھی وہ تکلیف اٹھاتے رہے۔ آخر کریٹ کے باشندوں نے دل دوز عرضداشت گورنر جزیرہ کو دی۔ اور اسکی ایک ایک نقل یورپی دول کے کانسلوں کے پاس بھی بھیجی گئی۔ یہ عرضداشت مسلمانوں کی ہلاکت و فلاکت کا ایک نقشہ اور تاریخی دستاویز ہے۔ مگر اس عرضداشت کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو ایسے موقعہ پر

خلاف توقع ہونا چاہیے تھا

انصاف اور عدالت کا خون کر دیا گیا۔ اور مظلوموں کی آہ و فغاں بے اثر ثابت ہوئی۔ اور ایک عام بغاوت ۱۸۹۶ء میں ہوگئی۔ اور اسکا سلسلہ بڑھتا ہوا گیا۔ اور مختلف قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اور

یہ ترکی زوال کے آثار تھے۔ رفتہ رفتہ ترکی اب سمٹ کر یورپ کے نقشہ میں بہت ہی۔

چھوٹا سا ملک رہ گیا

میں اسوقت ان ایام بغاوت کا نقشہ دکھانے کے لئے ایک ترکی جنرل کا خط درج کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جزیرہ کریٹ کے ایک ترکی جنرل کا خط

آگ لگے اس برچھ میں جو جل گئے سارے پات — تم کیوں جلتے پنچھیو جو پنکھ تمہارے ساتھ
پھل کھایا اس برچھ کا او بیٹ لوٹے پات — جینے کا یہ دھرم ہے کہ جلیں برچھ کے ساتھ

۲۱ رجولائی ۱۸۹۶ء کے المویدمیں مصطفےٰ بن محمد رشدی نے جو سلطانی فوج کا جنرل ہے۔ المویدکے نام ذیل کا خط لکھا۔

جناب اڈیٹر صاحب المویدآپ کا اخبار اسلامی دنیا میں چھپتا ہے۔ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی جن کی رنگ اور زبان میں اختلاف ہے حمایت کرتا ہے۔ اس لئے میں بھی آپ کے اخبار کے ذریعہ سے اپنے پیارے وطن جزیرہ قریطش کے حقوق کی شکایت کرتا ہوں۔ جو نہایت بیدردی سے پامال ہو رہا ہے۔ میں جزیرہ قریطش کا باشندہ ہوں۔ میری ولادت اور پرورش اسی جزیرہ میں ہوئی ہے۔ اس جزیرہ کی زمین میرے آباؤ اجداد کے خون سے تر ہے۔ میں نے آجکل کے اخباروں میں پڑھا ہے۔ کہ باب عالی نے قریطش کے عیسائیوں کے ساتھ ان کی درخواست اور خواہش کے موافق بہت ہی خاص رعایتیں کی ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے پیشتر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہا چکے ہیں۔ شہروں اور قریوں کو آگ لگا چکے ہیں۔ وہ تمام ملک میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ عموماً سلاطین یورپ کی اور خصوصاً یونان کی مدد سے ان وحشیانہ افعال کے کرنے پر وہ دلیر اور بے باک ہیں۔ افسوس ہے یورپ کی نظر میں وہ ظلم وستم نہیں کھٹکتے۔ جو جزیرہ کے عیسائی اپنے ہم وطن مسلمانوں پر کرتے ہیں میں نہیں جانتا کہ وہ کونسی شریعت ہے۔ جو سلاطین یورپ کی نظر میں مسلمانوں کے خون کو جائز کرتی ہے۔ اور وہ باب عالی پر زور ڈالتے ہیں۔ کہ جزیرہ کے باغیوں اور فتنہ پردازوں کو معاف کیا جائے۔ گویا سلاطین یورپ کے نزدیک مسلمانوں کے خون کی کچھ بھی قدر وقیمت نہیں۔ وہ اس پر بھی بس نہیں کرتے۔ بلکہ چاہتے ہیں کہ سلطان کی گورنمنٹ خاص رعایتیں اور خاص حقوق عطا کرے۔ جنہے جزیرے کے باشندوں کا ایک فریق یعنی

عیسائی متمتع ہوں۔ اور دوسرا فریق یعنے وہاں کے بدقسمت مسلمان محروم رہیں۔ تاکہ اُس کے بعد مسلمانوں کی جانیں اور جائیدادیں ظلم وستم کے تیروں کا نشانہ ہوں۔ اور ہیومینٹی (انسانیت) اور انصاف پسند شریعتوں نے مساوات کے جو حقوق انکو عطا کئے ہیں۔ وہ سب ان سے چھن جائیں۔ انجیل مقدس۔ توریت۔ زبور یا اور کسی آسمانی کتاب نے یورپ کو سکھایا ہے۔ کہ وہ ایک ہی وطن کے باشندوں میں ایسا حکم جاری کریں۔ شاید باب عالی نے اپنی آنکھوں سے وہ مصیبتیں اور تکلیفیں نہیں دیکھیں۔ جو قریلیش کے مسلمان برابر جھیل رہے ہیں۔ ورنہ مسلمان فاتحوں اور دلیروں کا خون جو پانی کیطرح بہایا گیا ہے اور دولت عثمانیہ نے ۳۰ برس کے عرصہ میں جو بے شمار روپیہ خرچ کیا ہے۔ انکی نظر میں کیونکر چھپ سکتا ہے۔ خدا کی قسم یہ مصیبت نہایت عظیم الشان مصیبت ہے۔ جس نے تاریخ کے چہرہ کو سیاہ کر دیا ہے۔ افسوس اس رسوائی اور فضیحت پر۔ افسوس اس ننگ و عار پر۔ افسوس اس غرور پر۔ افسوس اس جوانمردی پر!!!

اے انسان۔ اے نوع انسان جزیرہ قریلیش میں مسلمانوں کی قوم پر جو مصیبت نازل ہوئی۔ کیا کوئی دیکھی یا سنی ہے! یا دنیا کی تاریخ میں پڑھی ہے۔ کہ ایسی مصیبت کسی اور قوم پر نازل ہوئی۔ جزیرہ کی سرزمین پر مسلمانوں کا خون بہایا جاتا ہے۔ اُن کی تمام دولت لٹ رہی ہے۔ اُن سے تمام جائیدادیں چھن رہی ہیں۔ یا جلائی جاتی ہیں۔ اُنکی راحت اور آسائش معدوم ہے۔ پھر ان سب کا معاوضہ یہ ہے کہ مجرموں کو معاف کیا جاتا ہے۔ اور اُن کی مصلحت کو بدقسمت مسلمانوں کی مصلحت پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

اے وسیع اور شاداب جزیرے۔ تجھ کو سلام ہے۔ اے پیارے وطن تجھ کو سلام ہے۔ اے پیارے جزیرے تجھ کو اس دوست کا سلام ہے۔ جس کے آباؤ اجداد کا خون اپنے وطن اور قوم کی حمایت میں بہایا گیا ہے۔ پیارے قریلیش تم کو اس عاشق کا سلام ہے۔ جو تیری ہوا اور مٹی کے سونگھنے کا ہمیشہ سے مشتاق ہے۔ اے پیارے جزیرے۔ اے پیارے وطن۔ اے پیارے قریلیش۔ اے ہمارے محب۔ اے ہمارے دوست۔ اے ہمارے وطن۔ اے پیارے وطن ہم خدا سے دعا کرتے ہیں۔ کہ خدا تجھ کو ظالم اور بدکار دشمنوں کے پنجے سے چھڑا لئے۔ اے میرے ہموطنو اے میرے دوستو۔ تم جو باغیوں اور فتنہ پردازوں کے ہاتھ سے سخت مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو۔ ہم خدا کے ذریعہ سے یا اس تحریر کے ذریعہ سے تمہاری ماتم پرسی کرتے ہیں۔ اور اے قریلیش ہم تیری عیادت کرتے ہیں۔ اور ہم

تجھکو خدا کے سپرد کر کے دیکھتے ہیں کہ دول یورپ تیری قسمت کا فیصلہ کیا کرتے ہیں جس کے ہم منتظر ہیں

سلسلہ احمدیہ اور جزیرہ کریٹ

مشاہدات کے پڑھنے والوں کو شاید تعجب ہوگا۔ کہ جزیرہ کریٹ کے ساتھ سلسلہ عالیہ احمدیہ کا تعلق ایک بیجوڑ سی بات ہے مگر عرفانی اپنے نقطہ نظر سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ جزیرہ کریٹ کی اس بغاوت اور فساد کے ذریعہ ایک بہت بڑی پیشگوئی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پوری ہوئی۔ کریٹ کی بغاوت سے جو جنگ ٹرکی اور یونان سے کرنا پڑا۔ اور اس سلسلہ میں کریٹ کے مہاجرین اور مجروحین کے لئے ہندوستان سے ایک معقول رقم چندہ کی بھیجی گئی حسین کامی ہندوستان میں ٹرکی کا وائس قونصل تھا۔ وہ قادیان آیا تھا۔ اور یہاں سے جانے کے بعد اس نے سب وشتم کیا۔ اس موقعہ پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک اشتہار شائع کرکے حکومت ٹرکی کے متعلق ایک پیشگوئی کی تھی۔ جو حسین کامی پر بھی پوری ہوئی۔ اور اس کے بعد ٹرکی کی جو حالت ہوئی۔ اور جو انقلابات ہوئے۔ وہ سب اسی پیشگوئی کا ظہور ہیں میں مشاہدات کے پڑھنے والوں کیلئے اس اشتہار کو جو اس پیشگوئی کے پورا ہونے پر شائع کیا گیا تھا۔ یہاں درج کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس سے مشاہدات کے حجم پر اثر پڑے گا۔ مگر اس تعلق کو واضح کرنے کے لئے اس کا اندراج ضروری سمجھتا ہوں۔

اشتہار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ایّھا الناس قد ظھرت آیات اللہ لتائیدی وتصدیقی وشھدلی شھداء اللہ من تحت ارجلکم ومن فوق رؤسکم ومن یمینکم ومن شمالکم ومن انفسکم ومن آفاقکم فھل فیکم رجل امین ومن المستبصرین۔ اتقوا اللہ ولا تکتموا شھادات عیونکم ولا تؤثروا الظنون علی الیقین، ولا تقدموا قصصاً غیر ثابتۃ علی مارئیتم باعینکم انکنتم متقین۔ واعلموا ان اللہ یعلم بما

فی صدورکم ونیاتکم ولا یخفی علیہ شیٔ من حسناتکم و
سیئاتکم وان اللہ علیم بما فی صدور العالمین۔ انکم رایتم آیات
اللہ فثم نبذتم دلائل الحق وراء ظھورکم واعرضتم عنھا
متعمدین۔ وقد کنتم منتظرین مجددا من قبل فاذا جاء داعی
اللہ فولیتم وجوھکم مستکبرین۔ اتنتظرون مجددا ھو
غیری وقد مر علی راس المائۃ من سنین۔ وقد ملئت
الارض جورًا وظلمًا وسبق مساجد اللہ ما یعبد فی دیور الضالین
ففکروا فی انفسکم اتجعلون رزقکم انکم تکذبون الصادقین
انکم کفانتم بسبح اللہ وآیاتہ وما کان لکم ان تتکلموا
فیہ وفیھا الا خائفین۔

رومی سلطنت کے ایک معزز عہدہ دار حسین کامی کی نسبت جو پیشگوئی اشتہار ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء۔ اور اشتہار ۲۵ جون ۱۸۹۷ء میں درج ہے۔ وہ کامل صفائی سے پوری ہوگئی

میں نے اپنے اشتہار ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء میں یہ پیشگوئی شائع کی تھی۔ کہ رومی سلطنت میں جس قدر لوگ ارکان دولت سمجھے جاتے ہیں۔ اور سلطنت کی طرف سے کچھ اختیار رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایسے لوگ بکثرت ہیں۔ جنکا چال چلن سلطنت کو مضر ہے۔ کیونکہ اُنکی عملی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس پیشگوئی کے لکھنے اور شائع کرنے کا باعث جیسا کہ میں نے اسی اشتہار ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء میں بہ تفصیل ذیل لکھا ہے یہ ہوا تھا۔ کہ ایک شخص مسمّی حسین بک کامی وائس قونصل مقیم کراچی قادیان میں میرے پاس آیا۔ جو اپنے تئیں سلطنت روم کی طرف سے سفیر ظاہر کرتا تھا۔ اور اپنی نسبت اور اپنے باپ کی نسبت یہ خیال رکھتا تھا۔ کہ گویا یہ دونوں اوّل درجے کے سلطنت کے خیر خواہ اور دیانت اور امانت میں دو نو مقدس وجود اور سراپا نیکی اور راستبازی اور تدیّن کا خمیر اپنے اندر رکھتے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ پرچہ اخبار ۱۵ مئی ۱۸۹۷ء ناظم الہند لاہور میں لکھا ہے۔ اس شخص کی ایسی ایسی لاف وگزاف سے لوگوں نے اس کو نائب حضرت سلطان روم سمجھا۔ اور یہ مشہور کیا گیا۔ کہ یہ بزرگوار محض اس غرض

سے لاہور وغیرہ نواح اس ملک میں تشریف لائے ہیں۔ کہ تا اس ملک کے غافلوں کو اپنی پاک زندگی کا نمونہ دکھلا دیں۔ اور تا لوگ ان کے مقدس اعمال کو دیکھ کر اُن کے نمونہ پر اپنے تئیں بنا دیں۔ اور اس تعریف میں یہاں تک اصرار کیا گیا تھا۔ کہ اسی ایڈیٹر ناظم الہند نے اپنے پرچہ مذکور یعنے ۱۵ مئی ۹۷ء کے پرچہ میں جھوٹ اور بے شرمی کی کچھ بھی پروا نہ کر کے یہ بھی شائع کر دیا تھا کہ یہ نائب خلیفۃ اللہ سلطان روم جو پاک باطنی اور دیانت اور امانت کیوجہ سے سراسر نور ہیں۔ یہ اس لئے قادیان میں بلائے گئے ہیں کہ تا رئیس قادیان اپنے افترا اس نائب الخلافت یعنے مظہر نور الٰہی کے ہاتھ پر توبہ کرے۔ اور آئندہ اپنے تئیں مسیح موعود ٹھہرانے سے باز آجائے۔ اور ایسا ہی اور بھی بعض اخباروں میں میری بدگوئی کو مدنظر رکھ کر اس قدر اس شخص کی تعریفیں کی گئیں۔ کہ قریب تھا کہ اس کو آسمان چہارم کا فرشتہ بنا دیتے لیکن جب وہ میرے پاس آیا۔ تو اسکی شکل دیکھنے سے ہی میری فراست نے یہ گواہی دی کہ یہ شخص امین اور دیانت دار اور پاک باطن نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی میرے خدا نے مجھ کو القا کیا۔ کہ رومی سلطنت انہی لوگوں کی شامت اعمال سے خطرہ میں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کہ جو علے حسب مراتب قرب سلطان سے کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ اور اس سلطنت کی نازک خدمات پر مامور ہیں۔ یہ اپنی خدمات کو دیانت سے ادا نہیں کرتے۔ اور سلطنت کے سچے خیرخواہ نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی طرح طرح کی خیانتوں سے اس اسلامی سلطنت کو جو حرمین شریفین کے محافظ اور مسلمانوں کے لئے مغتنمات میں سے ہے۔ کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ سو میں اس الہام کے بعد محض القاء الٰہی کیوجہ سے جبین بک کامی سے سخت بیزار ہو گیا۔ لیکن نہ رومی سلطنت کے بغض کیوجہ سے بلکہ محض اس کی خیرخواہی کیوجہ سے۔ پھر ایسا ہوا کہ ترک مذکور نے درخواست کی کہ میں خلوت میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ وہ مہمان تھا۔ اس لئے میرے دل نے اخلاقی حقوق کیوجہ سے جو تمام بنی نوع انسان کو حاصل ہیں۔ یہ نہ چاہا۔ کہ اس کی درخواست کو رد کروں۔ سو میں نے اجازت دی کہ وہ میرے خلوت خانہ میں آجائے۔ اور جو کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کرے۔ پس جب سفیر مذکور میرے خلوت خانہ میں آیا۔ تو اس نے جیسا کہ میں نے اشتہار ۲۴ مئی ۹۷ء کے پہلے اور دوسرے صفحہ میں لکھا ہے۔ مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں ان کے لئے دعا کروں۔ تب میں نے اس کو وہی

جواب دیا جو اشتہار مذکور کے صفحہ ۲ میں درج ہے۔ جو آج سے قریباً دو برس پہلے تمام برٹش انڈیا میں شائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ اشتہار ۲۴۔ مئی ۱۸۹۷ء کے صفحہ ۲ کی یہ عبارت ہے۔ جو میری طرف سے سفیر مذکور کو جواب ملا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ جو میں موٹی قلم سے لکھتا ہوں۔

"سلطان روم کی سلطنت کی اچھی حالت نہیں ہے۔ اور میں کشفی طریق سے اس کے ارکان کی حالت اچھی نہیں دیکھتا۔ اور میرے نزدیک ان حالتوں کے ساتھ اچھا نہیں"۔ دیکھو صفحہ دو۔ سطر پانچ و چھ۔ اشتہار ۲۴۔ مئی ۱۸۹۷ء مطبع ضیاء الاسلام قادیان۔

پھر میں نے اسی اشتہار کے صفحہ ۲ سطر ۹ کے مطابق اُس ترک کو نصیحت دی۔ اور اشارہ سے اُسکو یہ سمجھایا کہ اس کشف کا اول نشانہ تم ہو۔ اور تمہارے حالات الہام کے رُو سے اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ توبہ کرو تا نیک پھل پاؤ۔ چنانچہ یہی لفظ کہ "توبہ کرو تا نیک پھل پاؤ" اس اشتہار کے صفحہ ۲ سطر میں اب تک موجود ہے۔ جو سفیر مذکور کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا۔ پس یہ تقریر میری جو اس اشتہار میں سے اس جگہ لکھی گئی ہے۔ دو پیشگوئیوں پر مشتمل تھی۔

(۱) ایک یہ کہ میں نے اسکو صاف لفظوں میں سمجھا دیا۔ کہ تم لوگوں کا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ اور دیانت اور امانت کی نیک صفات سے تم محروم ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ اگر تیری یہی حالت رہی۔ تو تجھے اچھا پھل نہیں ملیگا۔ اور تیرا انجام بد ہوگا۔ پھر میں نے صفحہ ۳ میں بطور پیشگوئی سفیر مذکور کی نسبت لکھا ہے۔ "اس کے لئے (یعنی سفیر مذکور کے لئے) بہتر تھا کہ میرے پاس نہ آتا۔ میرے پاس سے ایسی بدگوئی سے واپس جانا اس کی سخت بدقسمتی ہے"۔ دیکھو صفحہ ۳ سطر نمبر ۱۔ اشتہار ۲۴۔ مئی ۱۸۹۷ء۔ پھر اسی صفحہ کی سطر ۵ میں یہ پیشگوئی ہے۔ "اللہ جلشانہ جانتا ہے جس پر جھوٹ باندھنا لعنت کا داغ خریدنا ہے۔ کہ اُس عالم الغیب نے مجھے پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ کہ اس شخص کی سرشت میں نفاق کی رنگ آمیزی ہے"۔ پھر میں نے اشتہار ۲۵۔ جون ۱۸۹۷ء کے صفحہ ۲ میں مذکورہ پیشگوئیوں کا اعادہ کرکے دسویں سطر سے سولھویں سطر تک یہ عبارت لکھی ہے۔

ہمنے گذشتہ اشتہارات میں ترکی گورنمنٹ پر بلحاظ اس کے بعض عظیم الدخل اور خراب اندرون ارکان

اور عمائد اور وزراء کے نہ بلحاظ سلطان کی ذاتیات کے محض اس خداداد نور اور فراست اور الہام کی تحریک سے جو ہمیں عطا ہوا ہے۔ چند ایسی باتیں لکھی ہیں۔ جو خود ان کے مفہوم کے خوفناک اثر سے ہمارے دل پر ایک عجیب رقت اور درد طاری ہوتی ہے۔ سو ہماری وہ تحریر جیسا کہ گندے خیال والے سمجھتے ہیں کسی نفسانی جوش پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ اس کی روشنی کے چشمہ سے نکلتی تھی۔ جو رحمت الٰہی نے ہمیں بخشا ہے۔

پھر اسی اشتہار کے صفحہ ۴ میں یعنی سطر ۱۹ سے ۲۱ تک یہ عبارت ہے" کیا ممکن نہ تھا کہ جو کچھ میں نے رومی سلطنت کے اندرونی نظام کی نسبت بیان کیا وہ دراصل صحیح ہو۔ اور ترکی گورنمنٹ کے شیرازہ میں ایسے دھاگے بھی ہوں۔ جو وقت پر ٹوٹنے والے اور غدّاری سرشت ظاہر کرنے والے ہوں" یاد رہے کہ ابھی میں اشتہار ۲۴ مئی ۹۷ء کے حوالہ سے بیان کر چکا ہوں۔ کہ یہ غدّاری اور نفاق کی سرشت بذریعہ الہام الٰہی حسین بک کامی میں معلوم کرائی گئی ہے۔ غرض میرے اشتہار میں جس قدر پیش گوئیاں ہیں۔ جو میں نے اس جگہ درج کر دی ہیں۔ اُن سب سے اوّل مقصود بالذات حسین کامی مذکور تھا۔ ہاں یہ پیشگوئی سے مفہوم ہوتا تھا۔ کہ اس مادہ کے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ جو سلطنت روم کے ارکان اور کارکن سمجھے جاتے ہیں۔ مگر بہر حال الہام کا اوّل نشانہ یہی شخص حسین کامی تھا جس کی نسبت ظاہر کیا گیا۔ کہ وہ ہرگز امین اور دیانت دار نہیں۔ اور اس کا انجام اچھا نہیں۔ جیسا کہ ابھی میں نے اپنے اشتہار ۲۴ مئی ۹۷ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ حسین کامی کی نسبت مجھے الہام ہوا۔ کہ یہ آدمی سلطنت کے ساتھ دیانت سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی سرشت میں نفاق کی رنگ آمیزی ہے اور اسی کو میں نے مخاطب کر کے کہا کہ توبہ کرو۔ تا نیک پھل پاؤ۔

یہ تو میرے الہامات تھے۔ جو میں نے صاف دلی سے لاکھوں انسانوں میں بذریعہ اشتہار ۲۴ مئی ۹۷ء اور اشتہار ۲۵ جون ۹۷ء شائع کر دیئے۔ مگر افسوس کہ ان اشتہارات کے شائع کرنے پر ہزارہا مسلمان میرے پر ٹوٹ پڑے۔ بعض کو تو قلت تدبر کی وجہ سے یہ دھوکا لگا کہ گویا میں نے سلطان روم کی ذات پر کوئی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ وہ میرے اشتہارات اب تک موجود ہیں۔ سلطان کی ذات سے ان پیشگوئیوں کو کچھ تعلق نہیں صرف بعض ارکان سلطنت اور

کارکن لوگوں کی نسبت الہام شائع کیا گیا ہے۔ کہ وہ امین اور دیانتدار نہیں ہیں۔ اور کھلے کھلے طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اوّل نشانہ ان الہامات کا وہی حسین کامی ہے۔ اور وہی دیانت اور امانت کے پیرایہ سے محروم اور بے نصیب ہے۔ اور ان اشتہاروں کے شائع ہونے کے بعد بعض اخبار والوں نے حسین کامی کی حمایت میں میرے پر حملے کئے۔ کہ ایسے امین اور دیانت دار کی نسبت یہ الہام ظاہر کیا ہے۔ کہ وہ سلطنت کا سچا امین اور دیانت دار عہدہ دار نہیں ہے اور اسکی سرشت میں نفاق کی رنگ آمیزی ہے۔ اور اس کو ڈرایا گیا ہے۔ کہ توبہ کر ورنہ تیرا انجام اچھا نہیں۔ حالانکہ وہ مہمان تھا۔ انسانیت کا یہ تقاضا تھا کہ اسکی عزت کی جاتی"۔ ان تمام الزامات کا میری طرف سے یہی جواب تہا۔ کہ میں نے اپنے نفس کے جوش سے حسین کامی کو کچھ نہیں کہا بلکہ جو کچھ میں نے اس پر الزام لگایا تھا۔ وہ الہام الٰہی کے ذریعہ سے تھا۔ نہ ہماری طرف سے مگر افسوس کہ اخبار والوں نے اسپر اتفاق کر لیا۔ کہ درحقیقت حسین کامی بڑا دیانت دار اور امین بلکہ نہایت بزرگوار اور نائب خلیفۃ المسلمین سلطان روم تھا۔ اسپر ظلم ہوا کہ اس کی نسبت ایسا کہا گیا۔ اور اکثر نے تو اپنی بات کو زیادہ رنگ چڑہانے کے لئے میرے تمام کلمات کو سلطان المعظم کیطرف منسوب کر دیا۔ تا مسلمانوں میں جوش پیدا کریں۔ چنانچہ میرے ان الہامات سے اکثر مسلمان جوش میں آگئے۔ اور بعض نے میری نسبت لکھا۔ کہ یہ شخص واجب القتل ہے اب ہم ذیل میں بتلاتے ہیں کہ ہماری یہ پیشگوئی سچی نکلی یا جھوٹی۔ واضح ہو کہ عرصہ تخمیناً دو یا تین ماہ کا گذرا ہے۔ کہ ایک معزز ترک کی معرفت ہمیں یہ خبر ملی تھی۔ کہ حسین کامی مذکور ایک ارتکاب جرم کیوجہ سے اپنے عہدہ سے موقوف کیا گیا ہے۔ اور اسکی املاک ضبط کیگئی ہیں۔ مگر میں نے اس خبر کو ایک شخص کی روایت خیال کر کے شائع نہیں کیا تہا۔ کہ شاید غلط ہو۔ آج اخبار نیر آصفی مدراس مورخہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء کے ذریعہ سے ہمیں مفصل طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ ہماری وہ پیشگوئی حسین کامی کی نسبت نہایت کامل صفائی سے پوری ہو گئی۔ ہماری وہ نصیحت جو ہم نے اپنے خلوت خانہ میں اسکو کی تھی کہ توبہ کر تا نیک پھل پاؤ جسکو ہم نے اپنے اشتہار ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء میں شائع کر دیا تہا۔ اس پر پابند نہ ہونے سے آخر وہ اپنی پاداش کردار کو پہونچ گیا۔ اور اب وہ ضرور اس نصیحت کو یاد کرتا ہو گا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ اس ملک کے بعض ایڈیٹران اخبار اور مولویان کو بھی جو اسکو نائب خلیفۃ المسلمین

اور رکن امین سمجھ بیٹھے تھے۔ اپنے ساتھ ہی ندامت کا حصّہ دے گیا۔ اور اس طرح پر انہوں نے ایک صادق کی پیشگوئی کا مزہ چکھ لیا۔ اب انکو چاہئے کہ آیندہ اپنی زبان کو سنبھالیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ میری تکذیب کیوجہ سے بار بار انکو خجالت پہنچ رہی ہے۔ اگر وہ سچ پر ہیں۔ تو کیا باعث کہ ہر ایک بات میں آخر کار انکو کیوں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اب ہم اخبار مذکور میں سے وہ چھٹی معہ تمہیدی عبارت کے ذیل میں نقل کر دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔

"چندۂ مظلومان کریٹ اور ہندستان"

ہمیں آجکی ولایتی ڈاک میں اپنے ایک معزز اور لائق نامہ نگار کے پاس سے ایک قسطنطنیہ والی چٹھی ملی ہے جسکو ہم اپنے ناظرین کی اطلاع کے لئے درج ذیل کئے دیتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں کمال افسوس ہوتا ہے افسوس اس وجہ سے کہ ہمیں اپنی ساری امیدوں کے برخلاف اس مجرمانہ خیانت کو جو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منتظم و مہذب اسلامی سلطنت کے وائس قونصل کیجانب سے بڑی بیدردی کے ساتھ عمل میں آئی۔ اپنے ان کانوں سے سُننا اور پبلک پر ظاہر کرنا پڑا ہے۔ جو کیفیت مولوی حافظ عبدالرحمن صاحب الہندی نزیل قسطنطنیہ نے ہمیں معلوم کرائی ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حسین کامی نے بڑی بے شرمی کے ساتھ مظلومان کریٹ کے روپے کو بغیر ڈکار لینے کے ہضم کر لیا۔ اور کارکن کمیٹی چندہ نے بڑی فراست اور عرقریزی کے ساتھ اُن سے روپیہ اگلوایا۔ مگر یہ دریافت نہیں ہوا کہ وائس قونصل مذکور پر عدالت عثمانیہ میں کوئی نالش کیگئی یا نہیں۔ ہماری رائے میں ایسے خائن کو عدالتانہ کارروائی کے ذریعہ عبرت انگیز سزا دینی چاہئے۔ بہرحال ہم امید کرتے ہیں۔ کہ یہی ایک کیس غبن کا ہوگا۔ جو اس چندہ کے متعلق وقوع میں آیا ہو۔ اور جو رقوم چندہ جناب ملا عبدالقیوم صاحب اول تعلقہ دار لنگسگور اور جناب عبدالعزیز بادشاہ صاحب ٹرکش قونصل مدراس کی معرفت حیدرآباد اور مدراس سے روانہ ہوئیں۔ وہ بلاخیانت قسطنطنیہ کو کمیٹی چندہ کے پاس برابر پہنچ گئی ہونگی

"قسطنطنیہ کی چٹھی"

ہندوستان کے مسلمانوں نے جو گذشتہ دو سالوں میں مہاجرین کریٹ اور مجروحین عساکر حرب یونان کے واسطے چندہ فراہم کر کے قونصل ہائے دولت علیہ ترکیہ مقیم ہند کو دیا تھا معلوم

ہوتا ہے کہ ہر زر چندہ تمام وکمال قسطنطنیہ میں نہیں پہنچا۔ اور اس امر کے باور کرنے کی یہ
وجہ ہوتی ہے کہ حسین بک کامی وائس قونصل مقیم کراچی کو جو ایکہزار چھ سو روپے کے قریب
مولوی انشاء اللہ صاحب ایڈیٹر اخبار وکیل امرتسر اور مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر
پیسہ اخبار لاہور نے مختلف مقامات سے وصول کر کے بھیجا تھا۔ وہ سب غبن کر گیا۔ ایک کوڑی
تک قسطنطنیہ میں نہیں پہنچائی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ سلیم پاشا ملحمہ کا رکن کمیٹی چندہ کو جب خبر پہنچی۔ تو
اس نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس روپیہ کے اگلوانے کی کوشش کی۔ اور اس کے اراضی مملوکہ کو
نیلام کرا کر وصولی رقم کا انتظام کیا۔ اور باب عالی میں غبن کی خبر بھجوا کر نوکری سے موقوف کرایا۔ اسلئے
ہندوستان کے جملہ اصحاب جرائد کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ وہ اس اعلان کو قومی خدمت
سمجھ کر چار مرتبہ متواتر اپنے اخبارات میں مشتہر فرمائیں۔ اور جس وقت انکو معلوم ہو کہ فلاں شخص کی
معرفت اس قدر روپیہ چندہ کا بھیجا گیا۔ تو اسکو اپنے جریدہ میں مشتہر کرائیں۔ اور نام مع عنوان کے
ایسا مفصل لکھیں کہ بشرط ضرورت اس سے خط وکتابت ہو سکے۔ اور ایک پرچہ اس جریدہ کا
مقام قاہرہ خاکسار کے پاس اس پتہ پر روانہ فرمادیں۔ حافظ عبدالرحمٰن الہندی الامرتسری۔
سکہ جدیدہ۔ وکالہ صالح آفندی قاہرہ (ملک مصر)

المشتہر۔ میرزا غلام احمد از قادیان ضلع گورداسپور۔ ۱۸۔ نومبر ۱۸۹۹ء

۲۵۔ جون ۱۹۲۵ء یوم یک شنبہ (چہار دہ وی آنا)

میں نے ایک کیبن کا انتظام کر لیا ہے۔ اس میں قریباً ۲۰ اٹالین خلاصی ہیں۔ جس نوجوان سے میں نے
کیبن لی وہ ہر طرح سے میری خدمت کرتا۔ اور آرام پہونچانے میں ساعی رہتا ہے۔ یہودی خاندان جو اس سے
پیشتر میرا نہ صرف ہمسایہ بلکہ بڑی مہربانی سے خدمت کرتا تھا۔ اسے افسوس ہوا۔ کہ میں کیبن میں جا رہا ہوں تو
انہوں نے کہا کہ شاید آپ کو تکلیف ہے۔ مگر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ میں صبح کا ناشتہ اور
شام کی چار ہیاں پیا کروں گا۔ کھانے کا انتظام بھی جہاز کے باورچی خانہ میں کر لیا ہے۔
کھانے میں مچھلی۔ سبزی۔ انڈے۔ پڈنگ۔ اور پھل مل جاتے ہیں۔ یہ میرے کیبن والے خلاصی کی
کوشش کا نتیجہ ہے۔ اور اب سفر تمام پہلوؤں سے خوشگوار ہو گیا۔ اور میں خدا کا شکر کرتا ہوں۔

اٹالین خلاصیوں کی عُریانی

میں نے گذشتہ سال کے سفر میں بھی مشاہدہ کیا تھا اور اب پھر تجربہ ہو رہا ہے۔ کہ یورپی لوگ علے العموم طبعی حاجتوں کے وقت برہنہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا بھی مضائقہ نہیں کرتے۔ غسل کرنا ہو تو ایکدوسرے کی شرم نہیں کرتے۔ اور ننگے نہانے لگتے ہیں۔ اس طرف رات کو لباس شب پہنتے وقت انکو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ حتٰی کہ وہ میرا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ حیا قطعاً مفقود ہے۔ جب ان مہذب قوموں کی اس حالت برہنگی کو دیکھتا ہوں۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتا ہوں جنہوں نے فرمایا

الحیاءُ من الایمان

عفت وعصمت کیلئے حیا بہت بڑی ممد ہے۔ عرب کے وحشی ملک میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے پاک اصول کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اس سے آپ کے مشن فیبر کیٹیم کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ جو اپنی تہذیب وشائستگی اپنے علوم وفنون پر نازاں اور اپنی حکومتوں اور مستعمرات پر اتراتے ہیں۔ انکی یہ حالت ہے کہ وہ

عریانی اور ستر پوشی

کے مفاد اور حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حیا ایک قفل اور محافظ ہے۔ میں اگر کوئی تکلیف اس کیبن میں محسوس کرتا تھا۔ تو یہ جانوروں کا سا نظارہ تھا۔ اس کے سوا ہر طرح آرام تھا۔ ہر روز رات کو محفل سرود بھی منعقد ہوتی تھی۔ اور اٹالین خلاصی اپنے فرائض منصبی سے فرصت پا کر اپنے چنگ ورباب کو لیکر موسیقی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

مصری یہودی سے ملاقات

ایک مصری یہودی سے آج ملاقات ہوئی۔ میں اسی یہودی خاندان میں جا بیٹھا۔ اور وہاں ہی اس سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چار کا دور چلتا تھا۔ اور ہم ادھر اُدھر کی چند ابتدائی باتوں کے بعد ایک دلچسپ مضمون پر گفتگو کرنے لگے۔

عرفانی۔ یہودی خدا تعالٰے کی برگزیدہ قوم تھی۔ خدا تعالٰی نے موسٰے علیہ السلام کے ذریعہ انکو فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ اور متواتر ان میں نبی آتے رہے۔ مگر اب کوئی نبی نہیں آتا۔ اسکی کیا وجہ ہے!

یہودی۔ خدا ہی نبی بھیجتا تھا۔ اور اب اس نے ہی بند کر دیئے۔ اس کا سبب اسی سے پوچھنا چاہیئے

عرفانی۔ آپ کا جواب سائل کی تسلی نہیں کر سکتا۔ آخر آپ بھی کوئی اس کی وجہ سمجھتے ہیں یا نہیں
یہودی۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہے۔
عرفانی۔ جزاک اللہ۔ اس ناراضگی کی کوئی وجہ آپ سمجھ سکتے ہیں!
یہودی۔ اسرائیلی لوگوں نے توریت پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ اور جب تک مسیح نہ آئے ان کی یہی حالت رہیگی۔
عرفانی۔ مسیح تو آگیا۔ مگر تم نے اسکو نہ پہچانا۔ اور اس کی تکذیب کی۔
یہودی۔ آپکو معلوم نہیں ہم اس جھوٹے مسیح کو نہیں مان سکتے۔ تھے۔ خدا کی کتاب کے وعدے کے موافق وہ نہیں آیا۔
عرفانی۔ وہ وعدہ کیا تھا؟
یہودی۔ وہ بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوگا۔ اور مسیح سے پہلے الیاس آئیگا۔
عرفانی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ سلطنت کے معنے جو تم نے سمجھے ہیں۔ وہ صحیح نہ ہوں۔ اور اس سے روحانی سلطنت مراد ہو۔ اور الیاس سے ایسا آدمی مراد ہو۔ جو الیاس کی قوت لیکر آوے۔
یہودی۔ یہی باتیں تو وہ جھوٹا مسیح (نعوذ باللہ) بھی کہتا تھا۔ ہم ان باتوں کو نہیں مان سکتے
عرفانی۔ تم نے پہلے بھی غلطی کی۔ اور اب تک اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہو۔ تم میں سے جن لوگوں نے اس مسیح کو قبول کیا۔ خدا تعالیٰ نے انکو سلطنت بھی دیدی۔ اور اس نبی کی شناخت کی توفیق بھی مل گئی۔ جس کی پیشگوئی حضرت موسٰے نے کی تھی۔ کہ

میری مانند ہوگا

یہودی۔ وہ کون سے بنی اسرائیل ہیں۔ جنہوں نے اس مسیح کو قبول کیا۔ وہ بنی اسرائیل نہیں ہو سکتے
عرفانی۔ یہودی اسی قدر تو نہیں جو آپکو معلوم ہیں۔ آپ کیا نہیں جانتے کہ بعض قومیں گم ہوگئی تھیں
یہودی۔ ہاں گم ہوگئی تھیں یہ میں مانتا ہوں۔
عرفانی۔ وہ ان گم شدہ قوموں میں سے ہیں۔ جو پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر رہتے ہیں۔ افغانستان میں بنی اسرائیل ہی ہیں جو اب افغان یا پٹھان کہلاتے ہیں۔ اور افغانستان میں انکی حکومت ہے
یہودی۔ یہ تحقیق طلب بات ہے۔ ہم یہودیوں کی بادشاہت کو بحال کرنے والے مسیح کے منتظر ہیں

اس کے سوا اور کسی کو نہیں مان سکتے۔

عرفانی۔ خدا تم پر رحم کرے۔ اسی ضد نے تم سے پہلے انکار کرایا۔ میں ایکو بشارت دیتا ہوں۔ کہ اب **مسیح ابن مریم** دوبارہ آیا ہے اسکو قبول کرو۔

یہودی۔ وہ دوبارہ نہیں آئیگا ایک ہی بار آئیگا۔

عرفانی۔ تم کو معلوم نہیں اس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی ہے۔

یہودی۔ ہم کسی مسیح کو جب تک وہ ہماری سلطنت بحال نہ کرے مان نہیں سکتے۔

عرفانی۔ تم خدا سے ڈر کر تحقیق کرو تو فائدہ ہوگا۔

یہودی۔ ہم اپنی کتابوں کو سمجھتے ہیں۔

یہ کہکر وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ خدا کے راستباز اور مرسل کے انکار نے ان کے قلوب کو بہت سخت کر دیا ہے۔ اور وہ الفاظ کے ظاہر معانی پر اس قدر اڑے ہوئے ہیں۔ کہ اور یہ بہت ہی مشکل ہے کہ وہ اس ضد کو چھوڑ کر حقیقت کی پیروی کریں۔ جہاز پر یہودیوں کی ایک اچھی جماعت تھی۔ اور وہ باقاعدہ اپنی نماز بھی پڑھتے تھے۔ توریت بھی ملکر پڑھتے تھے۔

عیسائیوں کا گرجا

میںنے رزمک جہاز پر بھی دیکھا تھا اور میں لکھ آیا ہوں۔ کہ اتوار کے روز باقاعدہ سبت منایا گیا۔ اور نماز پڑھی گئی۔ آج اس جہاز پر بھی سبت منایا گیا۔ اس جہاز پر جس قدر عیسائی ہیں۔ وہ عموماً سب کے سب رومن کیتھولک ہیں۔ شاید ہی کوئی پراٹسٹنٹ ہوگا۔

گرجا ۱۱ بجے کے قریب ہوا۔ اور تمام مرد اور عورتیں درجہ اوّل کے دیوان خانہ میں جمع ہوئیں۔ اور پوری شان و شوکت سے گرجا ہوا۔ کئی فادرز موجود تھے۔ جو روما جا رہے تھے۔ چونکہ پوپ کی زیارت کے شوق سے جا رہے ہیں۔ انکی نماز و عبادت میں ایک مخلصانہ جوش پایا جاتا تھا۔ عقاید کے لحاظ سے انکی کچھ بھی حقیقت ہو۔ مگر جو کچھ انہوں نے غلط یا صحیح سمجھا۔ اسکو مدنظر رکھ کر جو رُوح اخلاص انیں پائی جاتی ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ مسلمان جو اپنے پاس حقیقت اور صداقت رکھتے ہیں۔ وہ ان باطل پرستوں سے سبق لیں۔ اور شعائر مذہبی کے احترام کی عادت ڈالیں۔

سبت کی عزت اور بیحرمتی کے نتائج

یہودیوں کی ذلت کے اسباب میں سے ایک سبت کی بے حرمتی بھی تھی اس نے اس قوم کو خدا تعالے کی نظر میں مغضوب بنا دیا۔ عیسائی قوم اپنے

سبت کی عزت کرتی ہے۔ اور اس احترام سبت کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ دنیا میں معزز اور محترم ہے
اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی ایک باعث عیسائی قوم کے غلبہ اور تعزز کا ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک
باعث ہے۔ قرآن مجید نے یہودیوں کے مخذول ہونیکے جو اسباب بیان کئے ہیں۔ اُن میں سے ایک
عدم احترام سبت بھی ہے۔ یہودی قوم کی اس سبت کے احترام میں سستی بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم پر ایمان لانے کا ایک سبق دیا گیا تھا۔ اور روایتی طور پر ان کے اندر یہ تعلیم رکھی گئی تھی مگر انہوں
نے عدم احترام سبت کے باعث مخذول ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شناخت نہ کیا
اسی طرح مسلمانوں کو جمعہ کے اندر منجملہ اور بہت سے سبقوں کے یہ بھی تعلیم کیا گیا تھا کہ وہ مسیح موعود
کا انکار نہ کریں مگر ان میں سے اکثروں نے جب وہ آیا۔ احمد قادیانی کے نام سے آیا۔ انکار کیا۔
مسلمان آج اسکو نہیں سمجھتے۔ مگر وقت قریب آرہا ہے۔ کہ وہ سمجھیں گے۔ کہ ان کی نجات
موجودہ ہر قسم کی ذلتوں اور اغلال سے اسی کے ذریعہ ہے جس جس قدر وہ اس کے ہاتھ پر اکٹھے ہوتے
جائیں گے۔ اسی قدر وہ منزل مقصود کے قریب ہوتے جائیں گے۔ اور جس قدر اس میں دیر ہوگی۔
اسی قدر گوہر مقصود دور ہوتا جائیگا۔ جس قدر انعام اس نزول مسیح موعود علیہ السلام کیساتھ
مبشر و موعود ہیں۔ وہ سب ملیں گے اور یقیناً ملیں گے مگر اس کی ایک ہی صورت ہے۔ کہ

اسے قبول کریں

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں بتا رہا تھا کہ جہاز پر ہمارے عیسائی رفقاء سفر نے نہایت
اطمینان کے ساتھ اپنا سبت منایا۔ اور نماز پڑھی۔

یورپ کا پہلا شہر برنڈزی

آج ہم بعد دوپہر برنڈزی یورپ کے سب سے پہلے شہر میں پہنچنے والے
ہیں۔ اور جو لوگ برنڈزی اترنے والے ہیں۔ وہ اپنے منزل مقصود آجانے
پر طبعاً خوش ہیں۔ جہاز پر بندرگاہ کے قریب آنے کے وقت دوڑ دھوپ
اور مصروفیت کا عجیب نظارہ ہوتا ہے میں نے اس مصروفیت کو دیکھا اور مجھے خیال آیا۔ کہ موت کے
وقت بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ کچھ گھبراہٹ اور کچھ خوشی دونوں چیزیں ملجاتی ہیں۔ اور ہم اس دنیا
کے سمندر میں اسی طرح جہاز عمر پر سوار ہیں۔ جہاں جہاں کسی کا سٹیشن آجاتا ہے۔ وہ اترتا جاتا ہے
یہ تصور آرہا تھا کہ میں بے اختیار پکار اٹھا۔
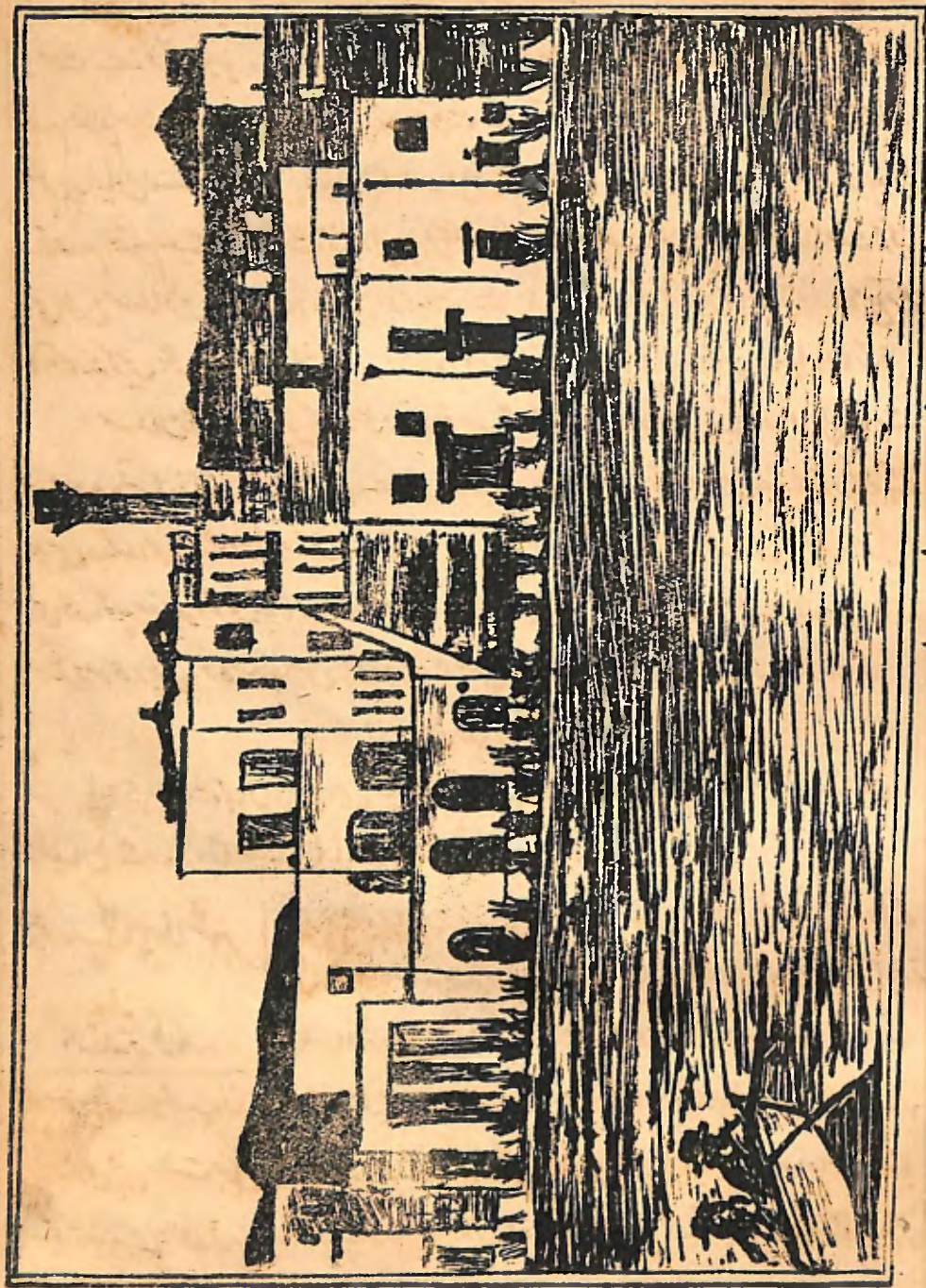
یورپ کا پہلا شہر برنڈزی

جہازِ عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

مسافر جو یہاں اُترنے والے تھے۔ وہ اپنے ساز و سامان کی درستی اور باندھنے میں معروف تھے میں فوراً اپنے کیبن میں چلا گیا۔ اور میں نے ضروری سمجھا کہ اپنی ڈاک کو مکمل کر لوں۔ تاکہ یہاں سے پوسٹ کر سکوں۔ چنانچہ میں نے چند خطوط لکھے۔ اور اخبار کے لئے ایک مضمون بھی لکھ ڈالا۔ ان سب کو مکمل کر کے ٹکٹ لگا کر جہاز کے صندوق چٹھیات میں ڈال کر بے فکر ہو گیا۔ اور جہاز پر سے ساحلی منظر کو دیکھنے لگا۔ میں تنہا ہی اس نظارہ میں معروف نہ تھا۔ بلکہ ہر مسافر محو نظارہ تھا۔ جنکو یہاں اترنا تھا انکی اور حالت تھی۔ اور جو آگے ٹرلیسٹ تک جانے والے تھے۔ وہ محض تماشائی تھے۔ دو بجے کے بعد برنڈزی نظر آنے لگا۔ اور ہر ساعت ہم اس کے قریب ہو رہے تھے۔ دُور سے یہ نظارہ بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ کنارے کی عمارتیں شاندار نظر آتی ہیں۔ مگر کنارے پر پہنچکر معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی شاندار نہیں ہیں۔

برنڈزی میں چند گھنٹے

۳ بجے کے قریب ہم برنڈزی کے بندرگاہ پر پہونچ گئے۔ میرے لئے یہ تیسرا موقعہ ہے کہ میں برنڈزی پہنچا ہوں پہلی مرتبہ سال گذشتہ میں اور برادر مکرم چودھری فتح محمد صاحب یہاں روما جانے کے لئے اترے تھے۔ میں اس وقت شہر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اور میں نے کچھ دیکھا بھی مگر چودھری صاحب گھبراتے تھے کہ پیچھے پیچھے ہو جائیں گے اور ہم ایک تماشا بن جاویں گے۔ لیکن میں نے انکو ہوٹل میں چھوڑ کر کچھ نہ کچھ دیکھ لیا تھا۔ دوسری مرتبہ لنڈن سے واپس ہوتے ہوئے جب جہاز یہاں لنگر انداز ہوا۔ تو میں برادر مکرم مولوی مصباح الدین صاحب کے ساتھ پھر اُترا۔ اور شہر میں چلا گیا۔ اب میں تنہا تھا۔ اور میں اس فرصت کو جو مجھے جہاز کے ٹھہرے رہنے تک میسر تھی۔ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسلئے میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ میں اس شہر کو دیکھوں گا۔ اور اپنے علم و مشاہدہ کو سپرد قلم و کاغذ کر دوں گا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب میں وہ موقعہ پا رہا ہوں۔

برنڈزی

اب ہم بحیرہ ویڈریاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔ برنڈزی بحیرہ ایڈرنٹک کا بہت بڑا اہم بندرگاہ ہے۔ اسکی بحری اہمیت اس وقت سے بہت بڑھ گئی ہے جبکہ ہندوستان کو نہر سویز کے

راستہ سے قریب کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ہی برنڈزی ایک اہم بحری سٹیشن تہا۔ اور ابتدائی ایام سے یورپ سے مشرق کیلیئے ابتدائی بحری سٹیشن تہا۔ رومیوں کی سلطنت کے عروج واقبال کے ایام میں بھی بحیرہ ایڈریاٹک میں یہی بہت بڑا بحری سٹیشن تہا۔ جو ڈاک ہندوستان۔ مصر وغیرہ سے یورپ کو جاتی تہی۔ وہ اسی راستہ سے جاتی تہی۔ اور اب بھی بہت سے مسافر اسی راستہ سے جاتے ہیں۔ اگرچہ جہاز کے ڈاک اب مارسیلز کو جاتے ہیں۔ اور جب سے مارسیلز کو یہ اہمیت حاصل ہوئی برنڈزی کی رونق اور آبادی پر اسکا اثر پڑا ہے۔ تاہم وہ معمولی سٹیشن نہیں ہے۔ مصر انڈیا۔ ٹرکی یونان وغیرہ کو اکثر جہازات اس جگہ سے جاتے ہیں۔

شہر کوئی بہت بڑا شہر نہیں۔ ایک بڑا قصبہ کہنا چاہیئے۔ مگر اسکا محل وقوع نہایت خوشنما اور پر لطف ہے۔ وہ بندرگاہ کے دو بازوؤں کے درمیان واقعہ ہے۔ گویا وہ آغوش بندرگاہ میں واقعہ ہے۔ اور یہ بندرگاہ جنگی حیثیت سے بہت محفوظ ہے۔ چہوٹے چہوٹے بہت سے جزیرے اس بندرگاہ کے قریب ہی واقعہ ہیں۔ نہ صرف ان کا منظر خوشنما ہے۔ بلکہ وہ اس بندرگاہ کی حفاظت کے لئے بطور پاسبان واقع ہوئے ہیں۔ یہ لاسکی اور تار بیدیو کا بھی بہت بڑا اسٹیشن ہے۔ اور ممالک غیر سے ڈیڑھ ملین (پندرہ لاکھ) پونڈ کی سالانہ تجارت یہاں سے ہوتی ہے۔ کثرت سے جو چیزیں یہاں سے باہر جاتی ہیں۔ وہ روغن زیتون۔ شراب اور خشک میوہ جات وغیرہ اور باہر سے علی العموم کوئلہ آتا ہے۔ اور اسکی ہی بہت بڑی ضرورت ہے۔ میں نے جیسا کہ لکھ چکا ہوں تین مختلف اوقات میں اسے دیکھا ہے۔ یہ یورپ کا پہلا شہر ہے۔ اس شہر کو دیکھتے ہی یورپ کے متعلق انسانی قلب پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا۔

بندرگاہ کا محل وقوع تو نہایت ہی عمدہ ہے۔ گودی بالکل شہر کے ساتھ واقعہ ہے اور جہاز شہر کی بیرونی سڑک کے پاس آکر ٹہیرتا ہے۔ اور جہاز سے اترتے ہی شہر کی زمین پر قدم رکھتے ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کر کنارے تک جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جہاز کے کنارے پر پہنچتے ہی پاسپورٹ وغیرہ دیکھ لئے جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو یہاں اتر جانا ہوتا ہے۔ یا جو شہر کی سیر کیلیئے جانا چاہتے ہیں۔ انکو فوراً اجازت مل جاتی ہے۔ اور بتا دیا جاتا ہے کہ کس وقت تک انکو واپس آجانا چاہیئے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ ایک کھلی سڑک چلی گئی ہے۔ اس سڑک کے

بڑے بڑے ہوٹل .کک کا دفتر .اور پولیس سٹیشن وغیرہ موجود ہیں .اور وہاں سے ہی ایک بہت بڑی بڑی سڑک ریلوے سٹیشن کو گئی ہے .اور دراصل سارے شہر میں سب سے بڑا اور فراخ بازار وہی ہے .ورنہ عام طور پر شہر کی گلیاں بہت تنگ اور کیچ خراب اور غلیظ بھی ہیں .میں نے کہا ہے کہ یورپ کے اس سب سے پہلے شہر کو دیکھ کر اگر یورپ کی صفائی اور اس کی حالت کا اندازہ کریں تو

یقیناً یہ اندازہ غلط ہوگا

برنڈزی کی تاریخی حیثیت بھی معمولی نہیں .اور ۲۶۷ قبل مسیح سے اس میں انقلاب شروع ہوتا ہے .جب کہ رومیوں نے اس کو فتح کر کے اپنی نوآبادی بنالیا تھا .پھر اس پر مختلف حملے مختلف اوقات میں ہوتے رہے ہیں .کبھی ایک کبھی دوسری قوم قابو پاتی رہی .مجھ کو چونکہ تاریخ بیان کرنا مدنظر نہیں اسلئے میں اسے چھوڑ کر اپنے اشاہدات کی طرف آتا ہوں .

میرے مشاہدات میں اب تیسری مرتبہ اس شہر کو اپنے آپکو آزاد پا کر دیکھنے کے لئے گیا سب سے پہلے سفر میں جو گذشتہ سال کیا گیا تھا .میرے دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان میں سے بعض شہر کے کوچوں میں سے گذرے تو مستورات انکی طرف لپکتی تھیں .یا ہنستی تھیں .اور اس کے بعد وہ یا تو شہر میں جانے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے .یا سوار ہو کر جاتے تھے مگر میں اس وقت جبکہ حیفہ سے چھوٹ کر براسکندریہ ہی کے راستہ اور اسی جہاز وی آنا پر آیا تھا .تو شہر میں گیا تھا .میرے ساتھ مکرمی چودھری فتح محمد صاحب بھی تھے .لڑکوں کا ایک غول ہماری طرف لپکا وہ مجھے دیکھ کر ہنسے چودھری صاحب نے سمجھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا .اسلئے وہ واپس ہوئے بگر میں پھر تھوڑی دیر کے لئے تنہا گیا .اور اب تو میں آزاد اور تنہا تھا .اسلئے میں نے پسند کیا کہ پھر کر جس قدر دیکھ سکتا ہوں دیکھوں .چنانچہ میں نے بڑی سڑک کو چھوڑ کر چھوٹی گلیوں اور کوچوں کو دیکھنا شروع کیا میں اٹالین زبان سے ناواقف .اور اپنے ہندوستانی لباس میں ملبوس .اور پھر تنہا .مگر میرے لئے کوئی حیرت اور تعجب کا مقام نہ تھا .اور نہ میں کسی قسم کی تکلیف محسوس کرتا تھا .جہاز سے اترتے ہی میں ککس کے دفتر میں گیا .اور میں نے ایک پونڈ کو اٹالین سکہ میں تبدیل کیا .پانچ پانچ اور دس دس لیرہ کے نوٹ ملتے ہیں .بڑی بڑی رقوم کے نوٹ بھی ہوتے ہیں .میں بلا بغیر دریافت کرنے کے گلیوں میں جا گھسا .اور میں نے دیکھا کہ گلیوں میں پتھروں کا فرش ہے .جو کسی اصول پر نہیں لگایا گیا اور نہ

معماری کی کوئی خاص خوبی اس سے ظاہر ہوتی ہے گلیوں اور مکانوں اور ان کے مکینوں کو دیکھ کر شہر کی مفلسی اور قلاشی کا اثر میرے دل پر ہونے لگا میں نے کہا کہ یہ صحیح اندازہ نہیں ہوگا۔

میں چلتے چلتے ایک مکان کیطرف چلا گیا۔ وہاں ایک ترکہان بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

بون جورنو

میں کچھ نہیں سمجھا۔ مگر قیاس کیا کہ سلام کرتا ہوگا۔ میں نے ہندوستانی طریق پر ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ پھر اس نے دو تین جملے بولے ہیں پچھلے سفر میں آشنا جان گیا تھا۔ کہ ہندوستانیوں کو انڈیانو کہتے ہیں اس لئے میں نے اس کا مطلب سمجھے بدون اپنے قیاس کی بنا پر کہا۔

انڈیانو

اس پر اس نے ایک بڑی لمبی تعجب آمیز آواز میں آں کہکر کہا۔ آں انڈیانو یعنی اچھا آپ ہندوستانی ہیں۔ میری اور اسکی گفتگو اور تبادلہ خیالات کا سلام کے اشارے اور انڈیانو کے لفظ سے خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس نے نہایت شریفانہ انداز سے ایک کرسی میری طرف کی کہ میں اس پر بیٹھ جاؤں میں نے ہاتھ کے اشارہ سے شکریہ کر کے انکار کر دیا۔ میں جب وہاں کھڑا تھا بچوں۔ لڑکیوں۔ اور عورتوں کا ایک جگھٹا بھی قدرتی طور پر جمع ہو گیا۔ اور مجھے ان لوگوں کے شکل وصورت۔ عادات۔ ان کے لباس اور وضع قطع سے انکی معاشرت اور تمدن کے اندازہ کرنے کا کچھ موقعہ ملگیا۔

ان کے بشرہ اور لباس سے افلاس ظاہر تھا۔ ان کے چہروں کی بناوٹ اور رنگت روپ سے اعلیٰ درجہ کی خوبصورتی نمایاں نہ تھی۔ رنگ بہت سفید نہ تھا۔ بلکہ وہ گونہ سرخی مائل گندم گون تھے۔ قد چھوٹے تھے مرد عموماً داڑھیاں کہتے ہیں۔ جو خشخاشی تھیں۔ اور مونچھیں لمبی بعض صرف مونچھیں ہی رکھے ہوئے نظر آئے اور بہت ہی کم داڑھی مونچھ منڈوانے والے۔

لباس اور جوتے شاندار اور فوق البھڑک نہ تھے۔ بلکہ پھٹے پرانے اور بعض پیوند لگے ہوئے بھی تھے مگر میں کسی حالت میں غریب ہندوستانیوں سے انہیں بدتر نہیں سمجھتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ یہاں بیکاری کا مرض بھی ہے۔ کام کم ہے۔ باایں جب میں قہوہ خانوں کی رونق کو دیکھتا تھا۔ تو مجھے انکی خوش باشی پر تعجب ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر تک میں اس مجمع میں عجیب روزگار کیطرح کھڑا رہا۔ جو مرد یا عورت آتی تھی وہ اس نجار سے کچھ دریافت کرتی۔ اور جب وہ انڈیانو کہتا تو وہ اپنی زبان سے نہایت تعجب نہ آواز میں

آن-انڈیانو

کہکر اپنی دریافت پر خوش ہوتی۔ اور میں اس مجمع میں کھڑا ہوا باوجود غریب الوطن ہونے کے سمجھتا تھا کہ

میں غریب الوطن نہیں

گویا یہ سب بہت پرانے آشنا ہیں۔ اور میں انکی صحبت میں لطف اٹھا رہا ہوں۔ آخر میں نے اپنے مہربان ترکھان صاحب کو اور قدردان حاضرین کو سلام کیا۔ اور ترکھان صاحب سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ ملانا تھا کہ میری طرف ہاتھ ملانے کیلئے بیسیوں ہاتھ نکل آئے جنمیں مرد اور عورت دونوں کے شامل تھے۔ میں چونکہ عورتوں سے ہاتھ ملانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے نہ مردوں سے ہاتھ ملایا اور نہ عورتوں سے اور سب کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کر دیا۔ میرے اس طریق نے بے لطفی نہ پیدا کی۔ بلکہ وہ سب خوش ہو گئے۔ اور انہوں نے سمجھا کہ مجھے ترکھان صاحب سے ہی بے تکلفی ہوگی۔ اب یہ گروہ میری مشایعت میں میرے ساتھ۔ اور میں وہاں سے نکلکر ایک گرجہ میں آیا۔ جہاں لوگ اندر آتے اور باہر جاتے تھے

برنڈیزی کا مشہور گرجا

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ یہاں کا بہت بڑا مشہور گرجا ہے۔ لیکن جب میں اندر گیا۔ اور دروازے پر بعض لوگوں کے اندر باہر آنے جانے سے معلوم ہو گیا۔ کہ یہی وہ مشہور گرجا ہے۔ جو ۱۰۸۹ء میں بنایا گیا تھا۔ اور پھر ۱۷۴۳ء میں دوبارہ بنایا گیا۔ کیونکہ ایک شدید زلزلہ نے اسکو بالکل برباد کر دیا تھا۔

جب میں گرجا میں داخل ہوا۔ تو بجائے خود ایک عجائب المخلوقات تھا۔ جو لوگ اندر گرجا کو دیکھ رہے تھے۔ اور گرجا کے پادری صاحب جن کو مجاور کہنا چاہیئے۔ حاضرین کو بعض تصاویر جو گرجا کی دیواروں پر تھیں۔ دکھا رہے تھے۔ اور کچھ ان کے متعلق بیان کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھنے لگ گئے۔ اور میں ان سب کا مرکزی نقطہ ہو گیا۔ لیکن زبان کی ناواقفی نے کوئی فائدہ اٹھانے نہ دیا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ پرانا گرجہ ہے۔ جو دوسری مرتبہ بنا ہے۔ کیونکہ زلزلہ سے تباہ ہو گیا تھا۔

اٹلی کے باشندے علی العموم رومن کیتھولک ہیں۔ اور یہ گرجے اچھے خاصے صنم کدہ ہیں۔ درو دیوار

مختلف قسم کی تصاویر سے مزین ہیں۔ اور تصاویر زیادہ تر خیالی اور فرضی ہیں۔ میں نے ان تصاویر کو دیکھا اور غور کیا۔ تو یہی معلوم ہوا کہ قدیم زمانہ کی بت پرستی نے یا تصویری زبان کے ذریعہ اظہار خیالات کے طریق نے ان عبادت خانوں کو بت کدہ بنا دیا ہے۔

ان تصاویر میں عیسائی ولیوں کی تصاویر۔ فرشتوں کی تصاویر اور حضرت مسیح کے زندگی کے بعض مرقعے تھے مجھ کو یہاں اور بعض کیتھولک گرجوں میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ فرشتوں کی تصاویر پریوں کی خیالی تصاویر کیطرح بنائی گئی ہیں۔ اور ان کے پر دکھائے گئے ہیں۔ فرشتوں کے پروں کی حقیقت اپنے اندر بہت کچھ اسرار رکھتی ہے۔

یہ گرجا کوئی بہت بڑا گرجا نہیں لیکن اپنی قدامت کے سبب سے سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔ پادری صاحب مختلف موقعوں پر حاضرین کو کچھ نہ کچھ خیرات کرنے کی بھی تلقین کرتے تھے۔ یہ میں صرف ان کے عمل سے اندازہ کرتا تھا میں چونکہ زبان سے ناواقف تھا۔ پادری صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی کچھ دوں مگر میں نے توجہ نہ کی اور میں کچھ منٹ گذر کر گرجا سے باہر نکل آیا۔ یہ گرجا شہر کی ایک گلی میں واقعہ ہے اور اونچی جگہ پر ہے۔ وہاں سے اس سڑک پر آنے کے لئے جو بندرگاہ کے ساتھ ساتھ گئی ہے۔ بہت سی سیڑھیاں اتر کر آنا پڑتا ہے۔ اس لئے میں اپنی فوج طفلان کے حلقہ میں اتر کر بندرگاہ کی سڑک پر آگیا۔

فطرت انسانی کا ایک منظر

قرآن مجید میں جہاں سیر و سیاحت کی تاکید کی ہے۔ اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد پر توجہ دلائی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ سیروا فی الارض فسنظر کیف بدأ الخلق تم دنیا میں پھر و اور سیر کرو۔ اور دیکھو کہ ہم نے کیسی مخلوق پیدا کی ہے۔

فطرت کی نیرنگیاں بجائے خود ہیں۔ مگر ایک امر ہر جگہ مشترک پایا جاتا ہے۔ اجنبیت ایک ندرت بنا دیتی ہے۔ اور کثرت ایک جذب پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری اجنبیت نے ایک ندرت کا رنگ پیدا کر دیا۔ اور اسکو دیکھنے والوں کا گروہ بڑھنے لگا۔ میں جہاں جہاں سے گذرتا کچھ نہ کچھ آدمی ساتھ ہو جاتے۔ یہ بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ عورتیں مرد ہر قسم کے لوگ تھے۔ میں اس مجمع کو اور اپنے آپ کو دیکھتا تھا۔ اور ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا منظر یاد آتا تھا۔ کہ جب کبھی کوئی انگریز وہاں آ جاتا ہے

توکسطرح لوگ اس کے ارد گرد جمع ہوتے اور اس کے پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ بھاگے پھرتے ہیں یہ فطرت کا ایک نظارہ تھا۔ حالانکہ وہ ہماری طرح کا ایک آدمی ہوتا ہے۔ یا میں ان جیسا ہی ایک انسان تھا اس نظارہ نے مجھے ایک اور طرف متوجہ کر دیا۔ کہ خدا تعالیٰ کے نبی اور مامور ہم ہی میں سے مبعوث ہوتے ہیں مگر در صل وہ کسی اور جگہ سے آتے ہیں۔ وہ اپنے دعاوی اپنے اعمال۔ اور ان کے نتائج کے لحاظ سے ایک ندرت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور اس ندرت میں ایک جذب اور کشش ہوتی ہے۔ جو مخلوق کو انکی طرف کھینچ لاتی ہے مختلف خیالات اور مختلف ارادوں اور نقطۂ خیال سے لوگ انکے گرد جمع ہوتے ہیں ہنسی اور ٹھٹھا بھی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے آخر دوست اور جاں نثار خادم بھی پیدا ہو جاتے ہیں بہر حال ان میں ایک جذب ہوتا ہے۔ اور اتنا زبردست جذب ہوتا ہے۔ کہ جوں جوں انکی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ دُور دور اور اکناف عالم سے دنیا کو کھینچ لاتا ہے۔ میں اس نظارہ میں ایسا محو ہوا کہ شہر کے بعض مناظر کو بھی دیکھ نہ سکا۔ خیالات کا سلسلہ آیا اور گذر گیا۔ اور میں کسٹم ہوس کی طرف چلا گیا۔

کسٹم ہوس کسٹم ہوس بالکل بندرگاہ پر ہے۔ میں جب وہاں داخل ہوا تو کئی لڑکیاں اور نوجوان لڑکے اپنے کیمرے لیکر میرے گرد ہو گئے۔ اور بعض نے تو مجھے پکڑ کر ایک جگہ کھڑا کرنا چاہا۔ تا کہ وہ میری تصویریں لیں اگرچہ کسٹم ہوس میں گذشتہ سال بھی ایک مرتبہ جا چکا تھا لیکن پھر دوبارہ چلا گیا۔ یہاں کسٹم ہوس میں عام طور پر زیادہ دیر نہیں لگتی ہر ایک بہت بڑا لمبا تختہ لکڑی کا میز نما ہوتا ہے۔ لوگ اس پر اپنا سامان رکھکر کھولدیتے ہیں۔ اور وقت واحد میں متعدد آدمی اسے دیکھ کر مسافروں کو فارغ کر دیتے ہیں۔ میں تو یونہی اسے دیکھنے گیا تھا۔ اس لئے ادھر اُدھر پھر کر باہر نکلا۔ تو فوٹو گرافروں نے مجھے گھیر لیا۔ میں ان میں اس طرح پر کھڑا تھا جیسے کوئی سیاسی مجرم ہوتا ہے اور مارشل لا کے ماتحت اسے گولی سے اُڑا دینے کا حکم ہو۔ وہ سب کے سب مختلف جہتوں سے میرا فوٹو لینے کیواسطے اپنے کیمروں کو درست کر رہے تھے۔ میرے لئے بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ

خاموش کھڑا ہو جاؤں

میں ان کے درمیان کھڑا تھا۔ یونیورسٹی لائبریری۔ برو شلم کے لائبریرین مسٹر SHONAM نام جو جہاز پر میرے ہم سفر ہیں۔ ادھر سے آنکلے اور انہیں قدرتاً اچنبا ہوا کہ

مسٹر عرفانی کے فوٹو لئے جا رہے ہیں

غرض فوٹو گرافروں نے اپنے عجیب و غریب نوادر کا فوٹو لیکر مجھے سلام کیا۔ اور شکریہ ادا کیا اور میں انکی اس مسافر نوازی کا شکریہ ادا کرکے جہاز کیطرف چلدیا۔ کیونکہ وقت قریب ہو چلا تھا۔ یہاں جہاز میں سے بہت سا سامان اتارا گیا۔ اور اسیوجہ سے دیر بھی لگی بلکہ مسٹر شتم کو بہت تعجب ہوا کہ میرے اس قدر فوٹو لئے گئے۔ اور انکو کسی نے پوچھا نہیں۔ مینے کہا کہ اگر تم اس انگریزی لباس میں نہ ہوتے اور فلسطین کا ملکی لباس پہنکر آتے۔ تو مجھ سے کم عجائب المخلوقات نہ ہوتے۔ میرے اس کہنے پر شتم بے اختیار ہنس پڑے۔ ہم جہاز پر پہنچ گئے۔ اور ایک گھنٹہ کے بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ برنڈزی سے روانگی کے وقت نارے کا نظارہ بہت ہی قابل دید تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ اب بحیرہ روم کو چھوڑ چکے ہیں۔ اور بحیرۂ ایڈریاٹک میں جا رہے ہیں۔ جسکے ایک طرف اٹلی کا ساحل ہے۔ اور دوسری طرف یونان۔ البانیہ اور مونٹی نگرو کا علاقہ علے الترتیب جا رہا ہے۔ ہمارا جہاز ساحل اٹلی کیطرف قریب ہو کر جا رہا ہے۔

مسٹر شتم جیسا کہ اوپر میں نے ذکر کیا ہے۔ یروشلم یونیورسٹی کے لائبریرین ہیں۔ وہ جرمن اور انگریزی زبان بھی جانتے ہیں۔ اور عربی تو انکی ملکی زبان ہے۔ یہ ایک خوش خلق نوجوان ہے مزاج بہت نرم اور بہت ہی سیدھے آدمی ہیں پہلی مرتبہ یورپ جا رہے ہیں۔ یہودیوں کی بہت بڑی کانفرنس وی آنا میں ہونے والی ہے۔ یہ اس میں شریک ہونے کے لئے جا رہے ہیں۔ برنڈزی کو دیکھ کر وہ یورپ کا غلط اندازہ کرنے لگے تھے۔ کہ میں نے بتایا۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں کہ ہم پہلے ہی شہر کو دیکھ کر کل یورپ کا اندازہ کرلیں۔ میں چونکہ انگلستان جا رہا ہوں۔ اس لئے قیاس نہیں بلکہ تجربہ سے یہ بات کہتا ہوں۔ جہاز پر سوار ہو چکنے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ برانڈزی میں ایک قابل دید عمارت تھی۔ جو کسی زمانہ میں شاہی محل تھا۔ اور گیارہویں صدی میں بہت بڑی لائبریری تھی مگر آج

وہ ایک عام قید خانہ ہے

مجھے اس شاہی مقام کے دیکھنے کی آرزو باقی رہی۔ اس لئے نہیں کہ وہ محل ہے۔ بلکہ اس کے عبرت انگیز انقلاب کا نظارہ مجھے دیکھنا مقصود تھا۔ مگر موقعہ نہ مل سکا۔ اور میں صرف یہ پڑھ کر خاموش ہو گیا۔ چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب۔

برنڈزی سے جس وقت جہاز روانہ ہوا ہے۔ گرمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ترشح ہو گیا۔ یہ ترشح اس امر کی علامت معلوم ہوتا تھا۔ کہ راستہ میں بارش ہوگی۔ چنانچہ وینس میں ابھی ہم پہنچے نہ تھے۔ کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور وینس میں ہمارا داخلہ بارش کے مسلسل طوفان میں ہوا۔

غرض ہم برنڈزی سے روانہ ہوئے۔ مسٹر شنم کو خصوصیت سے میرے ساتھ محبت ہو گئی وہ مجھے کہنے لگے۔ کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص کس لباس میں یورپ جا رہا ہے۔ وہ کیوں کوٹ پتلون نہیں پہنتا۔

میرے لباس پر بحث

میں نے مسٹر شنم کو کہا۔ کہ میں اپنا لباس پہنتا ہوں۔ یورپی لباس کی تقلید کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم اپنا ذاتی قومی لباس رکھتے ہیں۔ ہم لوگ افریقہ کے جنگلوں میں برہنہ نہیں رہتے۔ پھر اسکی کیا ضرورت ہے۔ کہ خواہ مخواہ میں دوسروں کا لباس پہن لوں۔ لباس کی جو غرض و غایت ہے وہ میرے لباس سے پوری ہوتی ہے۔

مسٹر شنم۔ لباس کی کیا غرض و غایت ہے۔

عرفانی۔ قرآن مجید جو ہماری مذہبی کتاب ہے۔ اور جسکو ہم آخری اور کامل کتاب کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس میں لباس کی ضرورت اور اس کے اصول پر بحث کی ہے۔ چنانچہ اس نے لباس کے تین مقصد بیان کئے ہیں۔

اوّل۔ وہ گرمی اور سردی۔ اور اگر جنگ ہو تو تیر و تفنگ کے اثرات سے بچائے۔ دوم اس سے ستر پوشی پورے طور پر ہو۔ اور تقویٰ کا ذریعہ ہو۔ سوم۔ زینت بھی ان ہر دو امور کے ساتھ ہو۔

اسلام چونکہ عالمگیر مذہب ہے۔ اسلئے وہ خاص قسم کی تراش خراش کا اہل پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ لباس کی غرض و غایت بتا دیتا ہے۔ اور اس طرح پر دنیا کے جس ملک کے حسب حال جو لباس ہو وہ اسکی تعلیم اور منشا کے ماتحت ہوگا۔ مثلاً اسکیمو لوگ جو جانوروں کے چمڑے اور پوستین پہنتے ہیں اس حصہ زمین کے رہنے والوں کیلئے وہی لباس درست ہے۔ گرم ملکوں میں رہنے والے اس قسم کا لباس نہیں پہن سکتے۔

مسٹر شنم۔ یہ اصل تو بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ مگر اس سے یورپ کے لباس کے خلاف تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

عرفانی۔ میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم اپنا قومی لباس کہتے ہیں۔ اور یہ ستر پوشی کیلئے گرمی اور سردی سے بچانے کے لئے کافی ہے۔ پس ہم کو اس لباس کیلئے خواہ مخواہ حرص کرنے کی ضرورت نہیں

مسٹر شنم۔ کیا آپ گاندھی کی تحریک کے موافق یورپین لباس کو بائیکاٹ کرتے ہیں۔

عرفانی۔ میں تو گاندھی کا پیرو نہیں ہوں۔ گاندھی یورپین لباس کو بائیکاٹ نہیں کرتا وہ تو یورپین کپڑے کو بائیکاٹ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور میں اس امر میں بھی اس کے ساتھ متفق نہیں ہوں۔

مسٹر شنم۔ آپ کیوں اتفاق نہیں کرتے۔ اس تحریک سے ملک کی ترقی ہوتی ہے۔

عرفانی۔ ہمارا ملک تو ساری دنیا ہے۔ علاوہ بریں ملکی ترقیات کیلئے اس قسم کی تحریکوں کو میں مضر سمجھتا ہوں۔ اگر ہر ملک والا اس تحریک کو جاری کرے کہ دوسرے ملک کی اشیا نہ لی جاویں تو تجارت کیلئے یہ ایک خطرناک مسئلہ ہوگا۔ اور اس سے تہذیب تمدن کو بھی صدمہ پہنچیگا۔

مسٹر شنم میرے ساتھ گفتگو کر رہے تھے مضمون کسی قدر دلچسپ تھا۔ ایرانی پادری صاحب مصری یہودی۔ اور چند اور لوگ بھی آکر جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور ایک اور صاحب نے پوچھا۔

دوسرے صاحب۔ آپ ہندوستانی ہو کر ایسی تحریک کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو آپ کے ملک کے لئے مفید ہے۔

عرفانی۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ تسلیم کریں گے کہ کم از کم میں اپنے ملک کو اور اس کے مفاد کو آپ سے بہتر سمجھ سکتا ہوں۔

دوسرے صاحب۔ یقیناً۔

عرفانی۔ بہت اچھا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ اگر ہم انگلستان جرمن یا جاپان۔ یا دوسرے یورپین ممالک کا مال بائیکاٹ کر دیں۔ تو ان ملکوں کی تجارت پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں۔

وہی صاحب۔ بے شک۔

عرفانی۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ جو فائدے باہم تبادلہ اشیاء اور تبادلہ خیالات سے ہوتے ہیں ان سب سے ایک دوسرا محروم ہو جائے گا یا نہیں۔

وہی صاحب۔ ہاں آپ کی دلیل قوی تو معلوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نیشنلسٹ کے نقطہ خیال سے

یہ صحیح نہیں ہے۔
عرفانی۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نیشنلزم کا قائل نہیں ہوں بلکہ میں ہیومنزم کو مانتا ہوں۔ اس لئے کہ اسلام جو میرا مذہب ہے۔ وہ نیشنلٹی کی نہیں بلکہ ہیومنٹی کی تعلیم دیتا ہے۔
وہی صاحب۔ آپکے خیالات قابل قدر ہیں۔ میں انکی تعریف کرتا ہوں۔
عرفانی۔ تعریف کچھ چیز نہیں اگر یہ اچھے ہیں تو آپ اختیار کریں۔ اور ان پر عمل کریں۔
وہی صاحب۔ یہ قابل غور بات ہے میں سوچوں گا۔
مسٹر شلنم نے اپنے سلسلہ کلام کو پھر شروع کرکے کہا۔ گاندھی کیسا آدمی ہے۔
عرفانی۔ میں کسی انسان کو بہ حیثیت انسان برا نہیں سمجھتا۔ گاندھی ایک تعلیم یافتہ آدمی ہے اور لوگ اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں بھی انکی عزت کرتا ہوں کہ یہ میرا اخلاقی فرض ہے۔ مگر افسوس ہے میں ان کے خیالات کو ہندوستان کیلئے مفید نہیں سمجھتا۔

چونکہ شام ہو چکی تھی میں نے اپنے دوست مسٹر شلنم سے اجازت چاہی۔ اور پھر دو تین گھنٹے کے بعد ملنے کا وعدہ کرکے میں اُٹھ آیا۔ اور اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا۔ پھر نمازیں پڑھیں اور کھانا کھایا۔ اور حسب معمول اوپر چلا گیا۔ چونکہ کل وینس آجانے والا ہے۔ لوگ اپنے رخت سفر کو باندھنے اور درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں گو پورے مصروف نہیں مگر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ آج رات کو جہاز پر بال ناچ ہو گا۔ اور سنا بھی دکھایا جائیگا چنانچہ پہلے سنا دکھایا گیا۔ اور اس کے بعد بال کی تیاریاں ہوئیں جہاز بجلی کی روشنی اور ملکی پھریروں سے سجایا گیا۔ اور جہاز بقعہ نور بنگیا تھا۔ ۹ بجے کے قریب ناچ شروع ہوا۔ جس میں جہاز کے آفیسر اور مسافر مرد اور عورتیں شریک تھیں۔ میں سرود سماع وحسن رگندے سمجھ کر اور نیز اس کے حسن و قبح کو دیکھنے کے خیال سے تختۂ جہاز پر چلا گیا۔ اب جبکہ جہاز پر بہت سے واقف ہو چکے ہیں۔ میرے لئے اچھی جگہ پالینا بہت آسان تھا۔ چنانچہ مجھے جہاز کے معزز مسافروں اور آفیسروں کے زمرہ میں جگہ ملگئی۔ اور میرے ہم نشینوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ میں انکے ساتھ دور شراب میں شریک نہیں ہو سکتا تھا کہ سگریٹ یا سگار بھی نہیں پیتا۔ ایک شخص نے جو نتھالی لینڈ سے آرہے تھے۔ مجھے کہا کہ اگر آپ شراب اور سگریٹ سگار نہیں پیتے تو یورپ کی سوسائٹی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی کیونکہ انہی چیزوں سے بے تکلفی اور تعارف پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا اگر آپ کا نقطۂ خیال درست ہے تو یہ یورپ کے لوگوں کی اور انکے علم اور

دماغ کی ہتک ہے۔ میرے اس کہنے پر وہ کسی قدر خفیف تو ہوئے مگر کہنے لگا کہ یورپ میں شراب کا استعمال ضروریات زندگی میں سے ہے۔ صحت کو قائم رکھنے کے لئے اسے ضرور پینا چاہیئے۔

عرفانی میں آپ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ انسان کی ضروریات زندگی کو قدرت نے خود مہیا کر دیا ہے جن چیزوں کو قدرت پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ انسان آپ بناتا ہے وہ ضروریات زندگی نہیں ہیں۔ میں نے جب یہ سلسلہ گفتگو شروع کیا۔ تو بجائے ناچ کا لطف اٹھانے کے یہ مجلس جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک علمی مجلس کے رنگ میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ انسان کی زندگی کیلئے سب سے پہلی چیز جس کی ضرورت ہے وہ ہوا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے ہوا اس قدر پیدا کر دی ہے کہ ہم ہوا کے سمندر میں تیر رہے ہیں۔

دوسرے درجہ پر پانی کی ضرورت ہے۔ دیکھ لو یہ بھی کثرت سے موجود ہے۔ زمین۔ آسمان۔ چاند۔ سورج یہ زندگی کیلئے ضروری ہیں۔ قدرت نے یہ بھی مہیا کر رکھے ہیں۔ غذا طبعی طور پر ہے۔ غذا کے لئے کافی سامان دنیا میں موجود ہے۔ اگر انسان کاشت کر کے ان چیزوں کو نہ بھی پیدا کرے۔ تو بھی کافی سامان موجود ہے۔ لباس کی ضروریات کیلئے جانوروں کی کھالیں۔ درختوں کے ریشے اون وغیرہ کام آسکتے ہیں اگر شراب ضروری ہوتی تو یہ بھی قدرت نے مہیا کی ہوتی۔

میری اس تقریر نے میری طبیعت (جو حقیقت میں جہالت ہے) اور فلاسفی کا سکہ بٹھا دیا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہمیں افسوس ہے۔ کہ آپ سے آج آخری دن ملاقات ہو رہی ہے۔ جب کہ آپ کل صبح ہم سے اور ہم آپ سے جدا ہو جائیں گے۔

غرض آج رات اہل جہاز کیلئے رات شب رات تھی۔ قریباً ۲ بجے رات تک یہ محفل نشاط و طرب قائم رہی میں تو ۱۲ بجے کے قریب اپنے کیبن میں چلا گیا۔ سونے کی کوشش کی مگر پوری طرح نہ سو سکا۔ اس لئے کہ لوگ آتے جاتے اور شور مچاتے تھے۔ آج سمندری سفر کی آخری رات ہے کل اللہ تعالیٰ کے فضل سے وینس پہنچ کر خشکی پر اترنا ہوگا۔ اور پھر بذریعہ ریلوے سفر کرنا ہوگا۔

۲۶۔ جولائی ۱۹۲۵ء یوم دوشنبہ
وینس میں ورود

آج دس بجے کے قریب جہاز وینس پہنچا۔ میں نے صبح ہی اٹھ کر اپنا سامان درست کر لیا تھا

اور اپنے حسابات کو صاف کیا۔ یکے بعد دیگرے ان سفری آشناؤں سے رخصت ہوا۔ جو آگے جانے والے تھے اور اس یہودی خاندان کا شکریہ ادا کیا۔ جنہوں نے سب سے اول میرے آرام و آسائش میں شریفانہ پہلو اختیار کیا تھا۔ لوگ یہودیوں کی نسبت خود غرضی وغیرہ کے الزام لگاتے ہیں۔ مگر میں اس یہودی خاندان کی اس مہربانی کو یاد رکھوں گا۔ جو انہوں نے اسکندریہ سے لیکر وینس تک میرے ساتھ ظاہر کی۔ اس لئے۔ کہ اسلام یہی تعلیم دیتا ہے۔

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ

جس شخص نے انسان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ وہ خدا کا بھی شکرگذار نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کی حقیقت اور فلسفہ نمایاں ہے۔ انسان دوسرے انسان کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے لطف و کرم کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کے باوجود اگر اسکی حس شکرگذاری میں حرکت نہیں ہوتی۔ تو ایک وراءالورا ہستی جو لطیف اور الغیب ہے وہ اسکو احسانات اور کرمفرمائیوں کو دیکھ اور محسوس نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ لوگ ہر فضل اور کرم کو علے العموم اپنی ایک یا دوسری تدبیر کا نتیجہ قرار دے لیا کرتے ہیں۔ یہ تو ایک ضمنی بات تھی میں نے ہر ایسے شخص کا جس سے مجھے اس سفر میں کچھ بھی نفع پہنچا تھا۔ شکریہ ادا کیا۔ اور اپنے منزل مقصود پر اترنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا۔

جنوب مشرق کے گوشے پر یوگوسلاویہ کی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں گذشتہ سفر میں بھی اس ملک کے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ مگر میرے اختیار سے باہر تھا۔ اب بھی یہاں سے گذرتے ہوئے میں اس خواہش کو اپنے سینہ میں محسوس کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ کہ میں اس ملک کے عجائبات اور اسکی بوقلمونیوں کو دیکھنے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ چونکہ اس سرزمین میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اور مجھے جو چیز اس ملک کیلئے کشش کر رہی ہے۔ وہ صرف۔

اخوت اسلامی ہے

اسلئے میں چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھ سے ان بھائیوں کو دیکھوں۔ اور ان کے حالات کا مطالعہ کروں۔ کہ وہ دینی اور دنیوی حالت کے لحاظ سے کس مقام پر ہیں۔ خدا کے فضل سے کیا بعید ہے کہ میں دیکھ سکوں۔ بہر دست تو میری یہ حالت ہے۔ کہ

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

وینس میں بہت سے لوگ اتر جائیں گے۔ اس لئے کہ یہاں سے خشکی کے ذریعہ یورپ کے ہر حصہ میں
جا سکتے ہیں۔ اور وینس بجائے خود اپنے اندر ایک

کیفیت جذب رکھتا ہے

جوں جوں وینس قریب آتا جاتا تھا میں ایک خوشی کی لہر محسوس کرتا تھا۔ مسٹر شنّم نے مجھے کہا۔ کہ اسے
ایک ایسے ہوٹل کا پتہ نکال لیا ہے۔ جہاں جرمن بولی جاتی ہے۔ اس لئے میں اور آپ اس ہوٹل میں جا کر
ٹھیریں گے۔ اور اس طرح پر زبان نہ جاننے کی تکلیف نہ ہوگی۔ میں بھی اس پر راضی ہوگیا۔ اور اسے خدا تعالیٰ
کا فضل یقین کیا۔

ابھی ہم وینس سے کچھ فاصلے پر تھے۔ اور تمام چھوٹے چھوٹے خوبصورت جزیرے اپنی شاندار
عمارتوں کا خوش کن منظر پیش کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کہ یکایک آسمان پر ایک سیاہ بادل نمودار ہوا۔
اور آناً فاناً چھا گیا۔ سورج جو بڑی شان سے درخشاں تھا چھپ گیا۔ اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔
اترنے والے مسافروں کا تمام سامان باہر پڑا ہوا تھا۔ اور بارش سے بچنے کے لئے اب کوئی سامان نہ تھا۔
مرد اور عورتیں تو حجروں اور کمروں میں اور جہاں جہاں ممکن تھا گھس گئیں۔ مگر اسباب پڑا بھیگتا تھا۔

جہاز والوں نے پوری کوشش کی۔ کہ ہم جلد گودی میں پہنچ سکیں۔ مگر آخر کچھ فاصلے پر ٹھیر جانا
پڑا۔ جہاز پر عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ اور اسباب بھی گڈمڈ ہو رہا تھا۔ میں اور مسٹر شنّم سمجھتے تھے کہ شاید
سب سے پہلے اتر جائیں گے مگر اب معلوم ہوتا تھا کہ سب سے پیچھے ہی اتر جاویں تو خوش قسمت ہیں۔ غرض
بارش کچھ کم ہوئی۔ تو جہاز نے پھر حرکت شروع کی۔ اور آخر وینس کی گودی میں لائڈ ٹریسٹنو کمپنی کے دفتر
کے سامنے وہی آتا جہاز جس پر ہم سوار تھے۔ آکر لنگر انداز ہوگیا۔ ہر شخص نے اترنے کی سب سے پہلے کوشش
کی مگر ہمارا اسباب ایسی حالت میں تھا کہ ہم جلدی نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ دوسروں کا اسباب اور سامان اکثر
اوپر آ گیا تھا۔ اس سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ ہمارا اسباب نسبتاً کم بھیگا۔ مگر دیر بہت ہوگئی۔ تب میں نے
مسٹر شنّم کو کہا۔ کہ ہمارے ہاں ایک ضرب المثل ہے۔

کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے

مگر ہم اس پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہیں۔ خوشی سے عمل نہیں کر رہے۔ الغرض ہم نے جہاز کو خدا کا شکر کر کے
چھوڑا۔ اور نیچے آئے۔ اور کسٹم ہوس میں سامان دکھانے کے لئے چلے گئے۔

وینیس کا کسٹم ہوس

وینس کا کسٹم ہوس نہایت ہی عمدہ اور خوبصورت بنا ہوا ہے۔ ہر درجہ کے مسافروں کے لیئے جدا جدا حصے تھے۔ مگر ہر حصہ نہایت مصفے اور وسیع تہا۔ ہم تیسرے درجہ کے کمرہ میں بڑے بڑے لمبے دالانوں سے گذر کر پہنچے۔ اسباب ایک چہوٹی سی انجن کی پٹے کے ذریعہ سے ہر کمرہ میں پہنچایا جاتا تہا جو کسٹم ہوس میں اسی غرض کیلئے دوڑتی تہی کسٹم کے ملازم نہایت خوش اخلاق اور شریف الطبع تھے۔ مسافروں کو تنگ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انکو جلد سے جلد فارغ کرنے اور ضروری مدد دینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ البتہ یہ امر میرے مشاہدہ میں آیا۔ کہ جو لوگ کارکنوں تک جلد پہنچ سکتے۔ اور انکو توجہ دلاسکتے وہ جلد فارغ ہوجاتے۔ ترتیب کا خیال پورا نہیں رکہا جاتا تہا۔ میں اور مسٹر شتم زبان سے بے بہرہ تھے۔ اس لئے سوائے اس کے کچھ نہ کرسکتے تھے۔ کہ اپنے اپنے ٹرنک کو آگے کریں۔ اور ہر دفعہ سرکنا کافی ہوتا۔ تہوڑے فاصلے پر ایک **عورت** جو ادہیڑ عمر کی تھی ٹہل رہی تہی۔ اس کے ساتھ اس کے دو جوان لڑکے بھی تھے۔ اور وہ اپنے بعض عزیزوں کو لینے آئی ہوئی تہی۔ اس نے ہم کو اس حالت اضطراب میں دیکھا۔ اور ہمارے پاس آئی۔ اور انگریزی میں سوال کیا تم کہاں سے آئے ہو میں نے جواب دیا کہ ہندوستان سے آیا ہوں۔ اور میرا یہ رفیق سفر یروشلم ہے۔ تب اس نے کہا کہ میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ اس ہمدردی کیلئے آپ کا شکریہ ہے۔ ہم اٹالین زبان نہیں جانتے۔ اور اس لئے یہاں سے جلد مخلصی نہیں ہوسکتی۔ مہربانی کرکے ہم کو اس میں مدد دیں۔ اور کسی ایسے ہوٹل کا پتہ دیں جہاں انگریزی سمجھ سکتے ہوں۔ مسٹر شتم نے فورًا کہا کہ ہوٹل کا انتظام تو ہے۔ مگر یہاں سے جلد نجات ہوجائے۔ اس نیکدل خاتون نے کسٹم کے ایک افسر کو توجہ دلائی اور وہ خود آیا۔ اور اس نے جھٹ ہمارے ٹرنکوں کو دیکھ کر ان پر محصول سے بری ہونے کے ٹکٹ لگادئے۔ اور دروازے تک ہمارا اسباب اٹہانے کے لئے پورٹر کو بلا دیا۔ میں نے اس لیڈی کا شکریہ ادا کیا۔ اور پولیس کے جوانوں نے ہمیں ایک کشتی پر جسکو یہاں **گنڈولہ** کہتے ہیں۔ کرایہ کردیا۔ اور برستی بارش میں ہم گنڈولہ میں سوار ہوکر روانہ ہوئے اور مسٹر شتم کے ہوٹل کی تلاش میں مختلف کوچوں میں سے گذرتے ہوئے آخر ایک سنسان سی جگہ پر پہنچے۔ کشتی بان نے اپنا گنڈولہ کھڑا کیا۔ اور وہ اتر کر گلی میں چلا گیا۔ اور اس ہوٹل کا ایک قلی لے آیا جو ہمارا اسباب اٹہا کر چلا۔

ہوٹل محض شراب خانہ تھا

مجھے اس محل وقوع کو دیکھ کر ہی شبہ ہوا تہا کہ یہ کوئی پسندیدہ اور معروف مقام نہیں ہوسکتا مگر قہر درویش برجان درویش۔ میں مسٹر شتم سے وعدہ کرچکا تہا۔ اس کے ساتھ

ہونا پڑا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک **شراب خانہ** ہے اور اس کے اوپر چند کمرے لوگوں کے رہنے کیواسطے ہیں۔ مینے شراب خانہ دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا۔ کہ یہاں نہیں ٹھیروں گا۔ گذشتہ سال جب ہم واپسی کے وقت وہیں ٹھیرے تو ہوٹل وو آری واٹر میں قیام پزیر ہوئے تھے۔ اور میں اسکو جانتا بھی تھا۔ بلکہ میرا ارادہ بھی اسی میں قیام کا تھا بھی۔ صرف مسٹر شنتم کے کہنے سے رفیق سفر سمجھ کر اس ہوٹل پر راضی ہوگیا مگر یہاں آکر کیفیت ہی کچھ اور معلوم ہوئی۔ اسباب تو ہم نے وہیں رکھدیا۔ اور اسکی دوسری منزل پر جاکر جب سونے کے کمروں کو دیکھا۔ تو مجھے اس ہوٹل کے کسی غیر شریفانہ مکان ہونے کا خوف پیدا ہوا۔ اور میں نے مسٹر شنتم کو کہا کہ میں تو یہاں نہیں ٹھیروں گا۔ اگر تم میرے ساتھ چلتے ہو۔ تو ہوٹل ووآری واٹر میں چلو۔ اور اگر یہاں رہنا چاہتے ہو۔ تو خود رہو۔ مگر میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ

یہ مکان اچھا نہیں

مجھے خطرہ ہے کہ تم لٹ نہ جاؤ۔ یہاں شریف مرد اور شریف عورتیں نہیں رہتے ہوں گے۔ کیونکہ اوپر کے تمام بالاخانے اس وقت خالی تھے۔ ایک بھی مسافر تو مجھے نظر نہ آیا۔ البتہ نیچے لوگ دور شراب کا لطف اٹھا رہے تھے۔ مسٹر شنتم تو وہیں ٹھیرے اور میں نے گنڈولہ والے کو کہا۔ کہ میرا اسباب واپس لیچلو۔ اور ہوٹل ووری آری واٹر کو چلو۔ مگر اس نے مجھسے ۳۰ لیرہ کرایہ مانگا۔ کہ یہاں ادا کرو۔ حالانکہ اس میں سے نصف حصہ مسٹر شنتم سے لے چکا تھا۔ میں نے صاف انکار کیا۔ اور خود چھتری ہاتھ میں لے کر چلدیا۔ اور میں نے کہا کہ میں برٹش قونصل کے پاس جاتا ہوں۔

میرے اس کہنے پر اس نے اسباب تو اٹھا لیا۔ اور ہم ہوٹل ووری واٹر کو روانہ ہوئے راستے میں اس نے پھر کرایہ کا تقاضا کیا۔ مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ اور میں ایک راستہ پر پڑگیا۔ جسے میں شناخت کر سکتا تھا اور آخر میں سینٹ مرقس کے گرجہ والے چوک کے قریب پہنچ گیا۔ اور اب مجھے اس ہوٹل میں جانا بہت آسان تھا۔ اس جگہ پہنچکر اس نے پھر گڑبڑ کرنی چاہی۔ اور ایک پولیس والے کو بھی ساتھ ملا لیا۔ اور اس نے اپنی اٹالین زبان میں کسی قدر سختی سے مجھ سے کرایہ دینے کو کہا۔ میں انگریزی بولتا تھا۔ ایک انگریزی جاننے والے نوجوان نے مجھے کہا۔ کہ پولیس مین سے اس نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ بہتر ہے تم کرایہ ادا کر دو۔ میں نے کہا کہ میں برٹش قونصل کے پاس جاکر دوں گا۔ اور یہاں کی پولیس کی شکایت کروں گا۔ اس نے پولیس مین کو جاکر کہا کہ اس شخص کو کچھ مت کہو بلکہ بہتر ہے کہ گنڈولہ والا اس کا سامان لے جائے۔ اس پر پولیس مین نے گنڈولہ والے

کو ڈانٹ کر کہا۔ کہ ہوٹل میں صاحب کو لیجاؤ۔ یہ مجھے اسی نوجوان سے معلوم ہوا جس سے میں نے گونہ ترجمان کا کام لیا۔ بالآخر میں ہوٹل میں پہنچا۔

ہوٹل کے خادم اور کلرک مجھے دیکھ کر پہچان گئے۔ اور بہت خوشی سے ملے۔ باوجودیکہ ان دنوں میں ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ تاہم مجھے کمرہ نمبر ۱۹ ملگیا۔ گنڈولہ والے نے جب دیکھا۔ کہ ہوٹل کے لوگ میرے پہلے سے واقف ہیں تو اسکی حالت ہی بدل گئی۔ اب وہ بندہ بے زر تھا۔ میں نے ہوٹل کے مینجر کو تمام واقع سے مطلع کیا۔ اور اس نے اسکو ڈانٹا۔ پہلے وہ مجھ سے ۳۰ لیرہ مانگتا تھا۔ اب یہاں تک میرا سامان پہنچانے کے باوجود ۱۵ لیرہ پر بہت خوشی سے راضی ہوگیا۔ اور شکریہ اور سلام کرکے رخصت ہوا۔

میں نے ہوٹل میں پہنچکر اپنے آپکو بالکل گھر میں پایا۔ اب پانچ بج چکے تھے۔ بارش تھم چکی تھی سامان کو ترتیب سے رکھا۔ بعض ضروری حاجتوں سے فراغت کرکے چائے کے لئے اور رات کے کھانے کے لئے آرڈر دیکر نماز پڑھی۔ ابھی میں نماز سے فارغ ہوا ہی تھا۔ کہ مینجر صاحب نے خود آکر مجھے یوگوسلاویہ اور ہنگری کے دو اخبار نویسوں کے کارڈ دئے۔ اور کہا کہ انہوں نے آپ کے سوٹ کیس پر جرنلسٹ کا لفظ پڑھا تھا۔ اسے راستہ میں دیکھ کر وہ ملاقات کیلئے آئے ہیں۔ میں نے انکو اوپر بھیجدینے کے لئے کہدیا اور ان کے لئے بھی چائے کا آرڈر دیدیا۔ وہ دونوں صاحب اوپر تشریف لے آئے۔ اور میں نے محبت اور خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور حسب ذیل بات چیت ہوئی۔

عرفانی۔ میں آپ صاحبان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جرنلسٹ۔ ہم شکر گذار ہیں کہ آپ نے ہم کو ملاقات کا موقعہ دیا۔ ہم نے راستہ میں آپ کے سوٹ کیس پر جرنلسٹ لکھا دیکھا تھا۔ اور قدرتی طور پر ہم ایک ہم پیشہ کو ملکر بہت خوش ہو سکتے تھے۔ خصوصًا جبکہ وہ ہندوستانی ہو۔

عرفانی۔ میں آپ کے ان محبت آمیز جذبات کا شکر گذار ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ چاء پینے میں عذر نہ ہوگا۔

جرنلسٹ۔ ہم چاء پی چکے ہیں۔ آپ کا شکریہ ہے۔

عرفانی۔ مشرقی آداب کے یہ خلاف ہے کہ میں اکیلا چاء پیوں۔ جبکہ آپ میرے مہمان ہیں۔ وہ انکار کرتے تھے۔ اور میں اصرار۔ آخر ایک دو مرتبہ کے تکرار کے بعد میں نے انکو راضی کرلیا۔ اور ہم تینوں

نے چارپی۔ اور اس عرصہ میں "کل صبح کیلئے وقت مقرر کرکے مجھ سے اجازت لیکر رخصت ہوئے۔ اور میں نے ارادہ کیا کہ اب باہر نکلوں۔ چنانچہ کپڑے وغیرہ بدل کر باہر سیر کو نکلا۔ وینس کے متعلق جو کچھ لکھنا ہے وہ میں آج کی ڈائری ختم کرنے کے بعد لکھوں گا۔

ایک بڑی مجمع میں گومگو کا نظارہ

میں ہوٹل سے نکلکر سینٹ مرقس کے گرجہ والے میدان میں آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ میرے گرد بہت بڑا ہجوم ہے۔ سارے میدان میں میں اکیلا ہندوستانی تھا۔ میری ڈاڑھی حنا شدہ تھی۔ لوگوں کو یہ دیکھ کر ہی تعجب ہوتا تھا۔ میں انکو دیکھتا تھا اور وہ مجھے اُنہوں نے مختلف زبانوں کے ذریعہ مجھ سے کلام کرنا چاہا یعنی اٹالین۔ فرنچ۔ جرمن زبانوں کے ذریعہ انہوں نے کلام کرنا چاہا۔ اور میں صرف انگلش کہتا تھا۔ یا انڈیا کہدیتا تھا۔ اس مجمع سے ایک شخص نکلگیا۔ اور چند منٹ کے بعد وہ ایک نوجوان کو لے آیا۔ جو انگریزی بول سکتا تھا مجھے یہ نظارہ کبھی نہیں بھولیگا۔ اس نوجوان کے مل جانے پر مجمع کو اس قدر خوشی ہوئی گویا

انہیں کوئی جاگیر مِل گئی

اس کے لئے راستہ کھول دیا گیا۔ اور وہ بڑی شان سے اس مجمع میں داخل ہوا جہاں میں مرکز بنے ہوئے کھڑا تھا۔ اور اس نے آتے ہی سلسلہ کلام شروع کردیا۔

نوجوان۔ گوڈ ایوننگ سر۔

عرفانی: (مسکراتے ہوئے) گوڈ ایوننگ! آپ کا مزاج کیسا ہے۔

نوجوان۔ بہت اچھا ہوں۔ آپ کا شکریہ ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔

عرفانی۔ ہندوستان سے۔

نوجوان۔ یہ سب لوگ آپ سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ آپ انکی زبان نہیں جانتے اسلئے انہوں نے مجھے تلاش کیا۔ تاکہ میں انکے خیالات کی ترجمانی کروں۔

عرفانی۔ آپ میری طرف سے ان سب کا شکریہ ادا کردیں۔ کہ مجھ سے کلام کرنے کے لئے انہوں نے اس قدر تکلیف اُٹھائی۔ کہ آپکو تلاش کیا۔ نیز یہ کہیں کہ میرے منہ میں زبان ہے اور آپ کے منہ میں زبان ہے اور باوجود ہم سب اپنے منہ میں زبان رکھنے کے اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا شوق رکھنے کے بول نہیں سکتے ترجمان صاحب نے میرے خیالات کا ترجمہ کرکے سنایا تو مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور

ہر طرف سے میں تعجب اور مسرت کے الفاظ کو محسوس کرتا تھا، سنتا تو تھا، مگر چونکہ میں سمجھتا نہ تھا۔ اس لئے میں قیاس کرتا ہوں۔ اور ان کے حرکات سے سمجھتا تھا۔ کہ وہ اظہار تعجب کرتے ہیں۔

ترجمان۔ یہ سب لوگ آپ کی بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ اور خصوصاً آپ کے منہ میں زبان رکھ کر بول نہ سکنے کے خیال نے انکو بہت ہی تعجب میں ڈالا ہے۔ کہ آپ کیسے اچھے بلند خیالات رکھتے ہیں۔

عرفانی۔ میرا آپ پھر شکریہ ادا کر دیں۔ کہ ان ہیں کی لیڈیوں اور شرفا نے ایک دور دراز ملک ہندوستان سے آئے ہوئے شخص کے متعلق ایسی دلچسپی لی۔ جسکا رنگ ان سے الگ۔ زبان دوسری اور مذہب بھی الگ ہے۔

ترجمان۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ آپ جیسا آدمی عجیب دلچسپی کے قابل ہے۔ جو اپنے خیالات میں اتنا بلند اور گہرا ہے۔

عرفانی۔ آپ کہئے کہ میں اس عزت افزائی کیلئے شکر گذار ہوں۔ مگر خیالات کی بلندی اور گہرائی اگر کوئی حقیقت اور عملی قوت ساتھ نہیں رکھتی۔ تو میرے نزدیک وہ ایسی چیز ہے۔ جہاں سے گر کر یا جہاں گر انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محض گہرائی یا بلندی کوئی خوبی نہیں سمندر کی گہرائی یا پہاڑ کی بلندی باوجودیکہ وہ ایک واقعہ ہے۔ لیکن اگر اس سے ہم فائدہ نہ اٹھائیں۔ تو فضول ہے۔

ترجمان نے جب انکو بیان کیا۔ تو پھر ایک وجد کی سی کیفیت ان پر طاری ہوئی۔ اور امین امین (بنا کرکے) انہوں نے کہنا شروع کیا۔ کبھی ان میں سے کوئی بولتا تھا اور کبھی کوئی۔ اور ترجمان اس کا ترجمہ کر کے سنا دیتا تھا۔

ترجمان۔ آپ کے سفر کی غرض کیا ہے؟

عرفانی۔ میں ملکوں اور لوگوں کو پڑھنا چاہتا ہوں۔

ترجمان۔ آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ یا دیکھنا چاہتے ہیں؟

عرفانی۔ نہیں میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں ملکوں میں پھروں گا اور دیکھوں گا۔ اور یہ دیکھنا ہی میرا پڑھنا ہوگا۔ پس میرے سفر کا مقصد یہ ہوگا۔

دیکھو اور سوچو

یہ مجمع بہت زیادہ ہوتا گیا۔ اسلئے کہ شام کا وقت اس چوک میں بیحد رونق اور ازدحام کا ہوتا ہے۔ غرض

اس قسم کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ اور میں ان میں مسرت اور شادمانی کے جذبات سے متاثر ہوا ہوا تہا۔ میں نے آج خود کوئی کام کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ میں یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔ آخر میں نے ان سب کو شب بخیر کہا۔ اور اجازت چاہی اور یورپی آداب کے لحاظ سے مرد اور عورتوں نے مجھ سے ہاتھ ملانا چاہا۔ سب سے پہلے ایک عورت نے ہاتھ بڑہایا۔ اور میں نے ترجمان کے ذریعہ کہا۔

میڈم۔ کیا آپ مجھے معاف فرمائیں گی اگر میں آپ سے ہاتھ ملانے کا عذر کروں۔ میں آپ کو تبا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں کسی عورت سے ہاتھ نہیں ملاتا۔ اسکی یہ وجہ نہیں کہ میں عورت کو ذلیل سمجھتا ہوں میں تو عورت کی بہت بڑی عزت کرتا ہوں اسلئے یہ کہ یہ عورت ہے جس نے ہم کو بادشاہ بڑے بڑے مدبر بہادر۔ بڑے بڑے شاعر۔ ولی اور خدا کے نبی دئے سب۔ اسی عورت کے ذریعہ ہم کو ملے ہیں۔ پھر ہم عورت کی کیوں عزت نہ کریں۔

پس یہ اس عزت ہی کے لئے ہے کہ ہم ہاتھ نہیں ملاتے۔ اسلئے کہ کسی آدمی کو حق نہیں کہ وہ ایسی عورت سے کہ جو اسکی بیوی نہیں ہاتھ ملائے تاکہ عورت کی تقدیس میں فرق نہ آئے یہ سنکر وہ سب خوش ہوئے اور میں چلا آیا۔

وینیس ۷ جولائی ۱۹۲۵ء لغایت ۹ جولائی ۱۹۲۵ء
سہ شنبہ لغایت پنجشنبہ

صبح ۹ بجے میری ملاقات کے لئے کل والے جرنلسٹ آئے۔ میں ناشتہ کرکے انکی ملاقات کیلئے تیار تہا۔ انہوں نے مجھ سے حسب ذیل انٹرویو کیا۔

جرنلسٹ۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

عرفانی۔ اگر آپ کا یہ مطلب ہو کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہئے۔ یا دوسروں کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ تو میری رائے یہ ہے کہ آزادی ہر شخص اور ہر قوم کا قدرتی حق ہے۔ ہندوستان آزاد ہونا چاہیئے۔ اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی موجودہ حالت میں ممکن ہے یا نہیں۔ تو میرا جواب یہ ہے کہ ناممکن کے متعلق تو میں نپولین اعظم سے اتفاق کرتا ہوں۔ کہ یہ لفظ احمقوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کا آزاد ہونا ممکن ہے مگر موجودہ حالات اس کے موافق نہیں اسلئے آسان نہیں۔

جرنلسٹ۔ کیا گاندھی کی تحریک ہندوستان کی آزادی کی ضمانت نہیں؟

عرفانی۔ میں افسوس سے کہتا ہوں، نہیں گاندھی کی تحریک کے بعض حصوں نے ہندوستان کی آزادی کے سوال کو پیچھے ڈالدیا۔

جرنلسٹ۔ گاندھی موومنٹ کے کس حصہ کو آپ پسند نہیں کرتے۔

عرفانی۔ آپکو یاد رہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اپنے نقطۂ خیال اور ذاتی رائے سے کہتا ہوں گو میری اس رائے کیساتھ ملک کی بہت بڑی آواز بھی ساتھ ہو یا نہ ہو۔

گاندھی مومنٹ میں ترک موالات کی پالیسی کو میں شروع سے خطرناک سمجھتا تھا۔ اور اب واقعات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ یہ طریق عمل غلط تھا۔ خود گاندھی کے دوستوں اور رفیقان کار نے اس کو چھوڑ دیا اور موالات شروع کر دیا۔

اسی طرح گاندھی نے کالجوں کے بائیکاٹ سے ملک کو نقصان پہنچایا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ سے بھی ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

جرنلسٹ۔ علی برادرز مسلمان ہیں اور گاندھی کے ساتھ ملکر کام کرتے ہیں۔

عرفانی۔ بیشک وہ مسلمان ہیں۔ اور گاندھی کے ساتھ ملکر کام کرتے ہیں مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو جاتا کہ گاندھی کی تحریک ایک صحیح دستورالعمل ہے۔

جرنلسٹ۔ یہ سچ ہے مگر اس سے تو یہ پتہ لگتا ہے۔ کہ ہندوستان کا بہترین دماغ گاندھی کے ساتھ ملکر کام کر رہا ہے۔

عرفانی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ میرے مسلم بھائیوں علی برادرز کو ہندوستان کا بہترین دماغ سمجھتے ہیں اور اس نیک خیال کیلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ گاندھی کی اس تحریک کی تائید میں علی برادرز نے بھی غلطی کھائی اور اس غلطی نے مسلم کمیونٹی کو نقصان پہنچایا۔

جرنلسٹ۔ ہندو مسلم اتحاد کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟

عرفانی۔ میں ہندو مسلم اتحاد ہی کا حامی نہیں ہوں تو ہندوستان کی تمام اقوام تمام مذاہب کے درمیان اتحاد چاہتا ہوں۔ اور پھر اس اتحاد کو اتنا عالمگیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ

کل دنیا میں ایک ہی نیشن ایک ہی مذہب اور ایک ہی ملک ہو

جرنلسٹ۔ آپ کا خیال بہت ہی اعلےٰ پائے کا ہے۔ مگر جب کل دنیا مختلف۔ اقوام مختلف مذاہب مختلف ممالک میں تقسیم ہو چکی ہے۔ تو ایک کس طرح سے ہو سکتی ہے۔

عرفانی۔ اگر ہم رنگ اور قوم کا تفرقہ مٹا دیں۔ اور اپنے دائرہ کو انسانیت کے مرکز پر کھینچ لیں۔ اور ایک ہی خدا کے پرستار ہوں۔ تو یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے مختلف ممالک میں رہکر بھی ہم

ایک ہی قوم ہو سکتے ہیں

اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہندوستان اور افریقہ میں جدا جدا رہتے ہوں۔ تو کیا وہ بھائی نہ ہونگے اسی طرح ہم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں مختلف ممالک کی سکونت مختلف زبانوں کا تفرقہ ہم کو الگ نہ کرے ہم گورے کالے کا سوال اٹھا دیں۔ تو

ایک ہی ہو جاتے ہیں

جرنلسٹ۔ ہاں یہ خیال تو بہت اچھا ہے۔ مگر خیال سے آگے نہیں جا سکتا۔ بلکہ اسے خیالی پلاؤ کہنا چاہیئے (ہنسکر کہا)

عرفانی۔ میں نے خیالی پلاؤ کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی تمام ترقیات اور تمام عملیات کی بنیاد یہی

خیالی پلاؤ ہے

آپکو مجھ سے ملنے کا خیال میرا سوٹ کیس دیکھ کر پیدا ہوا۔ اور اب آپ مجھ سے کلام کر رہے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے قصر اور شاندار محل خیالی پلاؤ کا نتیجہ ہیں۔ دماغ میں ایک تحریک اس سے ایک ڈیزائن پیدا ہوا۔ اور وہ خیالی پلاؤ سے بڑھ کر نہ تھا مگر حالات اور واقعات نے اسے عملی صورت دے دی اسی طرح میں اس خیالی پلاؤ پکانے سے شرمندہ نہیں کون جانتا ہے کہ ایک دن میرے اس خیالی پلاؤ کا نتیجہ

دنیا میں ایک قوم اور ایک مذہب ہو

جرنلسٹ۔ ہندوستان میں آپ پہلے ہندو مسلم اتحاد پیدا کر کے دکھائیں۔

عرفانی۔ میرا اور ہر ہندوستانی کا فرض کوشش کرنا ہے۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے یہ دوسری بات ہے۔

جرنلسٹ۔ اس اتحاد میں مشکلات کیا ہیں؟

عرفانی۔ یہ سوال بہت تفصیل چاہتا ہے مختصر جواب یہ ہے کہ جبتک ہندو مسلمان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کرتے۔ اور ایکدوسرے کے لئے روح ایثار پیدا نہیں کرتے اتحاد نہیں ہو سکتا۔

جرنلسٹ۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی آزادی کی آپکو کوئی امید ہے؟

عرفانی۔ میری امید ہر حالت میں ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ

ایکدن ہندوستان آزاد ہو جائیگا

جرنلسٹ۔ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت ہو۔

عرفانی۔ اصولاً میں پسند کرتا ہوں۔ کہ ہندوستان پر ہندوستانی حکومت کریں۔ لیکن جب تک اہل ہند اس قابل نہ ہوں میں تمام یورپین حکومتوں میں سے

انگریزی حکومت کو ترجیح دیتا ہوں

جرنلسٹ۔ گذشتہ لڑائی کے صلہ میں انگریزوں نے ہندوستان کو کیا دیا۔

عرفانی۔ اپنی حکومت کے ساتھ وفاداری کرنا میں ہر شریف انسان کا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اگر کوئی شخص اپنے فرض کی ادائیگی کا معاوضہ چاہتا ہے۔ تو میں اسے **انسانیت** کی ہتک سمجھتا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ وفاداری کی کوئی مارکیٹ ہے۔ جہاں ہم

اسکو خرید یا بیچ سکتے ہیں

اگر ہندوستانی اپنی حکومت کے ساتھ وفاداری کرکے اس کا معاوضہ چاہیں۔ تو میں اسے ناپسند کروں گا۔ اسلئے میں ایسے سوال کو اپنے ملک کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہم نے ایک فرض ادا کیا۔

جرنلسٹ۔ میں آپکے اس اعلیٰ درجہ کے خیال کی قدر کرتا ہوں۔ مگر کیا حکومت کا فرض نہیں کہ وہ اسکے بدلہ میں کچھ دے۔ اس لئے کہ دنیا میں **دو اور لو** کا اصول کام کرتا ہے۔

عرفانی۔ آپ میرے ساتھ انصاف کریں گے کہ اس سوال کا جواب میرے ذمہ نہیں آپ حکومت ہند کے کسی ذمہ دار سے پوچھیں۔

جرنلسٹ۔ آپ کبھی محسوس نہیں کرتے کہ ہندوستان کو اس وفاداری کے صلہ میں آزاد کر دینا چاہئے

عرفانی۔ آپ حیران ہوں گے جب میں یہ کہوں گا۔ کہ میں کبھی محسوس نہیں کرتا۔ کہ ہندوستان کی ان خدمات کے بدلہ میں جو اسنے حرب عظیم میں کی ہیں۔ حکومت ہند کو آزاد کر دینا چاہئیے۔ اور اگر حکومت ہند اس کے صلہ میں ایسی آزادی دے تو کم از کم میں اسکو اپنی ہتک سمجھوں گا۔ ہاں میں ہندوستان کا فطاتی حق سمجھتا ہوں۔ کہ اسے آزاد ہونا چاہیئے۔

جرنلسٹ۔ آپ ٹاگور کو جانتے ہیں

عرفانی۔ ہاں میں ٹاگور کو جانتا ہوں وہ ایک لٹریری دماغ کا انسان ہے۔ اور ہندوستان کو ایسے آدمیوں پر فخر ہے

جرنلسٹ۔ گاندھی اور ٹیگور میں کیا فرق ہے۔

عرفانی۔ آپ کے سوال کا جواب بھی میرے اپنے نقطۂ خیال سے ہوگا۔ گاندھی اور ٹیگور میں وہی فرق ہے۔ جو ایک شاعر اور مدبر میں ہوتا ہے۔ مگر میں گاندھی کو اعلےٰ درجہ کا سٹیٹسمین نہیں مانتا۔ دونوں میں ایک تخیل کام کرتا ہے۔ ٹیگور کا تخیل کم از کم شاعرانہ ہے۔ مگر گاندھی سیاست کے غلط راستوں میں پھر رہا ہے

جرنلسٹ۔ گاندھی کی تمام یورپ عزت کرتا ہے۔ اور اسے بہت بڑا لیڈر سمجھتا ہے۔

عرفانی۔ میں یورپ کا اس کے لئے شکر گذار ہوں۔ کہ وہ ہندوستان کے ایک فرزند کی نسبت ایسی اچھی رائے رکھتا ہے۔ مگر آپ مجھے اس آزادی سے کہنے کے لئے معاف کریں گے کہ یورپ گاندھی کی اسلئے عزت کرتا ہے۔ کہ

وہ انگریزوں کے خلاف کام کر رہا ہے

پس اگر گاندھی کی جگہ کوئی اور شخص یہی کام کرے تو یورپ اسکو بھی بڑی عزت سے دیکھے گا۔

جرنلسٹ۔ کیا آپ معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں۔ کہ آپ گاندھی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں

عرفانی۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ میرے جوابات سے آپ کو ایسا خیال پیدا ہوا۔ میں گاندھی کی عزت کرتا ہوں اور اُسے ایک شریف اور ملکی خیر خواہ سمجھتا ہوں۔

جرنلسٹ۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ ہے۔ کہ آپ نے بہت سا وقت دیا کیا آپ بتا سکینگے کہ آپکے سفر کی غرض کیا ہے؟

عرفانی۔ مجھے تو آپ — ملکر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئیے۔ میرے سفر کی یہی

غرض ہے۔ جو ایک جرنلسٹ کی ہونی چاہیئے۔ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس سفر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

مشرق مغرب کو کیا دیسکتا ہے۔ اور مغرب کیا لے سکتا ہے

اس قدر گفتگو کے بعد انہوں نے اجازت چاہی اور کل صبح مجھے ناشتہ کی دعوت ہوٹل وکٹوریہ میں دی ہے۔ جہاں میں اس سے انٹرویو بھی کروں گا۔

اب دس بج چکے تھے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ باہر نکلکر اور شہر کی سیر کروں۔ جب میں چوک میں گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر شتم میری تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ میں نے انکو دیکھا اور بلایا۔

مسٹر شتم مسٹر عرفانی میں آپ کی تلاش میں صبح سے نکلا ہوا ہوں۔ میں اس ہوٹل میں آنا چاہتا ہوں جہاں آپ ٹھہرے ہیں۔

میرے دریافت کرنے پر کیا کیا پیش آیا۔ کہا کہ واقعی وہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ اگرچہ مجھے کسی قسم کا مالی نقصان تو ایسے طور پر تو نہیں پہنچا۔ کہ میں سے چوری یا خیانت کہوں۔ مگر وہ ایسے طریقے سے میرا خرچ کرا رہے ہیں۔ کہ بہت تکلیف کا احتمال ہے۔ میں نے اسکو مناسب مشورہ دیا۔ اور اپنے ساتھ ہوٹل میں لیگیا۔ اور وہاں سے پورٹر دحال، لیکر وہ اپنا اسباب اُٹھوا لائے۔ معلوم ہوا کہ ایک رات میں قریباً دو پونڈ ان سے وصول ہو چکے ہیں۔

ضروری ہدایات یہ میرا اپنا ہی تجربہ نہیں ہے۔ بلکہ اکثر سیاحوں نے متفق طور پر یہ بات کہی ہے کہ جب تم یورپ کے کسی شہر میں جاؤ تو حتے الوسع مشہور اور بڑے ہوٹل میں قیام کرو۔ اسلئے کہ بڑے ہوٹلوں میں کسی قسم کے دغا فریب کا ہوٹل والوں کیطرف سے خطرہ نہیں ہوتا یہ سچ ہے کہ وہ گراں ہوتے ہیں لیکن ان بڑے ہوٹلوں میں سستے کمرے بھی ہوتے ہیں۔ جو عموماً اوپر کی منزلوں میں ہوتے ہیں۔ جسقدر آپ اوپر جائیں گے۔ کرایہ ارزاں ہوگا۔ علاوہ بریں روانگی سے پہلے اگر آپ طامس کک یا کسی اور کمپنی کی معرفت اپنے سفر کا انتظام کرتے ہیں۔ تو یہ بہتر ہوگا۔ کہ اس کمپنی کی معرفت ہوٹل کا بھی انتظام کرلیں اور وہ سستے سے سستے ہوٹل کا بھی بندوبست کر دیتے ہیں۔ ان مشہور ایجنٹس کے ذریعہ بک کئے ہوئے ہوٹلوں میں بھی کسی فریب اور دغا کا خطرہ نہیں رہتا ہے لیکن جو لوگ اس قسم کے ہوٹلوں سے محض اسلئے فائدہ نہیں اٹھاتے کہ خود جا کر سستا اور اچھا ہوٹل تلاش کرینگے وہ اکثر اوقات غلطی کرتے ہیں۔ اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔

غرض مسٹر شمنم بھی میرے ہوٹل میں اُٹھ آئے۔ اور اب انہوں نے بھی پسند کیا۔ کہ جب تک میں یہاں قیام کروں۔ وہ میرے ہمراہ رہکر وینس کی سیر کریں۔ چونکہ انکو وینس کی آبادی اسکی خوبصورتی اور اس سمندری شہر کی رونق ایک اچنبا سا معلوم ہوتی تھی وہ مجھے کہنے لگے ہیں تو گویا خواب دیکھتا ہوں اس لئے میں نے ان کا نام **مسٹر خواب آلود رکھدیا**۔ ان کا ذکر کبھی اس نام سے آئیگا۔

میرا اپنا خواب

۶ اور ۷ جولائی ۱۹۲۵ء کی درمیانی شب کو میں نے خواب میں دیکھاکہ میری تیسری لڑکی حامدہ خاتون کا انتقال ہوچکا ہے۔ اور میں گویا کہیں باہر ہوں جب میں گھر گیا ہوں تو مجھے تکلیف ہوئی اور اس خبر کے سننے سے بہت رویا۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کا جنازہ ابھی حضرت اقدس پڑھنے والے ہیں اور جنازہ کہیں بھیجنے کی تجویز ہے۔ مگر حضرت صاحب نے فرمایا کہ یہیں دفن کردو۔ اور خود جنازہ پڑھانے آئے ہیں میں شریک ہونے لگا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی میں نے نماز ظہر بھی پڑھنی ہے ایک شخص جماعت کرارہا تھا۔ اس نے قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھکر تفسیر شروع کردی۔ اور پھر خود ہی اسکو خیال آیا۔ میں نے نماز توڑ دی اور اپنی الگ پڑھنے لگا۔ مولوی غلام رسول صاحب نے کہاکہ یہ روزانہ مشق کا نتیجہ ہے اتنے میں حضرت صاحب نے جنازہ کی نماز شروع کردی۔ تو میں نماز میں شریک ہونے کے لئے اس طرف چلا۔ تو ایک بہت بڑے اونچے بیل نے مجھپر حملہ کیا۔ مگر کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ میرے ہاتھ کو اس نے منہ میں ڈالدیا میں نے شور مچایا۔ تو چودھری فتح محمد صاحب پاس ہیں اور انہیں ہمت نہیں پڑتی۔ البتہ چودھری نظام الدین صاحب آگے بڑھے۔ اور اس کے منہ کو الگ کیا۔ اس بیل نے کہا کہ میں اسپر تو حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ اور پکڑنا تھا۔ یہ ادھر سے گذرے اس لئے ایسا ہوگیا۔ غرض میں اپنے مکان میں آیا۔ دیکھاکہ خوب سفیدی ہورہی ہے۔ مبارکہ (میری بہو) نے حامدہ کی وفات کا واقعہ سنایا۔ اور کہاکہ حضرت صاحب نے اسے مقبرہ بہشتی میں دفن کردیا ہے۔

"میں نے یہ خواب لکھکر اس پر نوٹ لکھا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ کہ کیا ہوگا۔ وہ اپنے فضل سے اس تقدیر کو ٹالدے۔ آج کچھ صدقہ بھی کیا۔"

مشاہدات عرفانی میں اس خواب کے درج کرنے کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ یہ بھی میرا ایک مشاہدہ ہے۔ گو یہ دوسرے عالم میں تھا مگر خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے قبل از وقت ایک آنے والے واقعہ سے مجھے اطلاع دی۔ تاکہ میں اس کے لئے مہیا ہو جاؤں۔ چنانچہ میں لنڈن میں تھا۔ نور عزیزہ

حامدہ خانون کی وفات کی خبر بذریعہ تار پہنچی۔

حامدہ کی وفات نے اس خواب کی حقیقت ظاہر کردی۔ کہ یہ واقعہ ایسے وقت ہوگا۔ جب کہ میں قادیان میں نہ ہوں گا۔ اور حضرت کی دعا، نماز جنازہ اسکو بہشتی مقبرہ میں دفن کردینے کی مترادف ہو جائیگی میں ان واقعات کو یہاں نہیں لکھتا۔ جو انکی وفات کے متعلق ہیں۔

خدا نے دی اور اُسی نے لی۔ اور اس کا انجام بہت اچھا ہوا۔ اللہ تعالےٰ اُسے میرے لئے فرط بنا دے آمین!

میں اور مسٹر شمسؔ اب باہر نکلے تاکہ وینس کی سیر کریں۔ قبل ازیں کہ میں وینس میں اپنے مشاہدات کا ذکر کروں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ وینس کے متعلق بعض تاریخی اور جغرافیائی حالات درج کردوں تاکہ قارئین کو پورا لطف حاصل ہو۔ اور ان کے معلومات میں مفید اضافہ ہوسکے۔ بہت ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ان کوائف سے کیا فائدہ؟ مگر یہ غلطی ہوگی۔ اگر ہم اپنے معلومات میں کچھ اضافہ نہیں کرتے۔ تو ایسے سفر محض ایک دماغی عیاشی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

وینس کے تاریخی اور جغرافیائی حالات

وینس جسکو اہل اٹلی وینیشیا کہتے ہیں۔ بحیرہ ایڈریاٹک میں اٹلی کا بہت بڑا بندرگاہ اور ایک قدیم مشہور شہر ہے۔ اسی نام کے ایک صوبہ کا دارالخلافہ ہے۔ اور بحیرۂ ایڈریاٹک کے سرے پر واقع ہے۔ وینس کم وبیش چھوٹے چھوٹے ایک سو پانچ جزیروں کا مجموعہ ہے۔ جنکو نہروں اور پلوں کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔ یہ سمندر میں واقع ہے۔ اور براعظم سے اسکو بہت بڑے عظیم الشان پل کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔ جو ریلوے سٹیشن پر ہے۔

وینس کی آبادی دو لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ وینش قوم نے ابتدائی تاریخ میں اپنی ہستی کو نمایاں رکھا ہے وہ ایک فاتح اور زبردست قوم تھی۔ جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ یہ یورپ کا ایک شہر ہے۔ مگر اس کے آباد کرنے والے ایشیائی تھے۔ جو ایشیائی کوچک سے وہاں پہنچے۔ اور سیرین نسل کے لوگ تھے۔ اور انہی کے نام پر اسکا نام VENEZIA یا VENICE ہوگیا لیکن جب اٹلی پر اٹیلا نے حملہ کیا۔ تو یہ لوگ گریڈ اور بعض دوسرے قریبی جزائر میں بھاگ گئے۔ وینس کی تاریخ عموماً یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ قریباً ۴۵۱ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اس شہر اور صوبہ پر مختلف دور آتے رہے۔ اور قسم قسم کے انقلاب ہوئے۔

وینس میں اگرچہ پہلے ہی ایک قسم کی جمہوری حکومت تھی۔ لیکن اس کا شاندار عہد ۸۱۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاج انجیلوس کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔

۸۲۸ء میں اس جمہوری حکومت کا قومی اور ملی نشان شیر کا قرار پایا۔ جسکا ایک بازو انجیل مفتوحہ پر رکھا ہوا ہے۔ یہ نشان فتح عظیم کی یادگار اور سینٹ مرقس کی نعش کی بازیافت کی یادگار تھا۔ جس کو دشمنوں نے اسکندریہ میں گرفتار کر لیا تھا۔ انکی یادگار میں شہر کے قلب میں ایک بہت بڑا گرجا اسکے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جو وینس کی تمام تر خوشنمائی اور شہرت میں نمایاں حصہ رکھتا ہے۔ میں اس کے حالات آگے چلکر بیان کرونگا۔ وینس کے تجارتی تعلقات ان ایام شہرت و عروج میں مشرق اقصیٰ تک پہیلے ہوئے تھے۔ صلیبی جنگوں میں وینس نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ۱۱۰۰ء سے لیکر ۱۲۷۰ء تک وہ اس جنگ و جدل میں مصروف رہا۔ اور ایڈریاٹیک کے ساحل پر اس کا بہت بڑا قبضہ ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ اس قوم کی حکومت اس قدر وسیع ہوئی کہ ۱۲۰۴ء میں وینس کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ اور رومن امپائر کے نصف حصہ کا مالک ہو گیا۔ اور اب یہ معمولی جمہوری ریاست نہ تھی۔ بلکہ

وینشن امپائر کہلاتی تھی

اور اس کے اقتدار نے جنیوا اور پیسا کی حکومتوں کو حاسد بنا دیا۔ اور ان سے جنگ ہوئی ۱۳۸۰ء میں جنیوا والوں کو بھی شکست ہو گئی۔ جبکہ دونوں قوموں کے درمیان مصالحت ہو گئی دوسری طرف وینس نے اپنے بحری مقبوضات کو وسعت دی۔ دن بدن یہ اقتدار بڑھتا گیا۔ اور قومی عروج کی شان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جبکہ ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ اور آخر اسی بہادر قوم نے وینس کی امپائر کو نیچا دکھایا۔ اور قریباً پچاس سال تک ان سے جنگ رہی۔ میں اب مزید انقلابات یا محاربات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ مشاہدات عرفانی کا موضوع تاریخ بیان کرنا نہیں۔ بلکہ جہاں ضرورت ہو سرسری ذکر اسلئے کر جاتا ہوں کہ اس کے پڑھنے والوں کی عام واقفیت میں اضافہ ہو۔ اور اس کے ضمن میں میرا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اسلامی تاریخ سے اس کا کوئی تعلق ہو تو اُسے نظر انداز نہ کیا جائے۔ میں کریٹ کے ذکر میں لکھ چکا ہوں کہ ترکوں نے کریٹ کو وینس کی جمہوریت سے ہی فتح کیا تھا۔ اس طرح پر وینس میں اسلامی اور ایشیائی تاریخ کے نشان مجھے نظر آتے تھے۔ اور میری دلچسپی کو بھی چیز بڑھا رہی تھی۔ میں اس کے گلی کوچوں میں سے گذرتا تھا۔ اور وینس کے بہادروں اور قومی عمارت کے

معماروں کی یادگاروں کو دیکھتا تھا۔ اور اسلامی حقوق کی بازیافت پر غور کرتا تھا۔ کہ کس طرح ہم پھر اہل وینس کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ میں نے اس سوال پر غور کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ تلواروں اور توپوں کی جھنکار اور گرج سے نہیں۔ بلکہ محبت و آشتی کے زبردست لہر کے ساتھ ہم اپنے ایشیائی بھائیوں کی اس نسل کو باوجود مغربی بننے کے پھر مشرق سے متحد کر سکتے ہیں۔ اور وہ صرف

اسلامی تعلیم کی اشاعت ہی ہے

مجھے افسوس ہوا اگر ترک ان ملکوں میں تلوار کی بجائے قرآن لے کر آتے۔ تو آج یہ ملک مسلمان ہوتے۔ اور اسلام کیلئے ہر وقت اپنی جانی اور مالی قربانیوں کیلئے آمادہ ہوتے۔ اگر اس وقت کو ہم نے کھو دیا۔ تو اب اس سے غفلت برتنا گناہ ہے۔ وینس کی اس تاریخی اور مختصرہ جغرافیائی کیفیت کے بعد اب ہم اس کی سیر کرتے ہیں۔

وینس کے گنڈولہ چونکہ وینس سمندر میں واقعہ ہے۔ اور اس کے گلی کوچوں میں پانی کی نہریں جاری ہیں۔ اور جہاں جانا ہو کشتیوں کے ذریعہ سے جاتے ہیں۔ جنکو یہاں گنڈولہ کہتے ہیں۔ میں نے کشمیر میں بھی کشتیوں کے ذریعہ دریا کی سیر کی ہے۔ اور دریائے جہلم جو شہر سری نگر میں بہتا ہے۔ پلوں کے ذریعہ سے شہر کے دونوں حصوں کو ملاتا ہے۔ وینس میں تمام آمد و رفت کشتیوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور بعض جگہ چھوٹے چھوٹے پل بھی ہیں۔ یہ کشتیاں یا گنڈولے نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور بعض خصوصیت سے سجائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وینس میں انکے سوا اور کوئی سواری نہیں ہوتی اسلئے سڑکوں پر پولیس کو ٹریفک کے کنٹرول کیلئے محتاط رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ کوئی موٹر گھوڑا گاڑی آپ کو نظر نہ آئے گی۔ اس حصہ کے علاوہ جو بڑی نہر پر واقعہ ہے۔ تمام گلی کوچے تنگ ہیں۔ میں گنڈولوں کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ہر وقت نہر میں تیرتے رہتے ہیں۔ اور کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی تو ایک کشتی ہے مگر اسکی نوک بہت اونچی ہوتی ہے۔ اور اس کے درمیانی حصہ کو دھوپ یا بارش سے بچانے کیلئے یا سواری کی ذاتی خواہش پر لوہے کی سیخوں کے ذریعہ ایسا پردہ دار اور سقف بنا دیتے ہیں کہ درمیانی حصہ یعنہ ایک خوشنما پالکی بنجاتا ہے۔

گنڈولہ والے کسی حالت اور صورت میں کشمیر کے مانجی سے کم نہیں۔ البتہ ان کا کنبہ ان گنڈولوں میں نہیں ہوتا ان لوگوں کے اخلاق اعلےٰ درجہ کے نہیں ہوتے کشمیریوں کی طرح ایک بات اور ان میں میں نے مشاہدہ کی کہ

جیسے وہ جب کسی خانقاہ یا مزار کے پاس سے گذرتے ہیں۔ تو سر جھکاتے ہیں۔ اور آداب بجالاتے ہیں اسی طرح یہ لوگ جب اپنے مسافروں کو لئے ہوئے ادہر سے اُدہر جاتے ہیں۔ اور سینٹ میری یا کوئی اور گرجہ سامنے آجاتا ہے۔ تو وہاں سے بغیر اپنی نذر عقیدت کو اشارے سے ادا کئے بغیر آگے نہیں چلتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مشرکانہ عقاید یا رسوم میں یہ ہرگز کم نہیں لیکن کشمیری تو عقیدۂ موّاحد ہیں مگر یہ لوگ پہلے ہی تثلیث کے پوجاری ہیں۔ رات کو ان گنڈولوں کی بہار قابل دید ہوتی ہے۔ شوقین اور رنگین مزاج لوگ اور باہر سے آئے ہوئے سیاح رات کو گنڈولوں کو لے کر دور دور نکلجاتے ہیں۔ بلکہ راگ و رنگ کی محفلیں بھی انہیں گرم کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں نے ان گنڈولہ والوں کے اخلاق کو پست کر دیا ہے۔

آمد و رفت کے وسائل

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں وینس ایک جزیرہ ہے۔ اور تمام شہر کے گلی کوچے چھوٹی چھوٹی نہروں سے بنتے ہیں۔ اسلئے آمد و رفت کا واحد ذریعہ بھی گنڈولے اور کشتیاں ہیں۔ مگر موٹر لانچ بھی چلتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کی کمپنیاں بھی ہیں جن کے جہاز باقاعدہ ہر پانچ منٹ کے بعد مختلف سمتوں کو روانہ ہوتے رہتے ہیں۔ اور اپنے سمندری یا نہری سٹیشنوں پر ٹھہرتے ہوئے چلتے رہتے ہیں۔ ان کا کرایہ سستا ہوتا ہے۔ اور سینکڑوں لوگ ہر دفعہ ان میں سوار ہوتے ہیں وینس سے کچھ تھوڑے فاصلے پر ایک اور جزیرہ ساحل سمندر پر ہے۔ جسکا نام لیڈو ہے۔ اس جگہ سمندری غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ اور لیڈو خصوصیت سے اسی مقصد کیلئے مشہور ہے۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ یہاں میں نے وسائل آمد و رفت کے سلسلہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لیڈو میں برقی ٹرامیں اور موٹر اور گھوڑا گاڑی بھی ہے۔ سمندر کے کنارے کنارے جہاں نہانے کے لئے غسل خانوں کا انتظام ہے اور نئی آبادی ہے۔ ٹرام وے جاری ہے۔ جو لیڈو کے بڑے بازاروں میں سے بھی گذرتی ہے۔ اور موٹریں بھی کثرت سے چلتی ہیں لیکن وینس میں اسکی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے اور ہر شخص آسانی سے راستوں کو عبور کر سکتا ہے۔

وینس کی خوبصورتی

وینس کی خوبصورتی ان آبی راستوں اور شاندار مکانات اور شیشہ کے عجیب و غریب کام کیوجہ سے ہے۔ اور اسکی شہرت میں لیڈو کے غسل خانوں نے بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اور ہر سال یورپ اور امریکہ سے ہزاروں لاکھوں سیاح یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا صحت افزا بھی گئی ہے۔

پینے کا پانی قریباً ۶۰ میل سے لایا گیا ہے۔ اور ایسی جگہ سے جہاں کا پانی صحت کیلئے خاص طور پر مفید سمجھا گیا ہے۔ چونکہ سمندر کا پانی نمکین ہے۔ اسلئے میٹھے پانی کے لئے اس قدر مشقت کرنی پڑی کہ ۶۰ میل سے بڑے بڑے نلوں کے ذریعہ شہر میں اسے پہنچایا گیا ہے اور اب وہ بافراط ملتا ہے۔ مگر جہاں تک پانی کے پینے کا سوال ہے۔ بہت تھوڑے لوگ اسے پیتے ہیں۔ بلکہ

پینے کیلئے تو شراب ہے

اور یہ میٹھا پانی کھانا پکانے کے اور دوسری اس قسم کی ضروریات کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ہنگرین جرنلسٹ سے ملاقات

جیسا کہ قرار پا چکا تھا میں ہوٹل وکٹوریہ میں ہنگرین جرنلسٹ سے ملاقات کیلئے گیا۔ اسکا نام پروفیسر اے سٹرونس ASTRONS ہے۔ یہ ایک قابل جرنلسٹ ہیں اور محض تفریح اور صحت کے نقطۂ خیال سے یہاں آئے ہوئے ہیں وہ یورپ کی متعدد زبانیں جانتے ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ میری گفتگو ان سے انگریزی ہی میں ہوئی چونکہ ہم دونوں کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے یا انکو اپنی زباندانی پر ناز تھا۔ اور ہم باوجود غلطی کرنے کے بھی جھجکتے نہ تھے۔ میرے انٹرویو کا موضوع اثرات جنگ تھا۔ چنانچہ حسب ذیل گفتگو ہوئی۔ قدرتی طور پر ابتدائی تبادلہ مکالمات محض ایک دوسرے سے ملنے کی خوشی اور اظہار امتنان پر مبنی تھا میں صرف اس حصہ کو درج کرتا ہوں۔ جو مرکزی نقطہ ملاقات کا تھا۔

عرفانی۔ جنگ عظیم نے آپ کے ملک پر کیا اثر کیا ہے؟

پروفیسر۔ جنگ عظیم کا اثر ہر ملک پر مصیبت اور مفلسی کی لعنت ہے۔

عرفانی۔ میں اپنے مطلب کو واضح نہ کر سکنے پر افسوس کرتا ہوں میرا خیال تھا۔ کہ آپ میرے اس مختصر سے سوال کو کافی سمجھیں گے۔ میری مراد یہ ہے کہ اخلاقی اور مذہبی طور پر ملک پر کیا اثر ہوا ہے۔

پروفیسر۔ آپ جانتے ہیں کہ جس چیز کا نام **جنگ** ہے وہ انسان اور اس کے اخلاق کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ جو لوگ لڑائی میں مارے جاتے ہیں۔ وہ ان سے اچھے رہتے ہیں۔ جو زندہ رہجاتے ہیں اسلئے کہ تمام مصیبتوں کا شکار وہی ہوتے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ جنگ جب ہوتی ہے تو مذہب اور اخلاق کو چھوڑ کر ہوتی ہے۔

عرفانی۔ ایک حد تک میرا آپ کے ساتھ اتفاق ہے لیکن ہمیشہ اور ہر جنگ اخلاق اور مذہب

کو تباہ کرنے کیلئے نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اخلاق اور مذہب کی حفاظت کیلئے بھی جنگ کرنی پڑتی ہے اسلئے میں آپ سے بافسوس معافی چاہتا ہوں۔ کہ میں اصولاً بھی صرف ایک حد تک آپ سے اتفاق کر سکتا ہوں۔ اور عام طور پر تو بالکل اتفاق نہیں کرتا۔

(میرے اس جواب پر پروفیسر صاحب نے مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ اور بہا پا میں سمجھتا تھا کہ میرے جواب میں انکو ایک ایسی بات نظر آئی ہے۔ جکی شاید انکو توقع نہ تھی۔ اور وہ میر الحکمۃ رس یا نکتہ گیر ہونا تھا)

پروفیسر میں بہت خوش قسمت ہوں کہ آپ جیسے مشرقی عالم سے ملنے کی عزت رکھتا ہوں آپ ہر امر کو بہت وسیع نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور آپ کے ویوز بہت وسیع ہیں۔

عرفانی۔ آپ کے نیک خیال کا شکریہ ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کی اس قدر دانی کا حقدار ہو سکتا ہوں۔

پروفیسر میں نے تو آپ کے اس کلام سے سمجھ لیا ہے کہ آپ سرسری طور سے کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔

عرفانی۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے اور آپ کے قیمتی وقت کو ایک دوسرے کے خیالات کی محض قدر دانی پر قربان کردیں۔ اسلئے میں جناب کو اپنے سوال پر توجہ دلاتا ہوں۔

پروفیسر۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جنگ کے شرارے کے ساتھ ہی اخلاقی حس ضائع ہوگئی اور اب لڑائی کے خاتمہ کے بعد مفلسی اور بیکاری نے ہم کو اخلاق سے ننگا کر دیا ہے۔

عرفانی۔ میں آپ کے بیان کی عزت کرتا ہوں۔ مگر کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں ان قوموں کو جو اس جنگ میں شریک نہیں۔ بداخلاق کہوں

پروفیسر۔ نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔

عرفانی (ہنسکر) تو پھر مجھے کہنے دیجئے۔ کہ آپ نے اپنے اصول کو خود چھوڑ دیا۔

پروفیسر (ہنسکر) میں ایسا خیال کرتا ہوں۔

عرفانی۔ آپ کے ملک کی مذہبی حالت کیسی ہے؟

پروفیسر۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ لوگ مذہب پر عملاً یقین کرتے ہیں۔ یا نہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ

بہت ہی کم۔
اور اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی مذہب کہتے ہیں تو میں کہوں گا۔ کہ وہ برائے نام عیسائی ہیں
اور کچھ یہودی ہیں ہیں۔
عرفانی۔ کیا لوگ عیسائی مذہب پر قانع ہیں۔ اور وہ اس سے تسلّی یافتہ ہیں۔
پروفیسر۔ یورپ میں لوگ مذہب کو اپنی قوم کے لحاظ سے مانتے ہیں۔ ورنہ مذہبی روح ختم ہو چکی ہے۔
عرفانی۔ وہ مذہب کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یا کسی دوسرے مذہب کی تلاش میں ہیں۔
پروفیسر۔ میرے خیال میں لڑائی نے اس قدر بیکاری اور مفلسی پیدا کر دی ہے۔ کہ وہ سب سے پہلی چیز جس کی ضرورت سمجھتے ہیں

روٹی ہے مذہب نہیں

عرفانی (ہنسکر) شاید اسی لئے مسیح نے روزانہ دعا میں یہ تعلیم دی تھی۔ کہ

آجکی روٹی ہمیں بخش

میرے اس کہنے پر پروفیسر صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔ اور مجھے کہنے لگے۔ کہ

آپ تو بڑے ہی زندہ دل فقرہ باز ہیں

میں نے یورپین آداب کو اسی زندہ دل کے رنگ میں مد نظر رکھکر

آپکی اس قدر دانی کا شکریہ کہا

عرفانی۔ آپ نے اس جنگ میں کیا کھویا۔ اور کیا پایا۔
پروفیسر۔ ہم نے سب کچھ کھویا ہمارے نوجوان بہادر مارے گئے۔ اموال کا نقصان ہوا۔ ملک یتیموں اور بیوہ عورتوں اور رانڈ ماؤں سے بھر گیا۔ اور اب ہم مفلس قوم کی زندگی بسر کر رہے ہیں اپنے ملک کی تعمیر میں بہت کچھ کھونا پڑے گا۔
عرفانی۔ مجھے آپ کے ساتھ اس مصیبت میں ہمدردی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ نے بیشک یہ سب کچھ کھویا۔ لیکن آزادی ہی تو حاصل کر لی ہے۔ اگر مجھے اپنے ملک کی آزادی اس قیمت پر مل سکتی تو میں اسے گو پسند نہ کرتا مگر اس کے مقابلہ میں اسے حقیر سمجھتا۔

پروفیسر۔ ہاں یہ سچ ہے۔ کہ اب ہم آپ اپنے ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ مگر ایک غریب ملک اپنے لئے کیا کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کیلئے کیا آپ کسی جنگ کی توقع کرتے ہیں۔

عرفانی۔ آزادی کیلئے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ مگر میں تلواروں اور توپوں کی جنگ کا قائل نہیں۔ میں چاہتا ہوں میرا ملک بغیر ایک قطرہ خون گرانے کے آزاد ہو جائے۔

پروفیسر۔ بالکل ناممکن۔ بالکل ناممکن۔

عرفانی۔ میں خیال کرتا ہوں آپ نپولین کی زندگی سے واقف ہیں؟

پروفیسر۔ بہت اچھی طرح اسکی ساری عمر کشت و خون میں گذری۔

عرفانی۔ نہیں میں اسکی لڑائیوں پر بحث نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے اس بلند خیالی کیطرف دیکھتا ہوں جو اس نے ناممکن کے لفظ کے متعلق ظاہر کی ہے۔

پروفیسر (ہنسکر اور محجوب سا ہو کر) ہاں! ہاں! آپ کی مراد ہے کہ

یہ لفظ احمقوں کی لغت میں پایا جاتا ہے

عرفانی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر پروفیسر صاحب سنئے! میں آپ کو اس زمرہ میں داخل نہیں کرتا

پروفیسر۔ تو آپ کسطرح آزادی چاہتے ہیں۔ جو بغیر خون کے حاصل ہو جائے۔

عرفانی۔ محبت اور اخوت کے جھنڈے کے نیچے۔

پروفیسر۔ آزادی تو جنگ کو چاہتی ہے۔ محبت سے آزادی حاصل نہیں ہوتی۔

عرفانی۔ میں تو ہر حال میں اسے محبت سے لینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے انگریز بھائی اسلام قبول کرلیں۔ تو ہم خود ہی آزاد ہو جائیں گے۔ ہمارے اور ان کے درمیان جو اختلاف ہے۔ وہ جاتا رہیگا۔ اور ہم سب ایک ہوں گے۔

پروفیسر۔ کیا مسلمان آپس میں نہیں لڑتے۔

عرفانی۔ لڑائی کا سوال نہیں دنیا سے لڑائی تو کبھی اٹھ نہیں سکتی۔ اور میرے فلسفہ میں لڑائی بھی انسان کو بہت سے اخلاق سکھانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس کے بہت سی مخفی قوتوں کے ظہور کا باعث

پروفیسر۔ آپ سمجھتے ہیں کہ انگریز مسلمان ہو جائیں گے۔

عرفانی۔ میں تو یقین رکھتا ہوں کہ ہر دانشمند آدمی اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پروفیسر۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو شاید آپ کو خوش رکھ سکتی ہے۔ مگر عملاً یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں بڑے بڑے سائنس دان اور علمی آدمی گذرے ہیں۔ اور اب بھی موجود ہیں۔ مگر وہ مسلمان نہیں ہیں اور شاید اسلام کے مخالف ہوں۔

عرفانی۔ مجھے تعجب ہے اور افسوس بھی۔ کہ آپ کی ایسی عالمانہ باتوں سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے۔ مجھے تو وہم بھی نہیں آسکتا کہ کوئی شخص اسلام کو سمجھ لینے کے بعد اس کا انکار کرے۔

پروفیسر۔ معاف فرمائیے ہم نے ترکوں کو دیکھا ہے انہیں دیکھ لینے کے بعد مشکل ہے کہ اسلام کو کوئی درجہ دیا جا سکے۔

عرفانی۔ یہ طریق صحیح نہیں اسلام کسی آدمی یا قوم کا نام نہیں بلکہ ایک تعلیم اور سائیں کا نام ہے اسکی حقیقت اور عزت کا یہ صحیح پیمانہ نہیں ہے۔

پروفیسر۔ ہاں یہ تو سچ ہے لیکن اگر اسلام کی تعلیم اعلےٰ درجہ کی ہوتی تو کیا وہ ترکوں میں کوئی تبدیلی نہ کرتی۔

عرفانی۔ کس قسم کی تبدیلی آپ چاہتے ہیں۔ ترک آخر آدمی ہیں۔ اور یورپ میں بادشاہ ہیں جس طرح دوسری حکومتیں انسے برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ بھی ان سے کرنا چاہتے ہیں۔ اسمیں اسلام کا کیا دخل۔ عیسائی مذہب کہتا ہے۔ کہ اگر کوئی تیرے دائیں گال پر طمانچہ مارے۔ تو بائیں بھی پھیر دو۔ کیا جنگ یورپ میں یا آج اس تعلیم پر یورپ کی عیسائی حکومتیں عمل کر رہی ہیں۔

پروفیسر۔ ہم اپنے موضوع سے دور چلے جائیں گے۔ ہم دونوں مسافر ہیں بہت اچھا ہوگا۔ اگر ہم ایسی باتیں کریں جن سے قومی جذبات مجروح نہ ہوں۔

عرفانی۔ بالکل درست ہے میں تو کسی شخص کے بھی قومی جذبات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا۔ اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ افسوس یہ ہے کہ لوگ اسلام اور مسلمان میں تفرقہ نہیں کرتے۔ اگر وہ ایسا کریں۔ تو انکو اسلام کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

پروفیسر۔ (مضمون سے کترا کر) کیا میں یہاں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔

عرفانی۔ آپ کا شکریہ ہے۔ میں یہاں مسافر ہوں۔ اور آپ بھی یہاں میں یہاں کے سب سے پرانے اخبار کے دفتر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اسکا انتظام کر سکیں تو میں بہت ممنون ہونگا۔

پروفیسر صاحب نے فوراً GARRETTINO نام اخبار کو ٹیلیفون کیا۔ اور میری آمد کی اطلاع دی۔ اور میری منشا ءسے واقف اخبار کے اڈیٹر نے جسکو یہاں ڈائرکٹر کہتے ہیں علی الصباح ہوٹل میں اپنا نمایندہ بھیجنے کی خواہش کی جو مجھے اخبار کے دفتر میں لیجائیگا۔ اسپر مینے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اور اجازت چاہی تاکہ وینس کی سیر کیلئے موقعہ پاسکوں۔ میں سٹرشنم کے ہمراہ شہر کے قابل دید مقامات کو دیکھنے کیلئے گیا۔ اور سب سے اول سینٹ مارک (مرقس) کے چوک اور گرجا کی طرف گیا۔

سینٹ مارک چوک اور گرجا

دراصل اس شہر کا مرکزی مقام رونق یہی جگہ ہے۔ جس کے تین طرف دوکانیں ہیں۔ اور بڑے بڑے قہوہ خانے اور رسٹارنٹ ہیں۔ اور ایک طرف سینٹ مارک (مرقس) کا عظیم الشان گرجا ہے۔ اور پھر اس گرجہ سے ملتا ہوا شاہی محل (ڈوج کا محل) چلا جاتا ہے جو اپنے اندر بیسیوں قسم کے عجائبات رکھتا ہے۔

شہر کی ولایت کا خیال

میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اب اس شہر کی ولایت اور حفاظت وسرپرستی سینٹ مرقس کو دی گئی ہے۔ پہلے کوئی اور ولی اسکا محافظ اور سرپرست تھا۔ جب میں نے یہ سنا تو مجھے عام مسلمانوں کے ایک خیال یا وہم کی طرف توجہ ہوئی۔ عام طور پر میں نے پہلا میں سنا ہے کہ اس یا اس شہر کی ولایت فلاں قطب یا ابدال کے سپرد ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ مختلف اولیاء اللہ ابدال اور مجذوبوں کے کچھ علاقے ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے اپنے علاقوں پر قابض ہوتے ہیں اور ان شہروں کا امن اور ترقی ان کے دم سے ہوتی ہے۔ اسی طرح پر مجھے یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ یہ عیسائی لوگ بھی اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ وینس کے متعلق ان کا یہی خیال ہے کہ اس شہر کی ولایت اور سرپرستی سینٹ مارک کے حصہ میں آئی ہے۔ اور اسی کی نظر عنایت سے شہری اپنے امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس عقیدہ یا خیال کی حقیقت کچھ اور ہی ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے پیارے بندوں اور برگزیدہ مرسلوں کیلئے عجیب و غریب کام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بندہ کیلئے بعض اوقات وہ شہروں کو برباد کر دیتا ہے۔ اور کبھی ایک راستباز کی خاطر وہ ایسی بستی کو بچا لیتا ہے۔ جس پر عذاب کرنے والا ہو۔ مگر حقیقت سے دور لوگوں نے خدا تعالیٰ کی حکومت کو چھوڑ کر عاجز اور فنا ہونے والے بندوں کو شہروں اور ملکوں کی ضمانت اور حفاظت کا والی تجویز کر لیا۔ اور جب انسان خدا کی توحید کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو اس قسم کے خیالات پیدا

ہو جاتے ہیں۔

غرض یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ ولی مرقس انکے شہر کا رکھوالا و محافظ ہے۔ اور یہ چوک اسی کے نام سے آباد او تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی چوک میں وہ عظیم الشان گرجا ہے۔ جو سینٹ مارک کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس چوک کے درمیان ایک دریا بہتا تہا مگر رفتہ رفتہ وہ خشک ہو تا گیا یا کر دیا گیا۔ اور اب یہ وینس کا بہترین مرکز یا قلب ہے۔

چوک اور اس کے مناظر

اس چوک کی شان و شوکت اور خوبصورتی اور عظمت گذشتہ گیارہ سو برس کی لگاتار محنت اور صرف زر کا نتیجہ ہے۔ ۸۳۰ء میں یہ کام شروع ہوا تہا۔ اور ۱۸۶۰ء تک کا زمانہ اس دریا کو پاٹنے اور دوسرے ابتدائی کاموں کی درستی میں گذر گیا۔ اور اب ہم اس چوک میں ایک فلک نما گہنٹہ گھر عظیم الشان گرجا۔ شاہی محل جو قدیم زمانہ میں بہت بڑی لائبریری تھی۔ اور ڈوچ محل (جو اس عہد کی انتظامی حکومت کی تصویر ہے) جیسی عالیشان عمارتیں کہڑی ہیں۔ شام کو یہاں اس چوک میں ہزاروں کرسیاں اور چھوٹے میز مختلف رستورانوں کے سامنے بچھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جہاں نہایت خوبصورت اور مستعد نوکر ہر وقت آپ کی فرمائشوں کی تعمیل کو کہڑے رہتے ہیں۔ اس جگہ آپ چار۔ لیمونیڈ یا مختلف قسم کی شرابیں پی سکتے ہیں اور ہر قسم کے کیک۔ بسکٹ۔ ملائی کی برف کھا سکتے ہیں۔ کھانا بھی چاہیں تو حاضر ہے۔ ہر وقت باجا بجتا رہتا ہے۔ اس کے لئے آپکو کچھ دینا نہیں پڑے گا۔ ہفتہ کے مخصوص دنوں میں یہاں کی مقامی حکومت (بلدیہ) کی طرف سے باجہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اس روز شہر کے بلند پایہ باجہ نواز اپنے فن کا کمال دکہاتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام اخراجات بلدیہ دیتی ہے۔ یوں تو ہر روز ہی رات کو یہ چوک بقعہ نور ہوتا ہے۔ مگر اس روز خصوصیت سے اس کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ اور روشنی کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ بالکل دن چڑہا ہوا ہوتا ہے۔

یہ چوک TRAPEZIUM (منحرف الشکل) کا ہے۔ اور ۱۹۳ گز لمبا ہے۔ اور دو ضلعے ۹۲ گز اور ۶۷ گز ہیں۔ ابتدا ہی سے یہ جگہ ہر قسم کی تفریحی تقریبوں کے لئے مخصوص رہی ہے اور آج یہ بہت بڑا تجارتی مرکز بھی ہو گیا ہے۔ اس کے تینوں طرف بہت عالی شان برآمدہ چلا گیا ہے اس سے اس چوک کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

کبوتران کینیسہ اس چوک کے دلکش مناظر میں سے ایک کثیر التعداد کبوتروں کا نظارہ ہے۔ جو گرجا کے سامنے ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کا ایک ازدحام ان میں ہر وقت رہتا ہے۔ جنمیں سے اکثر اپنے ہاتھ پر دانہ رکھتے ہیں۔ اور کبوتر انکے ہاتھ پر بیٹھ کر اسے کھاتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی وحشت نہیں ہوتی۔ دانہ فروش بہت کچھ کما لیتے ہیں۔ کوئی شخص ان کبوتروں کو نہ تو پکڑتا ہے۔ نہ شکار کر سکتا ہے۔ یورپ کے تمام شہروں میں اندرون شہر میں کسی قسم کے شکار کی اجازت ہی نہیں اس لئے کہ یہ خطرہ سے خالی نہیں۔

ان کبوتروں کو بھی سینٹ مرقس کے کبوتر کہتے ہیں۔ یہ پرند نہایت بیخوفی اور آزادی سے اس چوک میں اڑتے رہتے ہیں۔ اور انہی عالیشان عمارتوں میں رہتے اور بچے دیتے رہتے ہیں۔ وہ بالکل امن میں ہیں ان کبوتروں کے متعلق ایک تاریخی روایت بیان کیجاتی ہے بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کو ایک کبوتر نے لڑائی میں پیغام لے جانے اور لانے میں مدد دی تھی۔ اُسدن سے سینٹ مارک میں رہنے والے کبوتروں کی حفاظت ہونے لگی۔ اور انکی نسل بہت بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ ایک روایت یہ ہے کہ

ڈوج اپنی حکومت کے زمانہ میں یہ رسم رکھتے تھے۔ کہ پام سنڈے کے دن باسی لیکا کے داخلہ کے ہال کچھ جانور چھوڑا کرتے تھے۔ یہ خصوصاً کبوتر ہوتے۔ ان کبوتروں نے سینٹ مرقس کے گرجا کے ستونوں میں پناہ لی اور اس روز سے یہ مقدس سمجھے جانے لگے۔ اور انکی حفاظت کا حکم ہوگیا۔

ابتدا سے انکی خوراک کیلئے جمہوری حکومت کی مجلس عاملہ پبلک سے چندہ کر لیتی تھی۔ اور اب اس مقصد کیلئے یہاں کی **بلدیہ** اپنے بجٹ میں گنجائش رکھتی ہے۔ اور ہندوستانی دانہ ان کبوتروں کو ڈالا جاتا ہے۔

یہ روایت کہاں تک درست ہے۔ مجھے اسکی تحقیق کی حاجت نہ تھی۔ اصل یہ ہے۔ کہ اس قسم کے مذہبی مقامات پر کبوتر خصوصیت سے ہوتے ہیں۔

خداتعالیٰ نے جانوروں کو بھی یہ شعور دیا ہے کہ ایسے مقامات پر وہ محفوظ ہیں۔ **کبوتران حرم** کے متعلق بھی عجیب غریب روایات ہیں۔ وہ میں اپنے مقام پر درج کروں گا۔ یہ **اجتماع** ہر بڑے گرجوں اور مندروں میں ہوتا ہے۔ اسلئے کہ لوگ انکی پرورش کیلئے کافی خوراک دیتے ہیں۔ اور کسی قسم کا خطرہ انکو نہیں ہوتا۔ لندن کے سینٹ پال کے گرجوں کے سامنے بھی ہزاروں کبوتر ملیں گے۔ اس قسم کی جگہ میں مشاہدات عرفانی

کا یہ حصہ اور مقام لکھ رہا ہوں میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ لنڈن کے سینٹ پال کے کبوتروں کی تعداد کو کم کرنے کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اور عنقریب انکی تعداد کو آدھا کرنے کیلئے مختلف طریقوں سے انکو ختم کیا جاویگا۔ تمام دن ہر وقت ایک تانتا لوگوں کا یہاں لگا رہتا ہے۔ اجنبی سیاح جو یہاں آتے ہیں خصوصاً یوروپی اور امریکن وہ پسند کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے فوٹو اس حالت میں لیں کہ کبوتر ان کے ہاتھ پر دانہ کھا رہے ہوں۔ یا انکے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہر وقت فوٹو گرافر یہاں موجود رہتے ہیں۔ عورتوں میں یہ شوق خصوصاً بہت زیادہ ہوتا ہے۔

میں جبکہ اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا ایک امریکن لیڈی نے مجھ سے بہ منت کہا کہ آپ کو اس میں عذر تو نہ ہوگا۔ کہ آپ کے ہاتھ پر دانہ رکھدیا جاوے اور کبوتر بیٹھے ہوں۔ اور میں فوٹو لیلوں میں نے کہا کہ اگر اس تھوڑی بات میں آپ کو مشکور کر سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بہت خوشی ہوگی صرف اسلئے کہ میں نے ایک امریکن لیڈی کو معصوم آفریح کیلئے موقعہ دیا۔ لیڈی نے سر جھکا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور عرفانی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ پر جوار کے دانے ہیں۔ اور کبوتر آ آ کر کھاتے ہیں۔ اور ایک دوسری ٹوپی پر بھی تشریف لے آئے۔ اور امریکن لیڈی نے اپنے کیمرہ سے

میرا فوٹو لے لیا

میرے نزدیک یہ ایک معمولی بات تھی مگر اس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی وہ اپنے اہل وطن کو اپنی ہمت اور جدت کا ثبوت دیگی۔ اسکے بعد اس نے اپنی کتاب پیش کی۔ کہ میں اسپر اپنے دستخط کردوں میں نے انگریزی اور اردو میں اپنے دستخط کر دئے۔

عرفانی انڈین جرنلسٹ

مسٹر شبنم کو پیر اجنبا ہوا میں نے اسے کہا کہ یہ سارا کرشمہ میرے **قومی لباس** کا ہے۔ تمہیں کوئی فلسطینی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسی ملک کا کوئی آدمی سمجھتے ہیں۔

قومی جھنڈا سینٹ مارک کے گرجا کے سامنے تین جھنڈے لگے ہوئے ہیں۔ ان تین جھنڈوں کے نام سائپرس۔ کانڈیا۔ اور موریا ہیں۔ اور یہ نشان ہیں اس بات کا کہ وینس کی **جمہوریت** کی قوت اور فتوحات کا سلسلہ کہاں تک پہنچا ہے۔ اس سے پہلے یہی جمہوریت کے نشان تھے۔ اور اب **نیشنل فلیگ** کہلاتے ہیں۔

شیرانوالہ چوک

لاہور میں ایک شیرانوالہ دروازہ ہے۔ وینس میں شیرانوالہ چوک دیکھا اور یہ چوک سینٹ مارک کے گرجہ کے پہلو میں واقعہ ہے۔ چھوٹا سا چوک ہے اسکو شیرانوالہ چوک اسلئے کہتے ہیں کہ یہاں فرانسیسی سرخ سنگ مرمر کے دو شیروں کے مجسمے لگے ہوئے ہیں۔ اٹالین بانیں اس چوک کا نام PIAZZETTA DE ILEONIDLEOONCIAT ہے جس کے معنے دو شیروں یا شیر بچوں کا چھوٹا سا چوک ہیں یہ مجسمے ۱۷۲۲ء میں وہاں نصب کئے گئے تھے ۱۸۹۷ء کی شورش میں انکو خراب کر دیا گیا تھا۔ مگر پھر درست کر دیا گیا۔ پہلے زمانہ میں یہ سبزی منڈی تھی

چوک خورد

اس بڑے چوک کے علاوہ اور شیرانوالے چھوٹے چوک کے سوا ایک اور چھوٹا چوک سنیٹ مارک کے نام پر ہے۔ جو سنیٹ مارک کے گرجہ سے لیکر سمندر کے کنارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے دائیں طرف شاہی محل ہے۔ جو قدیم زمانہ میں مشہور و معروف لائبریری تھی اور بائیں طرف ڈوج کا محل ہے۔ یہ منظر شام کے وقت بہت ہی خوشنما ہوتا ہے۔ سمندری کنارے کے قریب دو بڑے سرخ پتھر کے ستون ہیں جگی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ شام سے ۱۱۲۶ء میں لائے گئے تھے کہتے ہیں کہ در اصل تین ستون لائے گئے تھے لیکن ایک اتارتے وقت پانی میں گر پڑا اور پھر نکالا نہ جا سکا۔ قریباً پچاس سال تک یہ ستون یونہی لیٹے ہی پڑے رہے۔ کیونکہ کوئی شخص ان کے کھڑا کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ پھر انکو کھڑا کیا گیا۔ اور جس شخص نے کھڑا کیا تھا۔ اس کو معاوضہ کے طور پر ہر دو ستونوں کے درمیان **قمار بازی کا میز** لگانے کی اجازت دیدی گئی۔ ان ستونوں کی بنیادوں کے پاس وینس کے آرٹ اور تجارت کی حقیقت کا اظہار نقاشی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پر شہر کے پہلے سرپرست ولی تھیوڈور کا مجسمہ ہے اور دوسرے پر ولی مرقس کے شہر کا مجسمہ ہے جسکو ۱۷۹۷ء میں نپولین لیگیا تھا مگر ۱۸۱۵ء میں یہ پھر لایا گیا۔ اور بعد مرمت اسے اپنی جگہ پر ۱۸۹۲ء میں کھڑا کر دیا گیا۔ **قمار بازی** کے اڈے کو ہٹانے کے لئے ڈوج بادشاہ نے مجرموں کو یہاں پھانسی دینی شروع کر دی اور اس طرح پر اڈا صاف ہو گیا میں ان ستونوں کے نیچے جا کر کچھ عرصہ تک کھڑا رہا۔ اور میں ایشیا کی خوشبو کو سونگھتا تھا۔ اور سوچتا تھا۔

کیا ہم پھر اس اپنی متاع کو لے سکینگے؟

یہ جگہ بمبئی کی چوپاٹی بمبئی جا ہئے شام کو خصوصاً یہاں بہت بڑا پر رونق نظارہ ہوتا ہے۔ اور دنکو

بھی عام طور پر مخلوق کے ٹھٹ کے ٹھٹ پھرتے رہتے ہیں۔ عورتوں کے کندھے پر ایک شال ہوتا ہے۔ جو عموماً سیاہ ہوتا ہے۔ اور سر ننگی ہوتی ہیں۔ ان کے لباس میں فرانس اور انگلستان کی عریانی نہیں۔ ان میدانوں یا چوکوں کے گرداگرد ایک ہزار برس کی تاریخی عمارتوں کا سلسلہ ہے جو مختلف عہود کی تاریخ اپنے اپنے اندر کہتی ہیں جسکو تصویری اور پتھروں کی زبان میں پڑھ کر انسانی قلب پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اور وینیشن قوم کی ہمت مردانہ اولوالعزمی کی ایک طرف اس کی سنگدلی جفاکاری کی دوسری طرف تصویر کھیچ جاتی ہے۔ اس زمانہ قدیم کے تمدن و تہذیب اور اس عہد کے طریق حکومت و معدلت گستری اور تعزیرات ملزمان کا ایک ہیبت ناک نقشہ دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں مختصراً مناسب موقعہ اس کا ذکر انشاء اللہ کروں گا۔

گھنٹہ گھر میں نے اوپر کہا ہے کہ وینس کا سب سے مشہور خوشنما اور پر رونق حصہ یہی مرقس ولی کا چوک ہے۔ اور مرقس ولی کے گرجہ کے شمال کیطرف یہاں کی سب سے بڑی تجارتی اور آبادگی کا ایک بہت بڑا محرابدار دروازہ ہے۔ اس دروازہ کے اوپر ایک شاندار کلاک لگا یا گیا ہے جسمیں کئی مختلف سوئیاں مختلف اغراض کیلئے لگائی گئی ہیں۔

گھنٹہ او منٹ کی سوئی کے علاوہ تاریخ اور چاند کے بڑھنے گھٹنے کی سوئی بھی لگی ہوئی اور منطقة البروج کی سوئی الگ ہے۔ غرض یہ بہت ہی اعلےٰ درجہ کا کلاک ہے۔

موجودہ گھنٹہ گھر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۴۹۶ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ گھنٹہ گھر ایک قسم کا عجوبہ ہے۔ اور ستہ منزلہ ہے۔ مجھے اس گھنٹہ گھر کے ساتھ جو دلچسپی ہوئی وہ صرف اس کے گھڑیالی اور اس کے متعلق بعض مذہبی نظارے ہیں۔

مُور گھنٹہ نواز اس گھنٹہ گھر کی چوٹی پر دو گھنٹہ نواز ہیں یہ تانبے کے دو مردانہ مجسمہ ہیں اور ان پر سیاہ روغن کیا گیا ہے۔ لوگ عام طور پر اسکو (MORI) کہتے ہیں۔ اول اول تو مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ موری کیا ہوتا ہے لیکن پھر مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ مُورز یعنی عربوں کی تصاویر ہیں۔ جو وینس کے گھنٹہ گھر پر گھڑیال نوازی کا کام کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ پانچ صدیوں سے چلے آتے ہیں۔ آدہا گھنٹہ اور گھنٹہ وہ بجاتے ہیں انکے ہاتھوں میں ہتھوڑے ہیں۔

اوپر آپ نے پڑھا ہے کہ اس چوک میں سامنے سے اٹھے ہوئے ستون کھڑے ہیں۔ اور بڑ گھڑیالی

پانچ سو سال سے اپنا ہیبت ناک چہرہ دکھا رہے ہیں لیکن اسمیں میرے لئے ایک عبرتناک سبق اور دردناک سین تھا۔

میں کچھ عرصہ تک ان عرب گھڑیالیوں کو گھنٹہ بجاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور میرا قلب اندر سے آنسو بہا رہا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ یہ مسلمانوں کی تحقیر اور اپنی قوم اور نسل میں اپنی عظمت اور دوسروں کی مخالفت کے جذبات کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس چوک میں سیرین سنگی ستون بھی یہ یاد دلاتے ہیں، کہ وینشین قوم کی عظمت ایسی تھی کہ وہ ایشیا کو چک تک پہونچے اور اپنی فتوحات کے سلسلہ میں یہ چیزیں مال غنیمت کے طور پر لے آئے۔ اور عرب ان کے گھڑیالی اور خادم تھے۔

قوموں اور حکومتوں کا انقلاب ایک آنی جانی چیز ہے لیکن اسمیں شبہ نہیں کہ ایسے نظارے ایک رقیق القلب کو متحرک کئے بغیر نہیں رہتے ہیں جانتا ہوں کہ صدہا مسلمان سیاح یہاں سے گذرے ہوں گے اور انہوں نے نیم ساعت اور گھنٹہ کو بجتے ہوئے دیکھا بھی ہوگا۔ مگر وہ اسے محض وقت گذاری اور وقت شماری کا ایک ذریعہ سمجھ کر گذر گئے ہوں گے۔ میں تو حسرت اور افسوس سے اس نظارہ کو دیکھتا رہا اور جتنے روز میں وینیس میں رہا۔ اور جب اس گھنٹہ کی آواز میرے کان میں آتی تھی میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس الہام کو پڑھتا تھا۔

وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیان بر منار بلند تر محکم افتاد

کچھ شک نہیں کہ عرب گھڑیالی جب اس گھنٹہ گھر پر کھڑے کئے گئے تھے۔ تو نصب کرنیوالوں کی غرض و غایت وہی تھی۔ جو میں لکھ چکا ہوں۔ مگر آؤ ہم اس سے بہترین سبق لیں۔ اور اس حقارت نما مجسمہ کو اسلامی عظمت کیلئے محرک اور راہنما بنالیں۔

یہ گھڑیالی سب سے اونچی چوٹی پر نصب ہیں۔ اور وہاں سے گذرنے والے ہر مسلمان کو پکارتے ہیں

الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق

کیا مومنوں پر ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب میں ذکر اللہ اور اس چیز کیلئے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے خدا کا خوف پیدا ہو۔

وہ گھڑیالی کی حیثیت سے قومی حقارت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی قوم کو پکارتے ہیں۔ کہ آؤ ہم بلند منار پر کھڑے ہیں۔ تمہارا مقام دنیا میں سب سے بلند ہے۔ اس جگہ تمہارے آثار بتاتے ہیں، کہ تمہیں اس ملک

پر سیف و سنان سے نہیں بلکہ محبت و برہان سے قبضہ کرنا چاہیئے. قلوب کی تسخیر کرو. کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تسخیر مستقل اور دیرپا نہیں۔

مشاہدات کے پڑھنے والے حیران ہوں گے کہ میں کن خیالات میں ڈوبا ہؤا ہوں مگر میں مجبور ہوں میرے اس سفر میں یہی ایک نقطہ میرے زیر نظر رہا ہے. جہاں کسی قسم کا اسلامی اثر اور نشان میرے سامنے سے گذرا ہے میں اُسے درس عبرت سمجھتا رہا ہوں. اور نہیں چاہتا کہ مشاہدات کے پڑھنے والے محض دماغی عیاشی کے طور پر اس سے گذر جاویں. اس گھنٹہ گھر کی دوسری منزل پر حضرت مریم اور مسیح کا بت ہے. جو دو دروازوں کے درمیان بنا ہوا ہے. اسلام بت پرستی کا دشمن اور بت شکنی کا مؤید ہے. لیکن میں اس روح کو دیکھتا ہوں کہ کسطرح عیسائی اپنے مذہبی حسیات کو قائم رکھنے کیلئے کسی موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے. عرب گھڑیالی. اس سے اوپر ہیں. مسلمان اگر متحدہ کوشش کریں. تو مذہبی رنگ میں کسر صلیب کر کے دنیا کے ہر گوشہ میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیں. اور یہ

تبلیغ و اشاعت اسلام سے ہو گا

اس خیال کو دل سے قطعاً نکال دینا چاہیئے کہ اسلام کا جلال تلوار سے بلند ہو گا. مسلمانوں نے اپنی حکومت اور قوت کو تلوار ہاتھ میں لیتے ہوئے کھو دیا ہے پس یہ راہ نہیں۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کیلئے حرام ہے اب جنگ اور جدال

میں نے عرب گھڑیالیوں کی آواز کو جو وہ وقت رسید کے الفاظ میں زبان حال سے دیتے ہیں سنا اور ارادہ کیا. کہ ایسے

مسلمانوں تک پہنچا دوں

سینٹ مرقس کا گرجہ

ان عمارتوں اور عجائبات کو دیکھتے ہوئے میں اس عظیم الشان معبد میں داخل ہوا جو اس شہر کے سرپرست ولی کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے اور جس کیوجہ سے یہ چوک پر رونق اور مشہور ہے میں عمارت کی خوبیوں یا اس کے صنعتی حسن پر بہت ہی کم لکھ سکوں گا. اس لئے کہ میں ذاتی طور پر اس فن سے واقف ہی نہیں اور میں سمجھتا ہوں اس سے کوئی فائدہ مشاہدات کے پڑھنے والوں کو نہیں ہو گا. میں اس کے سرسری ذکر کے ساتھ ان اثرات کا ذکر کروں گا. جو مجھ پر ہو رہے تھے. یا جن کے متعلق

میرا خیال ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو کوئی مفید علم دیکھتے ہیں۔ یہ گرجا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہور ہے

تاریخ

سب سے اول ۸۲۸ء میں جبکہ سینٹ مرقس کی نعش اسکندریہ سے یہاں لائی گئی اور اسے شہر کا سرپرست تسلیم کر لیا گیا تو انکی یاد میں یہ گرجا تعمیر ہوا لیکن جب بغاوت ہوئی تو باغیوں نے شاہی محل کو آگ لگا دی۔ اس وقت اس گرجا کو بھی جلا دیا۔ ۱۰۶۳ء میں جب دوسرا ڈوج بادشاہ ہوا۔ تو اس کے ساتھ ہی اس گرجا کی تعمیر کا خیال ہوا۔ اور کام شروع ہو گیا۔ جو ۱۰۷۱ء میں جا کر ختم ہوا۔ گویا ایک سو سال تک یہ کام جاری رہا۔ تقریباً سو سال تک گرجا کی تعمیر کام کے لحاظ سے ہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں جو سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ قوم میں مذہبی عظمت اور عقیدت کو قائم رکھنے کیلئے اسے جسقدر لمبا کیا جاتا مفید ہوتا۔ آئندہ نسلیں یقین کرتی ہیں کہ یہ وہ کام ہے جسکو ہمارے آباؤ اجداد نے شروع کیا تھا۔ اس کی تکمیل ہمارا فرض ہے۔ اس اصول پر اس قسم کے کام عموماً لمبے کئے جاتے ہیں۔ اور ہونے چاہئیں ۱۰۷۱ء تک یہ صرف تعمیری کام ختم ہوا تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش اور تکمیل کا کام اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک جاری رہا۔ اور اب بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی عمارت کا کام بند نہیں ہو سکتا جس کی تکمیل صدیوں میں ہو۔ تاریخ تکمیل کے ساتھ ہی انکی **مرمت** کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح پر سینٹ مرقس کا گرجا قوم میں مذہبی روح کو ہر وقت قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس گرجا کی آرائش میں مشرقی طرز کی جھلک نمایاں ہے۔ اس گرجہ میں شیشہ اور ملمّع کا کام نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اور سنہری کام سونے پر سہاگہ ہے۔ شیشہ کے ٹکڑوں پر تصاویر ایسی خوبصورتی اور عمدگی سے بنائی گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس قسم کے کام کو (MOSAIC) موزیک کہتے ہیں یہ چرچ دنیا بھر میں سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ شاندار سمجھا جاتا ہے۔

داخلہ کا دروازہ میرے لئے تکلیف دہ ہو گیا

میں اس شاندار گرجہ میں داخل ہونے کے لئے اس کے دروازے پر پہنچا اور میری نظر اوپر اٹھی۔ اس چوک کے گھنٹہ گھر اور سنگی ستونوں نے مجھے پہلے ہی متاثر اور کبیدہ خاطر بنا رکھا تھا۔ اور میرے سلسلہ خیالات میں مختلف قسم کی لہریں اٹھتی تھیں۔ اور اندر ہی اندر دب کر بیٹھ جاتی تھیں جونہی میں نے داخلہ کے دروازے پر اوپر نظر کی میری توجہ ایک تصویر کیطرف گئی جسمیں مسلمانوں کو گرفتار کر کے لایا جا رہا ہے۔ اور انکی حالت نہایت زبوں اور خراب دکھائی گئی ہے میں نے اس تصویر کو دیکھا اور اپنے دل میں کہا کہ یہ تصویر روح فرسا اور

بنائی ہے۔ مجھے وہ کہانی یاد آگئی جس میں ایک شیر اور آدمی کا تذکرہ لکھا ہے۔ کہ آدمی نے شیر کو ایک تصویر دکھائی جس میں اسنے شیر کو دبایا۔ اور پچھاڑا ہوا تھا اس تصویر کو دیکھ کر شیر نے کہا۔ کہ

یہ تصویر آدمی نے بنائی ہے

میرے قدم اندر جانے کیلئے رُکے اور میں اس تصویر پر غور کرنے لگا۔ اور میں نے سمجھا کہ میرا افسوس فضول اور بے معنی ہے۔ ہر قوم کا حق ہے کہ وہ اپنی آیندہ نسل کے دل میں زندہ اور باعزت رہنے کے جذبات کو پیدا کرے اور اپنے دشمنوں کے متعلق جسطرح چاہے خیالات کا اظہار کرے۔ پھر میں اس سے بھی آگے بڑھا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ مسلمانوں نے وہ ترک ہوں یا عرب ہندی ہوں یا مصری۔ خدا تعالیٰ کے انعام اور فضلوں کی قدر نہ کی اور شکر گذار بندے نہ ہوئے۔ تو خدا تعالیٰ نے اپنے قانون مستمر کو جاری کیا۔ جو اس نے مقرر رکھا تھا

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید

عالم اسلامی کے موجودہ اور سابقہ مصائب اور ابتلا کی تہ میں یہی قانون الٰہی کام کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا فضل کیا۔ اور انہیں قعر ذلت سے اُٹھا کر اوج اور عروج کے آسمان پر چڑھایا۔ دنیا کی حکومت اور خزانے ان کے قدموں پر نثار ہوتے تھے مگر اپنی بداعمالیوں اور ناشکریوں سے انہوں نے سب کچھ کھویا اور اب ان تصاویر کو دیکھ کر تیرا آنسو بہانا فضول ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے۔

اندریں وقت مصیبت چارۂ ما بیکساں
جز دعائے بامداد و گریہ اسحار نیست

جسطرح پر اس تصویر کو دیکھ کر وینس کے ہر فرزند کے دل میں اپنی قومی قوت اور حکومت کی شان و عظمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اسے قائم رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کو طیار ہو جاتا ہے۔ کیوں اس تصویر **گرفتاری** کو دیکھ کر اسلام کے ہر فرزند کے دل میں یہ جوش اور غیرت پیدا نہ ہو۔ کہ پھر **عظمت اسلامی** کا جھنڈا ان بت کدوں پر نصب کرے۔ اور **اللہ اکبر** کی صدائیں جب ان مناروں سے بلند ہوں تو وینس کے ہر فرزند کو آپ معلوم ہو جائیگا کہ یہ صرف

تلک الایام نداولھا بین الناس

کا ایک نظارہ تھا۔ غرض میں اس تصویر کو دیکھ کر دروازہ کے دوسرے حصص کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا میں مشاہدات کے پڑھنے والے ہر مسلمان کو توجہ دلاؤں گا کہ یہ واقعہ میں نے محض کہانی کے طور پر نہیں لکھا ہے۔ ایک

دردمندانہ اور مجروح دل کے ساتھ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اسکی ٹھیس اسوقت ان سطور کے لکھتے وقت بھی محسوس کرتا ہوں پس تمہارے لئے ضروری ہے کہ اس پانیوں میں آباد شہر کو محبت و اخلاص کے تیروں سے فتح کرلو اور انہیں اسلام جیسی دولت سے مالا مال کر دو۔ آہ!

ذلت ہو دور اور مسلماں ہو باوقار
یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

برہنہ تصویریں

دروازہ کے اندر جب میں داخل ہوا تو اصل گرجا میں داخل ہونے سے پہلے ایک ڈیوڑھی میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس ڈیوڑھی میں میں نے اکثر تصاویر کو دیکھا جو برہنہ ہیں۔ اور پھر یہاں ہی نہیں بلکہ گرجے میں داخل ہوا تو اسکی چھت پر بھی برہنہ تصاویر دیکھنے میں آئیں۔ اور تو اور ان برہنہ تصاویر میں ایک مسلمان بادشاہ کی تصویر بھی تھی جس کے ساتھ برہنہ عورتوں کی تصاویر تھیں۔ برہنہ تصویروں پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ وینس میں اور یورپ کے بعض دوسرے شہروں میں برہنہ تصاویر ہی نہیں برہنہ بت اور مجسمے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ علم الاصنام ایک مستقل علم اور سائنس ہے۔ جس قدر قدیم تاریخ کو ہم پڑھتے ہیں وہ مصریوں کی ہو یا یونانیوں کی یا ہندیوں کی اس میں علم الاصنام ایک مستقل علم ہے۔ جن لوگوں کو ہندوستان کے قدیم مندروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہوں نے وہاں برہنہ تصاویر اور برہنہ بتوں کو ضرور دیکھا ہوگا میں ایک مرتبہ ہندوستان میں جزیرہ ایلیفنٹا جو بمبئی کے قریب ہے دیکھنے گیا۔ اور وہاں کے بتوں کو بغور دیکھا اور اسی طرح بنارس کے ایک مندر کو جسے نیپالی مندر کہتے ہیں دیکھنے گیا۔ تو میری حیرت کی حد نہ رہی میں کبھی شرم کیلئے چاہتا تھا کہ باہر نکل جاؤں اور پھر اپنے علم اور واقفیت کو بڑھانے کے نقطۂ خیال سے اسے دیکھتا تھا کہ قدیم ہند و تہذیب کا اس سے سراغ ملتا ہے۔ غرض برہنہ تصاویر اور بتوں کا جنون یا شوق قریباً ہر ملک میں رہا ہے۔ ہندوستان میں اب یہ مفقود ہے۔ اور لوگ برہنہ تصاویر یا برہنہ مجسمے قائم کرنا پسند نہیں کرتے مگر یورپ اپنی تہذیب اور شائستگی کا یہ اعلےٰ مقام سمجھتا ہے۔ اور اسے آرٹ کی خوبی بتایا جاتا ہے۔ میں مفتی یا قاضی نہیں۔ اور نہ شریعت اسلام کے نقطۂ خیال سے یہاں بحث کر رہا ہوں میں کسی آدمی کو برہنہ کرنا یا برہنہ دیکھنا کبھی پسند نہیں کرتا۔ اخلاقیات کے اس حصہ کو جو عفت اور عصمت کے متعلق ہے۔ برہنگی اور ستر پوشی سے بہت بڑا تعلق ہے۔ اور اسی ضمن میں پردہ کی فلاسفی بھی آجاتی ہے۔ باوجود اس کے میں برہنہ تصاویر یا مجسموں

کو اس حد تک مفید سمجھتا ہوں جو صرف طبّی ضروریات کے لئے کار آمد ہوں۔ اور صرف ڈاکٹروں کے استعمال میں آسکیں۔ لیکن وہ شخص غلطی کرے گا۔ اور میرے مفہوم کو غلط سمجھے گا۔ جو برہنہ تصاویر کا اس سے جواز پیدا کرے

غرض برہنہ تصاویر یورپ کے آرٹ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اور اس میں اس قدر شغف پیدا ہو گیا ہے۔ کہ تصاویر سے گذر کر اب عریانی کو پسند کیا جاتا ہے اور یورپ کے بعض ملکوں میں اس قسم کی سوسائٹیاں بنائی گئی ہیں جو برہنہ رہنا پسند کرتی ہیں۔ اور اپنے عمل سے اُستاد ذوق کے اس شعر کی تصدیق کرتی ہیں ؎

تن کی عُریانی سے بہتر نہیں دُنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہیں سیدھا اُلٹا۔

چنانچہ برلن میں ایک ایسی سوسائٹی ہے کہ جس کے ممبر باقاعدہ عریانی تن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور ان کا ایک باقاعدہ رسالہ نکلتا ہے میں جرمن کے حالات سفر میں انشاء اللہ العزیز اس کا ذکر نے کی خدا کے فضل سے امید کرتا ہوں۔

ہندوستان میں ننگے سادہوؤں کا مظاہرہ علے العموم ہر دو آمیں ہوا کرتا ہے۔ اور انکی فوج مادر زاد برہنہ جب اپنے جلوس نکالتی ہے۔ تو عورتوں اور مردوں کا بہت بڑا اژدہام ہوتا ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں تو لوگ ننگے رہتے ہی ہیں غرض عریانی تن بجائے خود ایک مستقل مضمون میرے مشاہدات میں ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو میں اس کے مختلف پہلوؤں پر انشاء اللہ بحث کروں گا۔

یورپ کا موجودہ بڑھتا ہوا مذاق میں محض کسی علم و سائنس کے اصول پر نہیں سمجھتا بلکہ میں اسے یورپ کی بڑھتی ہوئی عیاشی اور عبادالشہوات کی ایجاد دیکھتا ہوں۔ یہ پرانا طریق جو برہنہ تصاویر وغیرہ کا چلا آتا ہے۔ اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ ہر ملک پر ایک زمانہ

وام مارگ

کا آیا کرتا ہے۔ اور یہ انکی یادگار ہے۔ القصہ میں جدھر دیکھتا تھا کچھ نہ کچھ ننگی تصاویر ہر طرف نظر آتی تھیں۔ گرجہ کی چھت۔ انکی دیواریں۔ ایک قسم کا نگار خانہ ہے جسمیں ایک یا دوسری قسم کی تصاویر موجود ہیں شیشہ کا جو کام کیا گیا ہے۔ وہ بے نظیر ہے۔

شیشہ کی بائیبل تصویری زبان میں

وینس اس کام کیلئے خاص طور پر مشہور ہے کس گرجہ میں اس فن کا پورا کمال دکھایا گیا ہے۔ بڑے غور و فکر سے مجھے معلوم ہوا۔ اور خوش قسمتی سے ایک امریکن سیاح

کے ساتھ ہو جانے سے اور بھی مدد ملی۔ جو اس گرجہ کی سیر کیوقت میرے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ اس کا پوتا
اور بیٹی بھی تھی۔ وینس کی بقیہ سیر میں انہوں نے مجھے ساتھ رکھا۔ میں اسے خدا تعالیٰ کا فضل سمجھتا ہوں۔ یہ
ذکر توضمناً آگیا۔ اس گرجہ میں تمام بائیبل تصویری زبان میں موزیک کام میں دیواروں پر تحریر کیگئی ہے۔ یہ کام
بہت نفیس اور اعلےٰ درجہ کا ہے۔ اور بائیبل کے تمام واقعات تصویری زبان میں درج ہیں۔ اپنی کتاب کی یہ خدمت
مجھے بہت پسند آئی۔ یہ نہیں کہ میں یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ تصاویر کا ایک بہت بڑا سلسلہ چلا گیا ہے نہیں بلکہ
مجھے خوش کرنے والی وہ سپرٹ اور روح تھی کہ جو اپنی کتاب کی خدمت کی ہے۔

یہ گرجہ اپنے اندر قریباً ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ کے آثار رکھتا ہے۔ اگر میں اسکی تمام تفاصیل اور
تماثیل کا ذکر کروں تو ایک مستقل کتاب اسی گرجہ پر ہوسکتی ہے۔ مگر یہ میرے لئے ناممکن تو نہیں مشکل ضرور
ہے۔ علاوہ بریں میں مشاہدات میں زیادہ تر بحث ان کا۔ آمد امور پر کرنا چاہتا ہوں۔ جو کسی نہ کسی پہلو سے
ہمارے دین اور دنیا کیلئے مفید ہوسکے۔ معلومات میں اضافہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ اور اسکو مد نظر رکھ
کر کہیں کہیں میں مختصر تاریخی تذکرہ بھی کر جاتا ہوں لیکن وہ اصل مقصد نہیں۔

گرجہ میں جب ہم داخل ہوتے ہیں تو ہم کو پانچ رفیع الشان محرابیں نظر آتی ہیں۔ اور قریباً تین سو
ستونوں کا ایک شاندار منظر ہے۔ جنہوں نے ان محرابوں کو دو قطاروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ درمیانی محراب
پر جو پہلی قطار میں واقع ہے۔ چار بڑے تانبے کے گھوڑوں کے مجسمے ہیں۔ جو اپنے ساتھ تاریخی انقلابات کی
داستان رکھتے ہیں۔ یہ گھوڑے قریباً چھ فیٹ اونچے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ روم کے مشہور ظالم امپیریر نیرو
کی محراب پر تھے۔ جنکو قسطنطین روما سے قسطنطنیہ لے گیا تھا۔ اور ۱۲۰۴ء میں جبکہ صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں
یہ گھوڑے وینس منتقل کر دئے گئے۔ اور پھر نپولین فرانس لیگیا۔ اور ۱۸۱۵ء میں پھر واپس کر دئے گئے۔ اور اس جگہ
انکو رکھ دیا گیا۔ میں نے اس تاریخ کو سنا تو مجھے صلیبی جنگوں کے مسلمان مجاہدین کی عظمت اور بہادری پر رشک
آیا کہ ان کے خوف سے پرانی یادگاریں کسطرح بھاگتی پھرتی تھیں۔ اور قسطنطنیہ سے ان گھوڑوں کی واپسی
رومی حکومت کی

پسپائی کیلئے ایک مبارک فال تھا

آگے چلکر ایک موقعہ پر سینٹ مرقس کی لاش کو اسکندریہ سے وینس لانیکا نظارہ دکھایا گیا ہے اسی
طرح مسیح علیہ السلام کی زندگی کے مختلف مناظر موزیک کام میں ایسے عمدہ تیار کئے گئے ہیں کہ دیکھ کر غش

عش کرنا پڑتا ہے بمثلاً صلیب پر اتارنے کا منظر اور بچیاں عیسائیاں اس کے جی اٹھنے کا نظارہ وغیرہ سب کے سب نہایت شاندار ہیں۔ اسی طرح ایک موقعہ پر پیدائش عالم اور ہبوط آدم کے مناظر دکھائے گئے ہیں اور ایک جگہ حضرت نوح علیہ السلام برج بابل حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب وغیرہ غرض اس طرح تصویری زبان میں قریباً ساری بائیبل کو لکھدیا ہے۔ اور یہ سارے کا سارا کام موزیک کا شاندار نمونہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں گرجہ کی اندرونی خوبصورتی اور شان کے دکھانے کے لئے اسی قدر بیان کافی ہوسکتا ہے۔ آرائش اور خوبصورتی کا کوئی پہلو نہیں جو یہاں ترک کیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک موقعہ پر حضرت مریم کا شجرہ نسب کا نہایت عمدگی سے مرقع دکھایا گیا ہے۔ گرجہ کے اندر اور بھی متعدد چھوٹی چھوٹی چیپل ہیں۔ جو مختلف ولیوں کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح متعدد قربانگاہ بنے ہوئے ہیں۔ گویا سارا گرجہ متعدد چھوٹے چھوٹے اور عبادت گاہوں کا مجموعہ ہے جس طرح پر خود شہر وینس بہت سے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے۔

میرے قلبی اثرات

میں ان عجائبات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً نوٹ بھی کرتا جاتا تھا۔ میرے سر پر ٹوپی تھی۔ اور گرجہ میں موجود مخلوق کیلئے یہ ایک اچنبا تھا کہ میں ٹوپی پہنے ہوئے پھر رہا ہوں۔ ایک پادری صاحب میرے پاس آئے اور انہوں نے اپنی زبان میں مجھے کہا کہ میں ٹوپی اتار لوں۔ میں تو زبان سمجھتا نہ تھا میں نے انکی پرواہ نہیں کی۔ تب اس نے ہاتھ کے اشارہ سے ٹوپی کیطرف اشارہ کیا میں نے ٹوپی اتار کر اسے دیدی۔ کہ

آپ کو پسند ہے تو لیلیں

میرے ساتھ امریکن سیاح اسکاپو تا بھی تھا اور مسٹر شنم بھی۔ وہ میری اس حرکت سے متاثر ہوئے۔ قریب تھا کہ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ مگر انہوں نے ضبط کیا۔ پادری صاحب نے ٹوپی میرے ہاتھ میں دیدی۔ اور میں نے پھر سر پر رکھ لی۔ امریکن سیاح نے مجھے انگریزی میں کہا کہ پادری صاحب چاہتے ہیں کہ میں ٹوپی اتار لوں۔ میں نے انکو جواب دیا کہ ننگے سر کسی کے سامنے جانا اس شخص کی ہمارے نزدیک ہتک ہوتی ہے میں ان لوگوں کا احترام کرتا ہوں بے ادبی نہیں کرنا چاہتا۔ پادری صاحب خاموش ہو کر چلے گئے
القصہ میری موجودگی ہی میں عبادت ہونی شروع ہوگئی۔ گھنٹے اور گھڑیال بجنے شروع ہوگئے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ میں کسی مندر میں ہوں۔ جہاں آرتی ہونے لگی ہو۔ بالکل اسی طرز پر پادریوں اور

گانے والے لڑکوں کی فوج موم بتیاں روشن کئے ہوئے آئے اسی طرح ننوں کی ایک جماعت آئی اور وہ کبھی اس بُت کے آگے اور کبھی اس بُت کے سامنے جاکر سجدہ کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر جس بات نے مجھے حیرت زدہ کیا۔ وہ سب سے بڑے پادری صاحب کی آمد تھی۔ وہ ایک شاہانہ رنگ میں آیا اور اس کے لئے ایک بڑی کرسی نما تخت سا تھا جس پر وہ بیٹھ گیا۔ اور ایک خاص ٹوپی اس کے سر پر رکھی گئی وہ کئی مرتبہ رکھی جاتی اور اتاری جاتی تھی۔ اور یہ کام ایک اور بڑے پادری کے سپرد تھا مجھے اس تمام نظارہ میں تکلف اور نمائش کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ تب میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ

افسوس ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عبادت کو بھی تکلفات اور نمائش کا ذریعہ بنا لیا ہے

سادگی قطعاً نہ تھی۔ اور حقیقت کا پتہ نہ تھا۔ گرجا کو تو پہلے ہی اچھا خاصہ عجائب خانہ بنا رکھا ہے اٹلی والوں میں فتح کی ہوئی اشیاء اور دوسری قدیم چیزیں جیسے چار گھوڑے جنکا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اور بہت سی چیزیں اسی قسم کی وہاں تھیں جنکی تفصیل بجائے خود ایک مستقل کتاب کو چاہتی ہے۔

خیر اسمیں مضائقہ نہ ہوتا۔ لیکن عبادت کا جو بھی رنگ تھا وہ ایک قسم کی نمائش تھی۔ اور تکلفات سے پُر میں نے کسی تعصب اور خود غرضی یا مخالفت کی نظر سے ان باتوں کو نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ میں ایک صاف دل لیکر وہاں گیا تھا مگر میں جوں جوں ان حالات کو دیکھتا تھا مکدر ہوتا جاتا تھا۔ میں ایک حصہ میں بیٹھ گیا۔ اور میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی میرے قلب میں اسوقت دعا کیلئے ایک تحریک تھی۔ اور میں نے خاموشی سے دعا کی۔ اس دعا کا خلاصہ یہ تھا۔

میری دعا: مولا کریم میں تیرا ایک خطاکار بندہ ہوں۔ اور تو نے اپنے فضل سے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شناخت اور اس کے حضور رہنے کی عزت بخشی۔ تیرے ہی فضل سے آج میں کئی ہزار میل کے فاصلہ پر عیسویت کے گہوارہ میں ہوں۔ جہاں مسیح ابن مریم کو خدا بنایا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ تجھے چھوڑ کر جھوٹے اور فانی معبودوں کی پرستش کرتے ہیں۔ تو اپنا فضل کر اور مجھے توفیق دے کہ میں ان بتوں کو توڑ سکوں اور جسطرح مسیح ابن مریم نے تیرے گھر کو دوکانداروں سے صاف کیا تھا میں مسیح موعود کا ایک خادم ہو کر تیرے اس گھر کو پاک کر سکوں۔ اور اگر تیرے علم میں یہ مقدر نہیں کہ میرے ہاتھ سے یہ کام ہو۔ تو پھر میری اولاد کو توفیق دے کہ وہ اس جگہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی

تبلیغ کریں۔ اور اس بت خانہ میں تیری اور صرف تیری عبادت ہو اور یہ گھر پاک صاف کر دیا جاوے تاکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے آنے کی غرض پوری ہو۔ تو نے آپ اسے کسر صلیب کیلئے بھیجا ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔ مگر تو فضل کر کہ یہ میرے یا میری اولاد کے ہاتھ پر ہو۔ آمین!

میں نے یہ دعا کی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ پر درود پڑھا۔ اور پھر مختلف حصص میں پھرنے لگا۔ میں چونکہ اجنبی اور غیر معمولی لباس میں تہا۔ اس نے میرے گرد ہی ایک حلقہ بنجاتا تہا۔ بعض حصص اس گرجہ کے ایسے ہیں کہ جہاں فیس دئے بغیر نہیں جاسکتے۔ ایک جگہ سونے کی تصاویر تہیں۔ میں نے تین لیرہ دیکر انکو دیکھا۔ وہاں مومی شمعوں کی ضیاء میں ان سنہری تصاویر کی ضو ایک خاص لطف دے رہی تھی تصاویر مختلف قسم کے جواہرات سے مرصع ہیں مجھے ان تصاویر اور طرز عبادت اور مومی شمعوں کے چکروں کو دیکھ کر

سومنات کا مندر یاد آگیا

جسے اگرچہ میں نے نہیں دیکھا مگر تاریخ میں حملہ محمود کے وقت اس کی جو حالت اور کیفیت تھی وہ پڑہی ہے بعینہ یہ نقشہ یہاں نظر آتا تہا۔

لوگ جو اندر آتے تہے۔ ان میں عبادت کرنے والوں کا حصہ بہت کم تہا۔ زیادہ تر اسے عجائب خانہ سمجھ کر ہی آنے والے تہے جنمیں بیرونی سیاح اور خود شہر کے لوگ بھی کچھ وقت گذارنے کیلئے آتے تہے البتہ ایک بات میں نے خصوصیت سے نوٹ کی۔ کہ مستورات جس قدر آتی تہیں۔ وہ ارادت اور عقیدت سے آتی تہیں۔ اور میں نے سمجھا کہ

یورپ میں عیسائی مذہب کی حفاظت عورتوں نے کی ہے

عورتوں میں علے العموم مذہب کی حمیت اور عقیدت کا جذبہ مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے جس قدر عورتیں میں نے اس گرجہ میں مصروف عبادت دیکھی ہیں۔ مردوں کو اس سے کچھ نسبت نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے میں نے سنا اور بارہا سنا۔ آپ فرمایا کرتے تہے کہ

دین العجائز اختیار کرو

اور اسکی تشریح میں فرمایا کرتے۔ کہ عورتیں بہت راسخ العقیدت ہوتی ہیں۔ انکو ماننے کے لئے منطقی دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی اور کوئی چیز ان کے عقیدہ کو جنبش نہیں دے سکتی۔

پھر میں نے دیکھا کہ ان بت پرستوں کو کسی ایک دیوتے پر بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی عبادت اور اطمینان کی تکمیل نہیں ہوتی جب تک وہ اس صلیب اس بت اور دوسری تصویر کے سامنے جا کر گھٹنے ٹیک کر دعا نہ کرلیں۔ انکی اس حالت کو دیکھ کر میں نے خدا کا شکر کیا۔ کہ

میں ایک حیّ و قیّوم کا پرستار ہوں

حقیقت میں انکو یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ایک یا دوسرے خدا کو راضی کریں مختلف معبودوں اور بتوں میں سے ایک یا دوسرے کی ناراضی کا دغدغہ لگا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ ان لوگوں میں ظاہر داری اور تکلفات نے اتنی جگہ لے لی ہے کہ وہ

خدا تعالیٰ کو بھی ان تکلفات میں تلاش کرتے ہیں

غرض میرے لئے یہ گرجہ ایک اچھا خاصہ میوزیم تھا۔ اس میں ملک اور قوم کی عادات اور رسوم انکی قومی تاریخ کی یادگاریں۔ ان کے تمدّن اور اخلاق کا مرقع سب میرے سامنے تھا۔ اور میں ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا تھا۔ امریکن سیاح نے ایک موقعہ پر مجھے کہا کہ آپ اس قدر دلچسپی اس میں کیوں لیتے میں نے اسکو کہا کہ میں دیکھتا ہوں

اگر اس گرجہ پر ہمارا التسلّط ہو۔ اور ہم اسکو اسلامی رنگ میں تبدیل کرنا چاہیں تو کسقدر کام کرنا پڑے گا

میرے اس بیان کو سنکر امریکن سیاح نے کہا کہ اگرچہ مجھے آپ کے اس خیال نے تکلیف دی مگر میں انکی تعریف کرتا ہوں کہ **آپ کا عزم** بہت بلند ہے۔ میں نے کہا اسلام کا **نصب العین** چھوٹا نہیں ہو سکتا۔

مسٹر خواب آلود (مسٹر شنم) کو باہر نکل کر مینے کہا کہ تم نے اپنے خیال میں مسیح کو سولی دیدیا۔ مگر اس گرجا اور یورپ کے دوسرے گرجوں کی شان و شوکت کو دیکھو اور بتاؤ۔ کہ کیا

یہودیوں کا مقصد پورا ہو گیا

مسٹر شنم نے کہا کہ مجھے شبہ ہوتا ہے۔ کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ شبہ نہیں امر واقعہ ہے کہ یہودیوں نے غلطی کی اور اسکی تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ اسلام قبول کریں۔

سینٹ مرقس کا خزانہ اور تبرّکات

ان بڑے بڑے گرجوں میں ہمیشہ بڑے بڑے خزانے پائے گئے ہیں انقلاب فرانس کی داستان جب ہم پڑھتے ہیں۔ اور گرجوں کی تخریب اور ان سے مال غنیمت کے واقعات پرے گذرتے ہیں۔ تو اس قدر زر و جواہر وہاں سے ہمیشہ نکلا ہے کہ شاہی خزانوں میں بھی نہیں ہوتا۔ یہاں کے خزانہ کے متعلق جب مجھے کہا گیا کہ بہت قیمتی سامان تبرکات سے پُر ہے۔ تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا لیکن یہ تعجب ضرور ہوا کہ مسیح علیہ السّلام نے اپنے متبعین کو کہا تھا کہ

مال جمع نہ کرو بلکہ اپنا خزانہ آسمان پر جمع کرو

برخلاف اس کے ان عبادت گاہوں میں ہر قسم کا زر و مال جمع کیا جاتا ہے۔ اور سب سے پرانی شراب بھی ان گرجوں ہی میں ملا کرتی تھی میں نے سینٹ مارک کے گرجہ گھر کے گھنٹے گھڑیالوں اور آرتی کو دیکھ کر سومنات کا تصور کیا تھا۔ حضرت سلطان محمود غزنوی نے جب سومنات کے بُت کو توڑا تھا۔ تو اس میں سے بھی بے شمار زر و جواہر نکلے تھے۔ اور بت کدوں کیلئے یہ مخصوص ہے کہ دنیا کا مال و زر جمع کیا جاوے افسوس عبادت گاہیں تو اس مقصد کے لئے ہوتی ہیں۔ اور ہونی چاہئیں کہ ان میں جا کر

دُنیا کی محبت سرد ہو جائے

اور دنیوی زخارف سے کسی قسم کی دلچسپی باقی نہ رہے۔ کیونکہ یہ سب سے بڑا بُت ہے۔ مگر بُت پرستوں کے معبد میں یہی چیز سب سے پیاری ہو گی

اس بت کدہ کی دولت اور سنہری روپہری شوکت کو میں دیکھتا تھا۔ اور معاً میرے دل میں مسجد کی سادگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد آ گیا۔ کہ

میرے لئے تمام زمین مسجد بنادی گئی ھے

ایک مسلمان کسی سادگی سے جہاں چاہے۔ خدائے وحید کی عبادت کر سکتا ہے۔ اس کے لئے گھنٹہ گھڑیال اور ناقوس و قرنا کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان تمام چیزوں کو ایک لٹے اور بربادی کے رنگ میں دیکھا۔

میں خزانہ کے دروازہ پر گیا لیکن مجھے اندر جانے کا موقعہ نہ ملا۔ مجھے یہاں یہ دیکھ کر پھر ایک بار تعجب ہوا کہ اس خزانہ کی سب سے بڑی محراب عربی وضع کی ہے۔ خزانہ کے دو حصہ ہیں۔ ایک میں قیمتی تحائف اور اشیاء کے علاوہ بزرگوں کے تبرکات ہیں۔ جنہیں سے زیادہ تر قسطنطنیہ سے لائی گئی

تھیں. سینٹ مرقس کی انجیل اور ایک مشہور ڈوج بادشاہ کی تلوار کے علاوہ کہتے ہیں. یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر بھی رکھا ہوا ہے. میں چاہتا تھا. اور شوق سے کہتا تھا کہ

اس سر کو دیکھوں

مگر مجھے موقعہ نہ مل سکا. میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اصلی سر ہے یا یونہی کوئی سر رکھدیا ہے اور خوش اعتقادوں کیلئے کہدینا کافی ہے کہ یوحنا کا سر ہے۔

عیسائیوں میں اس قسم کی باتیں ناممکن نہیں. صلیبی جنگوں کے دنوں میں یہ پادری اپنے عجیب و غریب کشوف سے نادان پیروؤں کو اکسا کر موت کے گھاٹ اتارتے تھے. اور انہوں نے اسلامی امن کو خطرہ میں ڈالنا چاہا تھا. صلح کے شہزادے کے یہ پرستار فرضی ولیوں کو دیکھ کر خون آشام تلواریں لیکر میدان میں آتے تھے. دوسرے حصّہ خزانہ میں مجھے بتایا گیا کہ ایک شیشے میں مسیح کے خون کے قطرات نظر آتے ہیں. اب تک ان قطرات خون کا باقی رہنا بھی درحل خوش اعتقادی یا زود اعتقادی کا ایک کرشمہ ہے. میں کہتا تو صحیح کیفیت یا اپنے اثرات قلبی اور خیالات دماغی کا اظہار کرسکتا. مگر میں اسے ایسا ہی سمجھتا ہوں. جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے. کہ ایام محرم میں مٹی خون بنجاتی ہے. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب یہاں جمہوریت تھی تو اس قسم کے تبرکات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا. اور اب بہت ہی قلیل تعداد اور مقدار رہ گئی ہے. کیونکہ جمہوریت کے زوال اور فرنچ قبضہ کے بعد وہ سب تبرکات دنیا بھر میں منتقل ہو گئے :۔

اس طرح پر میں نے اس عجائبات کے مجموعہ گرجا گھر کی سیر کو ختم کیا. راہب جو یہاں رہتے ہیں انکی لمبی ڈاڑھیوں اور صوفیوں کی سی ٹوپیوں کو دیکھ کر انپر مشائخ کا دھوکا ہوتا ہے. مجھے یہاں اس لباس کو دیکھ کر ان مسلمانوں پر افسوس ہوا جو یورپ میں آکر اپنے لباس کو ترک کرتے ہیں اگر وہ اپنے ہی لباس میں ہیں اور ڈاڑھیاں رکھیں تو یہاں کے لوگوں پر اس کا نہایت نیک اثر پڑے ان لوگوں کے دلوں میں مذہبی ہادیوں اور لیڈروں کی عام طور پر عزت و اکرام پایا جاتا ہے۔

سینٹ مرقس کا گھنٹہ گھر

اب اس عجائب خانہ (گرجہ) سے نکلکر میں پھر سینٹ مرقس کے چوک میں آگیا. اور سینٹ مرقس کے گھنٹہ گھر کے نیچے آکھڑا ہوا. یہ وہ گھنٹہ گھر نہیں ST. MARK"S CAMPANILE جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں. اسے

کہتے ہیں کمپانیلے کے معنے گھنٹہ گھر ہے۔ یہ گھنٹہ گھر آٹھویں صدی میں تعمیر ہوا تھا لیکن ۱۴۔ جولائی ۱۹۰۲ء کو
دن کے ۱۰ بجے یکایک گر پڑا۔ اور ایک بھی جان کا نقصان نہ ہوا۔ اور اس اتفاقی واقعہ نے باشندوں
کی ارادت اور عقیدت کو اور بھی بڑھا دیا۔ کہ یہ سینٹ مرقس کی برکت کا نتیجہ ہے۔ مجھے بتایا گیا۔ کہ اس موقعہ پر
یہاں چشم زدن میں بہت بڑا ہجوم تمام لوگوں کا ہوگیا تھا۔ اور ہر چھوٹا بڑا یہاں پہنچ گیا۔ اور اس تودہ سنگ
خشت کو دیکھتے تھے۔ جو صدیوں کی تاریخ اپنے اندر رکھتے تھے۔ اس روز بلدیہ کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ

یہ گھنٹہ گھر اسی جگہ ہو اور اسی طرز و شان کا تیار کیا جاوے

چنانچہ کام شروع ہوگیا۔ اور ۲۵۔ اپریل ۱۹۱۲ء کو یہ تعمیر مکمل ہوگئی۔ پہلا گھنٹہ گھر کی بنیاد ۹۱۱ء
میں رکھی گئی تھی۔ اور باوجودیکہ وہ زمانہ مختلف قسم کی مشکلات اور جنگوں کا تھا۔ امن اور اطمینان خاطر
مفقود تھا۔ مگر یہ تعمیر کا کام بلا غل و غش دو صدیوں تک برابر جاری رہا۔ اور گھنٹہ گھر والی منزل کی تکمیل
۱۱۵٦ء سے لیکر ۱۱۷۳ء تک ہوئی۔ مگر ۱۴۸۹ء کو اس پر بجلی گری۔ اور یہ حصہ چونکہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اسلئے
بالکل تباہ ہوگیا۔ پھر تعمیر ہوا اور پھر ۱۵۱۱ء میں جبکہ جینوا پر فتح کی شادمانی کا جلسہ منایا جاتا تھا۔ اور اس حصہ
پر چراغاں کیا گیا تھی۔ پھر آگ لگ گئی۔ وہ پھر درست کیا گیا۔ اور ۱۵۴۸ء کو پھر بجلی گری۔ اور آگ لگ گئی۔
آخر پھر اسکی مرمت کی گئی۔ اور اس پر ۱۵ گز اونچا کا پر پلیٹ لگا دی گئی۔ جو مرغ موسم نما کا کام بھی دیتی تھے
پھر جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ یہ سب کا سب گر پڑا۔

اس مصیبت کا اعلان تار برقی کے ذریعہ تمام دنیا میں کیا گیا۔ اور دنیا کے ہر حصہ سے اس مصیبت پر
ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اور اٹلی کے بادشاہ نے ایک لاکھ لیرا دیکر اسکی ازسرِ نو تعمیر کے لئے فنڈ کا آغاز
کیا۔ اور ملبہ کے اٹھانے کا کام فوراً شروع کر دیا گیا۔ جدید تعمیر کا بنیادی پتھر سابق پوپ کی صدارت میں
(جو اس وقت پیٹری آرک تھا) رکھا گیا۔ ۲۴۔ اپریل ۱۹۱۲ء اس جدید گھنٹہ گھر کی تکمیل ہوگئی۔ اور
۱۵ اور جون کو تقدیس کی گئی۔ اس گھنٹہ گھر میں ابتداً چھ گھنٹے تھے۔ مگر اب صرف پانچ ہیں۔ ہر ایک کا
جدا نام اور جدا مقصد تھا۔ سب سے بڑا کاریگروں کیلئے بجایا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے کام کا آغاز کر سکیں
اور دوپہر کو بجتا تھا۔

دوسرا گھنٹہ ڈاک کیلئے خطوط بھیجنے کے آخری وقت کا اعلان کرتا تھا۔ تیسرا گھنٹہ مذہبی فرائض
کی بجا آوری کیلئے پکار کا ذریعہ تھا۔ چوتھا ممبران کونسل اور مجسٹریٹوں کو اپنے فرائض کیلئے بلانے کا کام دیتا

تہا۔ اور پانچواں اس وقت بجایا جاتا تہا۔ جب کہ کسی سزا کے خلاف اظہار نفرت کیا جانا مقصود ہوتا۔ اور چھٹا گھنٹہ جمہوریت کی بحری فتوحات کے اعلان کیلئے ہوتا تہا۔

چونکہ بجلی گرنے کیوقت ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا تہا۔ اور پھر اس کی جگہ دوسرا نہ لگ سکا۔ اب پانچ گھنٹے ہیں جو کام دیتے ہیں۔

اس گھنٹہ گھر پر ۲۰۰ فیٹ کی بلندی تک لفٹ کے ذریعہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے ایک عملہ مقرر ہے اور معقول آمدنی اوپر جانے والے لوگوں سے ہوتی ہے۔

عرفانی سینٹ مرقس کے گھنٹہ گھر پر

میں نے اور مسٹر شنٹم اور امریکی سیاح نے تین تین لیرے دیکر اوپر جانے کیلئے ٹکٹ لئے اور ایک ہی منٹ میں ہم منزل مقصود پر جا پہنچے۔ دو سو فیٹ کی بلندی پر جاکر ہم کو اتار دیا گیا۔ آخری منزل پر جانے کی اجازت نہیں۔ اس جگہ سے شہر کا منظر نہایت خوبصورت ہے۔ چاروں طرف پانی ہے۔ اور بیچمیں وینس کا شہر آباد ہے۔ جو چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو الفاظ اسکو بیان نہیں کر سکتے۔ منظر بہت ہی خوشنما تہا۔ اس مقام پر شہر کے مختلف مناظر کے کارڈ فروخت ہوتے تہے اور لوگ خرید کر وہیں لکھ رہے تہے۔ اسی جگہ لیٹر بکس اور ڈاک کے ٹکٹوں کا انتظام تہا۔ میرے رفقاء نے بھی کارڈ لیکر لکھے۔ اور خود میں نے بھی ایک کارڈ لیکر جو اس گھنٹہ گھر ہی کی تصویر کا تہا۔ اسپر تاریخ دیکر گھر کو لکھدیا اور جس مقام پر میں موجود تہا وہاں نشان کر دیا اس ذریعہ سے بھی معقول آمدنی روز ہوتی ہے۔ میرا فرستادہ کارڈ میرے گھر میں موجود ہے۔

میں اس بلندی پر کھڑا تہا۔ اور اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتا تہا۔ اس بلندی پر کھڑے ہو کر میں نے دعا کی۔ کہ اے ہر قسم کی بلندیوں کے مالک اور خالق اسلام کا بول بالا کر اور مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ ان بلندیوں سے اللہ اکبر کی صدا سنائیں۔

ایک الجیرین مسلمان سے ملاقات

میں اسجگہ کھڑا ہوا نظارہ کر رہا تہا۔ ایک الجیرین جو یورپین لباس میں تہا میرے پاس آیا۔ اور اس نے السلام علیکم کہا۔ اس آواز نے میرے اندر ایک بجلی کی سی لہر پیدا کر دی۔ میں نے جھٹ سلام کا جواب دیکر اس سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں کون ہیں؟ اس نے کہا کہ الجیریا سے آیا ہوں۔ اور الجیرین مسلمان ہوں۔ چونکہ کافی وقت نہ تہا میں اس سے زیادہ

گفتگو کا موقعہ نہ پاسکا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ عام طور پر مسلمانوں کی حالت وہاں اچھی ہے لیکن جب میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کی عملی حالت کیسی ہے۔ تو اس نے افسوس سے کہا۔ کہ یورپ کا اثر ہماری مذہبی حالت کو بدل رہا ہے۔ اور یورپی عادات ہر جگہ پھیل رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے ہندوستان کی حالت کے متعلق سوال کیا۔ میں نے اسکو کہا کہ ہندوستان کی حالت میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اسلام کی ترقی کی امید یقین سے بدل رہی ہے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے وہاں اس شخص کو بھیجا ہے جو

مہدی اور مسیح موعودؑ کے نام سے آنیوالا تھا۔

یہ سنکر اسے تعجب سا ہوا۔ اور مجھے پوچھا کہ آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے خدا کے فضل سے اُسے دیکھا ہے۔ اور انکی صحبت میں مستقل طور پر ایک عرصہ گذارنے کی توفیق ملی ہے۔ اس کا نام **میرزا غلام احمد** علیہ الصّلوٰۃ والسلام تھا۔ اور اب تمام دنیا میں یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا مرکز قادیان میں ہے۔ اس الجیرین کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ اسلئے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اور اس محویت میں ہم تبادلہ پتہ بھی نہ کر سکے جسکا مجھے افسوس رہا۔

اس منظر کو دیکھ کر ہم نیچے اُترے۔ اور کھانا کھانے کے لئے اپنے اپنے ہوٹلوں کو چلے گئے۔ اس گھنٹہ گھر کے نیچے ایک طرف دیوار پر دو ڈائل اور لگے ہوئے ہیں۔ ایک سے سمندر کے پانی کی سطح کا نقشہ ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اور دوسرا صرف وقت بتلانے کے لئے ہے۔ یہ نہایت کارآمد اور مفید چیز ہے۔

اٹلی کی ماؤں کا مجسمہ

اس کے پاس ہی جنگ کی ایک یادگار جو۔ ملکہ اٹلی کی تحریک سے قائم ہوئی ہو کا دفتر ہے یہ یادگار۔ **اٹلی کی ماؤں کی یادگار ہے۔** جنہوں نے جنگ عظیم میں اپنے بچوں کو بھیجا۔ اور جو ملک کیلئے قربان ہوئے حقیقت میں وہ مائیں قابل قدر اور قابل عزت ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا۔ کہ اس یادگار کی تکمیل پر ایک ملین یعنی دس لاکھ لیرہ خرچ ہوگا۔ میں اس قسم کی یادگاروں اور مجسموں کا اندازہ نہ تو اس رقم سے کرتا ہوں جو اسپر خرچ ہوتی ہے۔ اور نہ اس تیار شدہ مجسمہ کی جسامت اور مساحت سے بلکہ اس کی قدر و قیمت میں ہمیشہ ان اغراض سے دیکھتا ہوں جو وہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ یادگار جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ اٹلی کی ماؤں کی قربانی اور ایثار کی ہوگی۔ کہ کس طرح اپنے لخت جگروں کو ملک اور شاہ کیلئے قربان کرنے کیواسطے انہوں نے بھیجدیا۔

مبارک ہیں وہ مائیں جو ایسے بلند حوصلہ رکھتی ہوں اور جن کے جذبات محبت میں ملک کیلئے قربانی کا اتنا بڑا جذبہ ہو۔ اور مبارک ہیں وہ بچے جو ایسی ماؤں پر فخر کرتے ہوں جنہوں نے انہیں جنا اور انہیں ملکی خیرسگالی کیلئے جان دینے کا جذبہ پیدا کر دیا۔
اسلامی تعلیم میں ماؤں کے احترام و اکرام کے لئے ایک ہی جملہ کافی ہے کہ

جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے

اور ایک دوسرے موقعہ پر ایک مُسلم کے قلب میں شجاعت و جرأت اور تلواروں کے سایہ میں بھی اظہار حق کی قوت پیدا کرنے کیلئے کہا گیا۔ کہ

(الجنۃ تحت السیوف) (جنت تلواروں کے نیچے ہے)

نادان اس سے مسلمان کی طبیعت اور فطرت کو جنگ و جدل کا مترادف قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے وہ تو خود امن میں ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو امن بخشتا ہے۔ میں ہمیشہ اس کے معنے انتہائی جرأت اور شجاعت کے کرتا ہوں۔ اور اسکی تہ میں نڈری اور بیخوفی کی تعلیم پڑھتا ہوں۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا میں نے اس یادگار کی تحریک کو دیکھا اور اسکے ناظمین سے جو عورتیں ہیں ملاقات کی اور اس نیک اور بلند خیال کی تعریف میں جو کچھ میں کہہ سکتا تھا میں نے کہا۔ یہاں عورتوں کی ایک بہت بڑی ایسوسی ایشن ہے۔ اور اس کے ماتحت عورتوں کی فلاح و بہبودی کے بہت سے کام جاری ہیں

عورتوں کا تعمیر ملک و قوم میں حصہ کسی قوم اور ملک کی تعمیر میں عورتوں کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی قوم اور ملک بغیر عورت کے قوم یا ملک ہی نہیں کہلا سکتا۔ کسی ملک کے بہترین فرزند بہادر اور شجاع ہوں۔ اور شاعر ہوں۔ یا مذہبی حیثیت سے ممتاز ہوں۔ فلاسفر ہوں یا موجد۔ بہرحال

عورت ہی کا عطیہ ہیں

اور ماں جس قسم کے جذبات اور خیالات اپنی اولاد کے اندر پیدا کرنا چاہے کرسکتی ہے پس میں نے انگلی کی ماؤں کو اپنی اولاد میں قربانی کے جذبات پیدا کرنے پر مبارکباد دی۔ اور میں نے خواہش کی۔ کہ

احمدی مائیں دنیا کی تعمیر میں اپنے فرزندوں کو معمار بنائیں

میں اس خواہش اور آرزو میں بے اختیار ہو کر

ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما

کی دعا کرنے لگا۔ اٹلی کی ماؤں کی یہ یادگار ہمیشہ ماؤں کو اپنے فرائض متعلقہ ملک کی یاد دلاتی رہیگی اور وہ اپنے فرزندوں کو ہر قربانی کیلئے بآسانی تیار کرسکیں گی۔ غرض یہ یادگار درصل یادگار نہیں۔ بلکہ ایک

معلم اور محرک ہے

جو قوم میں زندگی کی تحریک کو زندہ رکھتا ہے میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں کہ جس قسم کی یادگاریں یہاں موجود ہیں کچھ شک نہیں کہ بظاہر وہ سنگی یادگاریں ہیں لیکن یہ سنگی مجسمے پتھر کا دل رکھنے والے انسانوں کو موم بنا دینے کی قوت اور اثر رکھتے ہیں۔

ڈوج کے محل میں

کھانا کھانے اور نماز ظہر و عصر پڑھ لینے کے بعد میں پھر سینٹ مرقس کے چوک میں آیا تاکہ ڈوج کے محل کی سیر کروں۔ یہ بہت بڑی شاندار عمارت ہے۔ اور اس کے ساتھ قدیم تاریخ کا ایک دلچسپ دفتر ہے۔

عمارت کی خوبصورتی اور شان کے لحاظ سے یہ عمارت دنیا بھر کے شاہی محلات میں ممتاز اور بینظیر سمجھی جاتی ہے۔ میں چونکہ فن تعمیر کی خوبیوں سے محض ناآشنا ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فنون لطیفہ سے مجھے کچھ بھی حصہ نہیں ملا۔ اسلئے میں اس پہلو سے اسے نہیں دیکھوں گا۔ بلکہ جیسا کہ میں اکثر مرتبہ کہہ چکا ہوں میرا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے۔

مشاہدات کے پڑھنے والوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ سینٹ مرقس کے چھوٹے چوک کے شرقی حصہ میں یہ محل واقعہ ہے۔ اور جمہوریت وینس کی سیاسی زندگی کا یہ عبرت بخش مجسمہ ہے۔

کچھ تاریخی تذکرہ

اس عمارت کی ابتدائی تاریخ ۸۱۰ء تک جاتی ہے۔ جب ۹۷۶ء میں لوگوں نے حکومت کیخلاف بغاوت کی تو انہوں نے اس عمارت کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس قدیم عمارت کے بعض کھنڈرات ابھی اب تک موجود ہیں۔ پھر ۹۷۶ء میں مکرر تعمیر ہوئی اور پھر جلائی گئی۔ اور پھر تیسری مرتبہ ۱۱۰۶ء میں تعمیر ہوئی۔ اسطرح کے انقلابات اس شاہی عمارت پر آتے رہے اور موجودہ عمارت جو ہم دیکھتے ہیں۔ اسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سولہویں صدی کی یادگار ہے اس عمارت کے

ہر کمرہ کیساتھ ایک تاریخی دلچسپی ہے۔ اور میرے لئے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کہ میں تاریخ کے اس قدر صفحات کو یہاں درج کرسکوں۔

میں جب ان انقلابات کی تاریخ کو پڑھتا ہوں۔ تو خدا تعالٰے کی قدرت اور اسکی حکومت و جبروت کا ایک سکّہ میرے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔

وہ جسے چاہتا ہے بادشاہ بنادیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے

اور اس زمانہ کی حکومت اور اسکی کمزوریوں کا ایک صحیح اور صاف نقشہ میرے سامنے آجاتا ہے یہ وینس یا اٹلی سے مخصوص نہیں۔ بلکہ کسی ملک کی اس ابتدائی تاریخ کو ہم اٹھا کر دیکھیں۔ تو ہر جگہ یہی حالت نظر آتی ہے سلطنت یا حکومت کے ارتقائی فلسفہ کی تاریخ پر اگر بحث کیجاوے تو وہ بڑی ہی دلچسپ ہوسکتی ہے۔ آج حکومت یا سلطنت جس مقام پر پہنچی ہے۔ اور اسمیں جو ترقیاں پیدا ہوچکی ہیں۔ وہ نہایت شاندار اور اپنے اندر ایک علمی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا حکومت بھی بجائے خود

ایک سائنس بنگیا ہے

میں حکومتوں کے فلسفہ پر بحث نہیں کررہا۔ بلکہ اس شاہی محل میں داخل ہورہا ہوں محل کے اندر داخل ہوکر ہم ایک بڑے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف کی سیڑھیوں پر سے اوپر چڑھتے ہیں تین مختلف کونوں میں نہایت علم اور بصیرت افروز بت بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک موقعہ پر عدل سلیمانی کی تصویر دکھائی ہے۔ اور ایک دوسرے موقعہ پر

گناہ اوّل کا مرقع ہے

اور تیسرے زاویہ پر نوح نبی کا مرقع ہے۔ اور اسی طرح بالائی گیلری میں ہم جبرائیل میکائیل اور اسرافیل فرشتوں کے مرقع دیکھتے ہیں

ان مرقعہ جات کو کوئی شخص جو غائر نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ فکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ ہر روز ان مرقعہ جات کو دیکھتے ہیں۔ اور کوئی سبق ان سے نہیں لیتے وہ سلاطین جنہوں نے اس محل پر عدل سلیمانی کا مرقع بنوایا۔ اور جو اسے دیکھتے تھے۔ وہ اس سے خود کوئی سبق نہ لیتے تھے۔ جس قسم کے مظالم اور سیاہ کاریوں اور زبردستیوں کا یہ محل گھر ہے۔ ان کے بیان سے بھی

آج بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے عہد، عذاب اور اس سے نجات کے طریق کو اس کے مرقع کو دیکھ کر بھول جاتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کے مقرب فرشتوں کے مرقعے جو گو خیالی ہیں دیکھتے ہیں مگر ان سے تعلق پیدا کرنے کا جوش ان میں نہیں پیدا ہوتا۔

ملک الموت کا مرقع نہیں

میں نے بڑے غور سے دیکھا تو ملک الموت کا مرقع مجھے نظر نہ آیا میری رائے میں انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ موت کو بھول جانا چاہئے۔ حالانکہ سب سے ضروری چیز جس کو یاد رکھنا چاہئے۔ وہ موت ہے۔

اسلامی تعلیم میں اس نقطہ کو بہت واضح اور روشن کیا گیا ہے۔ موت کی یاد انسان کیلئے بہترین واعظ ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یادِ موت انسان کے اندر نا امیدی اور بزدلی پیدا کرتی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اس سے کمزوری اور بزدلی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ

عزم بلند اور مستعدی پیدا ہوتی ہے

انسان جب تک سمجھتا ہے۔ کہ ابھی کافی وقت اور زمانہ میری زندگی کا دراز ہے وہ نڈر اور سست ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسے معلوم ہو کہ وقت قریب آرہا ہے۔ تو وہ تیز قدم اور چست ہو جاتا ہے۔ بہر حال اسلام نے یہ تعلیم دی۔ کہ موت کو یاد رکھو میں نے ان تمام مرقع جات کو دیکھا۔ اور ان پر غور کرتے ہوئے گذر گیا اور

باب القرطاس پر جا کھڑا ہوا

باب القرطاس

یہ دراصل ایک دوسرا داخلہ کا دروازہ ہے۔ اس کا نام باب القرطاس THE PORTADELLACATA اسلئے ہوا کہ یہاں چھوٹے کے فرامین اور اعلانات آویزاں کئے جاتے تھے اور چونکہ شاہی فرامین اسی مقام پر لگتے تھے۔ اس کا نام باب القرطاس ہو گیا۔

میں اس مقام پر کھڑا تھا۔ اور گذشتہ پانچسو برس کی تاریخ میرے سامنے تھی۔ ایک وقت تھا جب کہ پرندہ یہاں پر نہ مار سکتا تھا۔ بڑے بڑے قوی ہیکل دربان اور پاسبان ہتھیار لگائے یہاں پہرہ دیتے تھے اور ہر شخص اندر آتے ہوئے ڈرتا اور کانپتا تھا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ ہر شخص جب چاہے۔ اور جب تک چاہے یہاں پھر سکتا ہے۔

اخلاقی اور طبعی مجسمے

اوپر جانے پر عجیب غریب مجسمے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ پر

مجسمہ عدل ہے

اور ایک جگہ پر مجسمہ ٹمپرنس یعنے مسکرات سے بچنے کی قوت کا مجسمہ ہے۔ اور ایک دوسری جگہ قوت۔ خیرات اور فطنت کے مجسمے ہیں۔ ان تصاویر کے ذریعہ انسان کو جو قیمتی سبق دیا گیا ہے۔ وہ وینشین قوم کے اخلاق اور انسان کی طبعی قوتوں کے نشو و نما پر روشنی ڈالتے ہیں بحیثیت ایک معلم اخلاق یا طبیب کے بحث نہیں کر رہا ہوں بیں تو ان چیزوں کو ایک ناظر کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ لیکن یہ میں نے نہیں کہا۔ کہ بدون کچھ سیکھے آگے چلا جاؤں۔

جرائم سے اظہار نفرت کا طریق

کورٹ یارڈ کی گیلری کے اندر اور باہر ایک خاص چیز نے مجھے متوجہ کیا یہ مختلف اور متعدد دہشت افزا اور نفرت زا پتھر تھے جو لگے ہوئے تھے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ ڈوج سلاطین کا یہ طریق تھا۔ کہ وہ ان لوگوں کے خلاف جذبہ نفرت و حقارت پیدا کرنے کے لئے (جو جمہوریت کے خلاف جرائم قبیحہ کا ارتکاب کرتے) ایسے پتھر نصب کر دیتے تھے۔ اور عام لوگ انہیں دیکھ کر اس قسم کے جرائم کو ناپسند کرتے۔ اور اس طرح پر ایک حد تک انسداد جرائم ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ زیادہ تر جرائم سنگ قلب کے ہوتے تھے۔ سزا کی تشہیر حقیقت میں عبرت کیلئے بہت ہی بہتر ذریعہ ہے۔

قرآن مجید کی تعزیرات کو جب میں دیکھتا ہوں تو انکی فلاسفی پر نظر کرتے ہوئے ایک وجد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض جرائم جو حفظ عصمت کے متعلق ہیں۔ بدنی تعزیر سنگسار وغیرہ کیسی عبرت ناک اور ہیبت بخش ہے۔ یا جھوٹے الزام لگانے والے کی شہادت کبھی قبول نہ ہو وغیرہ۔ اس قسم کی تعزیرات سے جرائم کا سد باب ہو جاتا ہے میں ان پتھروں کو دیکھ کر اس زمانہ کی تہذیب تمدن پر غور کرتا تھا چونکہ انسان فطرتاً اپنے کسی جرم کی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ اور طبعاً وہ شہرت پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے ایسے اعلانات بہت بڑی حد تک سد باب کا موجب ہوتے ہوں گے۔

جرائم قبیحہ میں زیادہ تر اس وقت سنگ قلب کے جرائم سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح یہاں پر ایک اور چیز بھی میں نے دیکھی۔ جسکو یہ لوگ بوچو ڈی ان سیا (دہان اعلان) کہتے ہیں۔ یہ خفیہ پولیس کے لوگ مجرموں کے متعلق اطلاعات دینے کیلئے استعمال کرتے تھے۔ اس طرح پر اطلاع دینے والے کی شخصیت کا پتہ نہیں لگتا تھا یعنی مجرم نہیں معلوم کر سکتے تھے اس قسم کی چیزیں اس وقت کی حکومت کے طریق عمل تفتیش حالات اور

طریق تعزیر کا بہترین اظہار ہیں۔ کورٹ یارڈ سے گذر کر اب میں محل کے اندر داخل ہوا۔

محل کی اندرونی سیر

اس میں داخلہ کیلئے سیڑھیوں پر سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ زینہ کے اوپر ہی وہ مقام ہے۔ جہاں سلاطین کی تاجپوشی ہوا کرتی تھی۔ میں وہاں کھڑا ہوا اور میں نے قیاس کیا کہ

جہاں ایک وقت وینس کے سلاطین جلیل القدر تاجپوشی کی رسم ادا کرتے تھے مسیح موعود علیہ السلام کا ایک ادنیٰ خادم وہاں جوتیاں رگڑ کر چلتا ہے۔ یہ انقلاب عجیب عبرت بخش ہے۔ اور اسکا تصور دیر تک مجھے حیران کرنے کو کافی تھا۔ میں اوپر کی گیلری میں داخل ہو گیا۔ اس کے بائیں طرف پر ایک پرمحراب زینہ کا ہے۔ جہاں سے ڈوج بادشاہ نیچے جایا کرتے تھے۔ اس زینہ پر اب حضرت مریمؑ کا ایک بت نصب ہے۔ اور وہ حضرت مسیح کو بچپن کی عالت میں لئے ہوئے ہے۔ ایک گیلری میں بہت سے کتبے مختلف تاریخی واقعات اور حالات کے اظہار کو ظاہر کرتے ہیں۔ جنمیں تازہ ترین ۱۸۴۷ء کا ہے جبکہ سائنسدانوں کی ایک بڑی کانگرس اس مقام پر ہوئی تھی۔

محرابوں کے اوپر تمام گیلری میں وینس کے شاہیر کی تصاویر ہیں۔ جو مختلف زمانوں میں مختلف حیثیت سے ممتاز رہے ہیں۔ یہاں سے ہم ایک سنہری ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کی تزئین و آرایش کو الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ اور اسکا مرقع بھی اس خوبی کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

اسکا یہ نام اس لئے ہے کہ اس میں داخلہ کی اجازت اس عہد سلاطین میں صرف ان لوگوں کو ہوتی تھی۔ جنکا نام کتاب الذہب (سنہری کتاب) میں ہوتا تھا۔ اس ہال کی چھت تمام کی تمام منقش او رمذہب ہے۔ ملاکاری کا کام نہایت نفیس ہے۔ ایک بہت بڑی انگیٹھی میں نے دیکھی۔ جو دو شاندار ستونوں پر مکان کو گرم رکھنے کیلئے بنائی گئی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تیرھویں صدی کی یاد دلاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اپنی زبانِ حال سے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس عہد کی وینس حکومت کی عظمت کا اظہار کرتی ہے۔ اور ہر دیکھنے والے سے حکومت کے متعلق خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہتی۔

سنہری زینہ کے اوپر ایک مختصر سا کمرہ ہے۔ جو مربع شکل کا ہے۔ جو سفرائے دول خارجہ کے سستانے کیلئے بنایا گیا تھا۔ جبکہ وہ کونسل میں جاتے کیلئے آتے تھے۔ اس چھت اور دیواروں پر مشہور و معروف آرٹسٹ ٹنٹوریٹو کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصاویر ہیں مختلف کمروں اور ہالوں کا ایک

سلسلہ چلا گیا ہے۔ اور ہر ایک اپنی شان تعمیر و تزئین کے لحاظ سے شاندار اور بے نظیر ہے۔ ان مختلف کمروں اور ہالوں سے گذر کر پھر ایک اور بڑا ہال آتا ہے۔ جہاں سفرائے دول خارجہ کا استقبال ہوتا تھا اس ہال کی چھت طلاکاری اور آرائش و خوبصورتی کے لحاظ سے تمام محل میں سب سے اعلیٰ سمجھی گئی ہے۔ اس چھت کو ۱۱ مربعوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اسپر نہایت اعلیٰ درجہ کی تصاویر اعلیٰ اخلاقی قوتوں اور بعض سیارگان کی بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک تصویر رومنس کی بھی ہے۔ جو تمام دنیا پر **عدل و امن** کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ میں آرٹسٹ نہیں۔ اور فنون لطیفہ سے کوئی حصہ نہیں رکھتا۔ مگر یہ سچ کہتا ہوں کہ دیر تک محوِ حیرت رہا۔ اور میرے رفیق مسٹر خواب آلود تو بار بار کہتے تھے۔ کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں جب وہ یہ کہتے تو میں بھی کہدیتا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا یا سُنا افسانہ تھا

عیسائیوں کے ولیوں اور سینٹس کی تصاویر اور خود حضرت مسیح کی زندگی کے مختلف مرقعہ جات کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ میں ان تصاویر پر غور کرکے بے اختیار اس نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو یہ قوم (عیسائی) مذہبی عقیدت میں بہت مضبوط اور سرگرم رہی۔ اسی محبت نے ان میں غلو پیدا کیا۔ اور انہوں نے حد سے گذر کر ایک عاجز انسان کو

الوہیت اور عظمت ربانی کے تخت پر بٹھا دیا

سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

یہاں ہی وہ عظیم الشان تخت بھی ہے جسپر مختلف قسم کے مرقعے ہیں۔ جن سے شاہی عظمت اور تاریخ کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مذہبی سپرٹ کو قائم رکھا گیا ہے۔

ایک دل پسند بات مجھے ان تمام مرقعہ جات کو دیکھ کر اور اس عظمت و ہمت کے ہر قسم کے مظاہرات پر نظر کرتے ہوئے جو بات سب سے زیادہ پسند آئی۔ وہ مذہبی روح ہے مسیح کی زندگی کے مختلف مناظر اور دوسری مذہبی تصاویر اس بادشاہ کی مذہبی عقیدت اور روح کو فنا ہونے سے بچالیتی ہونگی۔ جو یہاں آکر تخت پر بیٹھتا اور دول خارجہ کے سفراء کو باریابی کا موقعہ دیتا تھا بے شک میں اس قسم کی تصویر سازی اور تصویر پرستی کا مؤید نہیں۔ اور اسے پسند نہیں کرتا لیکن جہاں انسان **حکومت** کے مقام پر پہنچکر تکبر و نخوت کا ایک پتلا بنجاتا ہے۔ اور مذہب کی روح مرجاتی ہے

وہاں ان سلاطین کو یہ مرقعہ جات ضرور سبق دیتے ہتے کہ تجھے۔

اپنی عقیدت کی نذر باوجود بادشاہ ہونیکے مسیح کے قدموں میں پیش کرنی ہے

میں اس روح کی اور اس جذبہ کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے کہنے دو کہ عیسائی قوم کی اس عالمگیر حکومت کا راز اس عقیدت میں مخفی ہے۔ بے شک موجودہ عیسویت کے عقاید سراسر ظلم اور خدائے وحید کے حضور سخت کراہت اور ناپسندیدگی کا موجب ہیں۔ مگر اسمیں شبہ نہیں کہ

مذہبی محبت و عقیدت کے جذبہ کا یہی مطالبہ ہے

کہ باقی تمام محبتوں کو اس پر قربان کر دے۔

اشد حباً للہ

اسلام نے انسان کو جبروت کے تخت پر بٹھایا ہی نہیں۔ اسکی سادگی ہی میں شوکت و عظمت کی شان ہویدا تھی۔ خلفاء راشدین کی زندگیاں بہترین نمونہ ہیں۔ مگر مسلمانوں نے جب ان عارضی اور دنیوی سامان تفاخر کو جمع کیا۔ تو اس کے ساتھ مذہب کی ہیبت ان کے دلوں پر پیدا کرنے والی کوئی چیز سامنے نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عظمت سلطانی کو ہی مقدم کیا اور عظمت سلمانی دل سے جاتی رہی۔ اور اس کے بعد جو ہوا وہ ظاہر ہے۔

میں ان مناظر اور تماثیل کو دیکھتا آگے چلا۔ اور ایک موقعہ پر دیکھا کہ ایک جلیل القدر بادشاہ اپنی نذر عقیدت حضرت مریم کے حضور پیش کر رہا ہے۔ اور اس کے پاس ہی امن کا مرقع ہے۔ جس میں یہ سبق تھا۔ کہ

امن کا حصول عبادت پر موقوف ہے

میں نے اس نظارہ عبادت اور اس کے نتیجہ کو دیکھا۔ اور میرا دل قرآن مجید کی عظمت کے سامنے جھک گیا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

ایک دوسری کشش

دوسری چیز جسنے مجھے محو نظارہ کیا۔ اور میرے قلب پر ایک گہرا اثر چھوڑا وہ یہ تھی کہ اس تخت کے دائیں طرف ایک دالان ہے۔ جو عبادت گاہ (چیپل) کہلاتا ہے۔ اور

وہ قریب ہی ہے۔ یہ اس لئے کہ تخت وعظمت وحکومت پر بیٹھ کر بھی بادشاہوں کو خدا کی یاد نہیں بھول جانی چاہیئے۔ میں نے دہلی اور آگرہ کے قلعوں کو دیکھا ہے۔ دیوان عام اور دیوان خاص کے نظارے میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اور کسی جگہ کا لکھا ہوا یہ شعر میرے سامنے آیا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

چیپل میں میں اس چیپل کو دیکھنے گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ اگلی دو کھڑکیوں کے درمیان حضرت مسیح کے اس واقعہ کا نہایت معنی خیز مرقع ہے۔ جسمیں وہ سود خوار یہودی مہاجنوں کو ہیکل سے نکال رہے ہیں چیپل میں حسب معمول مختلف قسم کے مرقع اور مجسمے مسیح کی زندگی۔ اس کی موت اور مسیح ومریم کے بنے ہوئے ہیں۔

قربانگاہ نہایت شاندار ہے۔ وہاں سے واپس نکلکر میں کونسل کے سیکرٹریوں کے کمرہ میں گیا۔ اس کونسل کے دس سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ اس سے مجھ کو خوشی ہوئی کہ یہ لوگ بھی دس کے عدد کو کامل سمجھتے تھے۔ جو الٰہیات میں کامل سمجھا گیا ہے۔ اس ہال میں

رحم کا مرقع ہے

تاکہ وہ سیکرٹری کام کرتے وقت اس اعلےٰ اخلاقی صفت کو نہ بھول جاویں۔ اور جذبات رحم سے کام کرتے ہوئے امن کو قائم رکھیں۔

آج مختلف عہدہ داروں کے سیکرٹریوں کے کمرہ میں جاؤ۔ تو تمہیں اس قسم کا کوئی مرقع نظر نہیں آئیگا۔ جو تمہیں انصاف عدالت یا رحم ومحبت کی تحریک کرتا ہو۔

سب سے بڑا ہال ان مقامات سے گذر کر ایک اور بڑا ہال ۵۰ گز لمبا ۲۴ گز چوڑا اور ۱۷ گز اونچا ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپ میں آج اتنا بڑا ہال نہیں ہے میں نے اس عظیم الشان عمارت کو دیکھا۔ اور غور کیا کہ کل تک جن کے دروازوں پر بڑے بڑے آدمی بھی آتے ہوئے ڈرتے اور جھجکتے تھے آج ہر شخص ان ہالوں اور کمروں میں بطور تفریح پھرتا ہے۔ دنیا کی عظمتیں اور حکومتیں انسان کے لئے دائمی سکھ اور آرام کا موجب نہیں۔ یہ جنس خدا ہی میں ملتی ہے۔ اس طرح پران کمروں میں پھرتے ہوئے اور در و دیوار پر غور کرتے ہوئے میں نیچے اترا مگر اترنے سے پہلے ایک بہت بڑی تصویر میں نے

ایک دیوار پر دیکھی جس کی بابت کہتے ہیں کہ

دُنیا میں سب سے بڑی تصویر ہے

اس تصویر میں جلالی فردوس کہا گیا ہے۔ میرے فکر میں یہی آیا کہ یہ بہت ہی موزون ہے اور مناسب موقعہ تصویر ہے۔ دربار اور اس محل کی عظمت و شان کو دیکھتے ہوئے انسان کے دل میں جو چیز سب سے زیادہ جاذب ہونی چاہئیے۔ وہ

وہ ابدی بہشتی زندگی ہے

یہ تصویر ۳۱ گز لمبی اور ۱۰ گز چوڑی ہے۔ اسے دیکھ کر فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی عظمت اور آخری زندگی جو ابدی اور غیر فانی ہے اسکی شان نمایاں ہوتی ہے۔ اور قلب پر اثر پڑتا ہے۔

غرض میں نے ان تمام ہالوں اور کمروں کو دیکھا۔ اور پھر میں نیچے اتر آیا۔ اس محل کو پورے طور پر دیکھنے اور ایک ایک مرقع اور تمثیل کی تاریخ اس کے مفہوم اور مضمون کو پڑھنے کیلئے بہت وقت لگتا ہے۔ اور یہ جنس میرے پاس نہیں۔

اس قسم کی عظیم الشان عمارت اور اس کے مکینوں کی عظمت کوئی حقیقی چیز نہیں۔ العظمۃ للہ حکومت اور عظمت اسی کی ہے جسکو چاہتا ہے۔ دیدیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ اس محل میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں اسی میں ایک عجائب خانہ بھی ہے۔ مگر میں نے اسے چھوڑ دیا اور میں نے پسند کیا۔ کہ اس عہد کے قید خانہ کو دیکھوں۔

اس زمانہ کا جیلخانہ مجرموں کیلئے جو جیل خانہ اسی محل میں بنایا گیا ہے۔ وہ آج بھی دلپر ہیبت اور دہشت کے اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ محل حکومت تمام انتظامات کی جگہ تھی۔ اسی میں عدالت تھی۔ اور یہاں ہی حوالات اور آخری سزا بھگتنے کے لئے جیل۔ جن کوٹھریوں میں مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ وہ نہایت ہی تنگ و تار ہیں۔ اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ کوٹھریاں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ تو بالکل زمینی منزل کے ساتھ ہے۔ اور دوسرا اوپر ہے۔ بہت ہی تنگ و تار سیڑھیوں میں سے اتر کر جانا پڑتا ہے۔ مجھے تو خود خطرہ ہوتا تھا۔ کہ شاید میں پھر واپس نہ آسکوں۔ اور اگر کوئی شخص تنہا وہاں اترنے کی کوشش کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جائے اور نکل ہی نہ سکے۔ جن مجرموں کو یہاں داخل کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے ان میں سے نکل آنا قریباً ناممکن تھا۔ یہ کوٹھریاں مختلف

ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ اور انہیں بڑے بڑے خطرناک مجرم کہے جاتے تھے۔ انکی دیواروں پر بعض عجیب و غریب تحریریں ہیں۔ جو ان مجرموں نے وقتاً فوقتاً لکھی ہیں۔ جنکو یہاں لکھا گیا تھا۔ ان تمام تحریروں کو پڑھنا یا ان کے مضمون سے آگاہ ہونا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ میں نے کوشش کی۔ کہ مجھے کوئی ایسی کتاب ملجاتی۔ جمیں ان تحریروں کو جمع کیا گیا ہو۔ میں ان تحریروں کو اسلئے دلچسپ سمجھتا ہوں کہ ان سے سائنس آف کرمنالوجی کا ایک لطیف باب سمجھ میں آسکتا ہے۔

یہ لوگ جب اس طرح پر خلوت میں کہے جاتے تھے۔ تو ان کا ضمیر کیا کہتا تھا۔ اگر یہ تمام تحریریں یک جا مل جائیں اور ان کا ترجمہ کیا جاسکے۔ تو حقیقت میں ایک دلچسپ مطالعہ آواز ضمیر کا ہوگا مجھے صرف ایک تحریر کا مضمون معلوم ہوسکا۔ اس کے لطف میں میں اپنے پڑھنے والوں کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔

ایخدا مجھے دوستوں سے بچا کہتے ہیں ایک واعظ جسکو اس کے کسی دوست نے گمراہ کیا تھا اور وہ ایک جرم میں ماخوذ ہوکر اس جیل میں کھا گیا اس نے اپنی کال کوٹھڑی کی دیوار پر لکھا۔

الٰہی اے خدا مجھے میرے دوستوں سے بچا

یہ تحریر نہایت عبرت انگیز اور انسانی دوستی کی بھول بھلیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ حقیقی خلّت ہمیشہ دنیا میں مفقود تو نہیں مگر کمیاب رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی غداری اور جرم نہیں کہ انسان کسی کے ساتھ دوستانہ تعلق پیدا کرے اسکو دھوکہ دے۔ اور مبتلائے مصیبت کرے۔ قرآن مجید نے

حقیقی اخوت اور خلت کو ایمان ہی سے وابستہ کیا ہے

ان کال کوٹھڑیوں کے ساتھ وہ کمرے ہیں۔ جہاں یہ ملزم یا مجرم قسم قسم کی عقوبتوں میں مبتلا کئے جاتے تھے۔ اور پھر انکو قتل کر دیا جاتا تھا۔ طرح طرح کی تکلیفوں سے انکی جان لیجاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا دروازہ ہے۔ جہاں سے انکی لاشوں کو نیچے لٹکا دیا جاتا تھا۔ اور گنڈولوں میں رکھ کر انہیں لے جاتے تھے۔

قید خانہ کا منظر نہایت بھیانک اور دل دوز ہے۔ اس کے تصوّر اور نظارہ کے ساتھ ہی سینکڑوں اور ہزاروں زدمیوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں سامنے آجاتی ہیں۔ اور قسم قسم کے ظلم سہتے ہوئے اور تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں :-

سیاسی قیدیوں کی کوٹھڑیاں

یہ قید خانہ تو مختلف جرائم کے قیدیوں کیلئے تھا۔ جو انسان جان مال آبرو۔ وغیرہ پر موثر ہوتے تھے۔ سیاسی قیدیوں کیلئے بالکل ایک جُدا قید خانہ ہے۔ اور اس کے لئے یہاں سے راستہ جاتا ہے اسکو PIOMBI پیامبی یعنے سیسہ کا قید خانہ کہتے ہیں۔ اسلئے کہ اکی چھت سیسہ کی چادروں سے پاٹی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ چار کوٹھڑیاں تھیں مگر اب تو صرف ایک باقی ہے۔ ان حجروں میں سیاسی قیدیوں کو انتہائی اذیت دی جاتی تھی۔ جہاں بڑے بڑے سیاسی مجرم رہ چکے ہیں۔

جسرِ آہ و بکا

یہاں پاس ہی دائیں دروازے سے نکلتے ہیں تو ایک پل ہے۔ جس کو (Bridge of sighs) جسر آہ و بکا کہتے ہیں۔ اس کے دوسری طرف بھی ایک بڑا قید خانہ تھا۔ اور اس پل کے ذریعہ سے اسکو شاہی محل سے ملا دیا گیا تھا۔ یہ اس غرض کیلئے بنایا گیا تھا۔ کہ اس قید خانہ سے ملزموں کو عدالت میں پیش کرنے کیلئے لایا جاتا تھا۔ اور جب وہ لائے جاتے تھے۔ تو کوئی انکو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ملزم سمجھتے تھے کہ اب عدالت کے کٹہرے میں جا کر زندہ سلامت واپس آنا ناممکن ہے۔ اس لئے وہ آہیں بھرتے ہوئے جاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے

اسکا یہ نام ہو گیا

مینے اسکو دیکھا۔ اور آہ! بھر کر رہ گیا۔ ہزاروں انسان اس پُل پر سے گذرے ہوں گے۔ اور ان میں بہت سے بیگناہ محض افسران تفتیش یا اس عہد کی پولیس، و بعض عہدہ داروں کی سازشوں کا شکار ہوتے ہوں گے۔ اس وقت وہ زبان حال سے کہتے ہوں گے۔

اے زبردست زیردست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار

اور آج یہ در و دیوار اس حقیقت کو عیاں کرتے ہیں کہ نہ ظالم رہے نہ مظلوم میں نے کئی سو برس کی تاریخ کو دو تین گھنٹوں میں پڑھ لیا۔ اور میں نے دیکھا کہ ان میں صدیوں پیچھے جا کر پھر اس عہد میں موجود ہوں۔ ان عجائبات اور بوقلمونیوں کو دیکھ کر طبیعت پر مختلف قسم کے اثرات لیکر میں پھر اوپر آیا اور نیچے اتر کر کورٹ یارڈ میں بیٹھ گیا۔ اور بے اختیار منہہ سے نکلگیا۔

كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا فَنَقَّبُوا

فِی الْبِلَادِ ط ہَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ (سُورۃ ق)

دورج سلاطین کی عظمت جلال کو انکی یہ سنگی عمارت ظاہر کرتی ہے۔ مگر آج ان کا اپنا کہیں نام ونشاں بھی نہیں ملتا۔ یہ خدائی جلال وجبروت کا ثبوت ہے۔ بیشک اسنے سچ فرمایا ہے کہ ہم نے ان سے پہلے بہت زبردست اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا۔ وہ مقتدر ہستی اپنی عزت جلال میں یکتا اور فرید ہے میں متواتر دو تین گھنٹہ تک محل میں پھرتے ہوئے تھک گیا تھا۔ اور اسکے اثرات کا دل ودماغ پر ایک بوجھ اور خاص کیفیت تھی میں نے چاہا کہ واپس ہوٹل کو چلا جاؤں۔ اور کچھ دیر آرام کروں اسلئے میں یہاں سے اپنے ہوٹل کو جو قریب ہی تھا چلا آیا۔ اور پھر کچھ عرصہ آرام کرکے اور چاء وغیرہ پی کر میں یہاں کے پبلک گارڈن کو دیکھنے چلا گیا مسٹر خواب آلود نے رفاقت چھوڑ دی اور اسنے شام تک مجھ سے علحدگی چاہی۔

زبان رکھنے والے گونگے

میں نے گفتگو کرنے کیلئے آج ایک ڈکشنری خرید لی۔ جو انگریزی سے اطالین اور اطالین سے انگریزی زبان میں ہے مجھے اس کتاب نے بہت فائدہ دیا۔ اسکی مدد سے میں اظہار خیالات کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اطالین زبان بولنے لگا بلکہ میرے لئے یہ ایک قسم کا تماشا اور دل بہلاؤ تھا میں پہلے ایک فقرہ کو تجویز کرتا۔ اور جس سے گفتگو کرنا مقصود ہوتا اسکو ایک ایک لفظ نکال کر ڈکشنری میں دکھاتا۔ اور وہ اس سے میرا مفہوم سمجھ لیتا۔ اور اسکے جواب میں وہ اطالین ڈکشنری میں ایک ایک لفظ نکالتا۔ اور مجھے دکھاتا۔ اور میں اسکا جواب سمجھ لیتا۔ اس کا تجربہ میں نے یہاں کے باغ عامہ میں کیا۔ اور

میں اور میرے مخاطب نے اس طرح پر گفتگو کا لطف اٹھایا

پبلک گارڈن یا باغ عامہ

وینس میں باغات کی تحریک یا تجویز کا آغاز ۱۸۰۸ء سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کے باغ عامہ موجود نہ تھے۔ میں باغ عامہ میں جب داخل ہوا تو قدرتی طور پر میرے گرد ایک ہجوم ہوگیا مگر میں نے پروا نہ کی۔

باغ عامہ کا دروازہ نہایت شاندار بیضوی شکل کا ہے۔ جو لوہے کے سلاخ دار پھاٹکوں کے ذریعہ بند ہوتا ہے۔ داخل ہوتے ہی۔

اٹلی کے محب وطن گریبالڈی

کا ایک شاندار بت کھڑا ہے۔ اس کی شکل وصورت کو دیکھ کر اس پر ایک مسلمان کا گمان ہوتا ہے اسکی مقطع داڑھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ اور سر پر جو ٹوپی ہے وہ بھی ہندوستانی وضع کی سی ہے اور اس نے چادر کو اس طرح پر لیا ہے۔ جیسے ہمارے ملک میں لنگّل مارنا کہتے ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں تحریر ہے۔

لاہوری بت لارنس میں نے جب اس بت کو دیکھا۔ تو مجھے لاہور کا لارنس صاحب کا بت یاد آگیا۔ جس کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار ہتی اور ایک عرصہ تک اس کے کتبہ پر اور بت کے وہاں سے اٹھائے جانے پر ایجی ٹیشن ہوتا رہا۔ ہر شخص کا اپنا اپنا نقطۂ خیال ہوتا ہے۔ دنیا میں تلوار اور قلم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مجرد قلم کوئی چیز نہیں۔ اور صرف تلوار کی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا میں امن اتحاد اور مرفع الحالی کے لئے جیسے مدبروں کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی تلواریوں کی بھی ضرورت ہے۔

خیر مجھے اس وقت لارنس کا بت یاد آگیا تھا۔ اور میں نے اسی یاد کو یہاں تازہ کر لیا۔ میں نے گیری بالڈی کے بت کو دیکھا۔ اور اسکی حب وطن کی داد دیتا رہا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مسلم کو سچا محب وطن بنانے کی تعلیم دی ہے۔ اور حب وطن کو ایمان میں داخل کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا

حُبّ الوطن من الایمان

لیکن چونکہ مسلمان کا وطن کل دنیا ہے۔ اسلئے وہ محبت عالم ہے کسی خاص زمین اور ملک سے اسکو تعلق نہیں۔ مجھے ہمیشہ افسوس اور تعجب ہوتا ہے۔ جب میں ہندو اخبارات میں اس قسم کے مضامین پڑھتا ہوں۔ کہ

مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے

حالانکہ ایک سچا مسلم ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

گیری بالڈی گیری بالڈی کے بت کے قریب ایک بنچ پر میں بیٹھ گیا۔ اور میں اسکے بت کو دیکھکر غور کرنے لگا۔ کہ کس طرح پر ایک ماہی گیر کا بیٹا اس عالمگیر شہرت کا وارث ہوگیا۔ یہ شخص ۱۸۰۷ء

میں پیدا ہوا، اور ۱۸۸۲ء میں ۷۵ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ مگر اس کی ملکی اور قومی خیر خواہی اور حب الوطنی نے اسے ایک معمولی اور خالی ماہی گیر کے مقام سے اُٹھا کر

لاکھوں قلوب کا فاتح اور محبوب بنا دیا

اسکی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ کہ وہ اٹلی کی ینگ موومنٹ میں یکایک شریک ہوا اور مشہور محب وطن میزنی کے ہاتھ پر گویا اسنے بیعت کی۔ ملک کی آزادی کیلئے جو ایجی ٹیشن جاری تھے۔ اور اس کے لئے جو جد و جہد ہو رہی تھی۔ اسمیں نمایاں حصّہ لینے لگا۔ آخر اسکو یہاں سے جان بچا کر امریکہ کو بھاگنا پڑا۔

امریکہ میں وہ قریباً ۱۲ سال رہا۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۸ء تک۔ اور اپنی بہادری جرأت۔ اور ہمت مردانہ کے سبب سے اسنے بہت شہرت اور ناموری حاصل کی ۱۸۴۸ء میں جبکہ ہر جگہ حکومتوں کے خلاف دنیا میں جوش پھیلا ہوا تھا۔ گیری بالڈی اپنے وطن مالوف اٹلی کو واپس آیا۔ اور یہاں آکر ملکی آزادی کیلئے ایک برقی رو اس نے پیدا کی۔ اور اس مقصد کے لئے والنٹیرز کافی تعداد میں بھرتی کرلئے۔ مگر اسے معرکہ میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور ۱۸۴۹ء میں اسے پھر نیویارک بھاگنا پڑا۔ اور ۱۸۵۴ء میں پھر واپس آیا۔ اور ۱۸۵۹ء میں موقعہ پا کر اسنے ایکہزار والنٹیر پھر بھرتی کئے۔ اس فوج کا نام ہی اسنے

گریبالڈی کے ایک ہزار

رکھا۔ انکی قمیصیں سرخ تھیں آج اٹلی کی زبردست تحریک فیسٹی والے بلیک شرٹ (قمیص سیاہ) رکھتے ہیں۔ اور یہی ان کا عرف ہے۔ اور معرکہ سسلی میں جہاں بوربون خاندان حملہ آور ہوا تھا۔ اپنی قسمت آزمائی شروع کی۔ اور بیس ہزار باقاعدہ فوج کو مار کر نکال دیا۔ اور یہی اسکے اقبال و عروج کی ابتدا ہوگئی ۱۸۶۲ء میں اسنے روم کو پوپ کے قبضہ سے آزاد کرنے کے لئے قدم اُٹھایا۔ مگر اٹالین گورنمنٹ نے مخالفت کی۔ اور اسے ناکام ہونا پڑا۔ اور وہ عارضی طور پر اس تحریک آزادی سے الگ ہوگیا۔ مگر پھر اس نے چار سال بعد اپنی جد و جہد کو شروع کیا اور کامیابی نہ ہوئی۔ پھر اسنے تیسری مرتبہ اس علم کو ہاتھ میں لیا۔ اس شخص کی زندگی حیرت انگیز انقلاب کو اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ اگرچہ اپنی زندگی میں وہ اس منار پر نہ چڑھ سکا لیکن آج اس کا ملک آزاد اور وہ اپنی حب وطن کیلئے ممتاز ہے۔

میں نے اس بت کو حقیقت میں قابل عزت سمجھا۔ کہ اسمیں ایک سبق تھا اور وہ یہ کہ

ترقی کی راہیں کسی قوم اور پیشہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں

اور حقیقی عزت کسی پیشہ یا نسب پر موقوف نہیں ہے میں نے دیکھا کہ اطالین جب اس بُت کے پاس سے گذرتے تھے تو

وہ اظہار عزت تکریم کیلئے اپنی ٹوپی اُتار لیتے تھے

باغ کے متعلق کچھ اور

اس باغ میں اور بھی بہت سے بت محبان وطن اور قوم کے بُت نصب ہیں ایک شخص وسو مدینا کا مجسمہ میں نے دیکھا۔ اُس پر جو کتبہ تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ۱۸۴۸ء کی آسٹریائی جنگ میں اسنے اہل وینس کی آزادی اور حمایت کیلئے بہترین خدمات کی تھیں۔ باغ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بہت ہی خوبصورت ہے۔ جس کی چوٹی پر سے وینس کا عام منظر بہت ہی خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ایک دلکشا قہوہ خانہ بھی ہے۔ اسی طرح باغ کے ایک پہلو میں ایک گرجا ہے۔ پہاڑی کے متصل ہی ایک نمایش گاہ بھی ہے۔ جہاں بعض بت اور ہاتھ سے بنی ہوئی بہت سی تصاویر ہیں۔ جو مشہور آرٹسٹوں کے کام اور فن کی نفاست اور عمدگی کو ظاہر کرتی ہیں قیمت کے لحاظ سے بھی میں سمجھتا ہوں وہ بہت قیمتی ہوں گی۔ اگرچہ میرے جیسے نااہل فن کی نظر میں وہ بتوں اور کاغذوں کے ڈھیر ہیں لیکن ماہر فن قدر دانوں کی نظر میں وہ سونے اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے۔

مرقع مسرت

اسی جگہ میں نے ایک تصویر مسرت کو دیکھا۔ ہر شخص اسے دیکھ کر سرسری نظر سے نہیں سمجھ سکتا۔ اس میں مختلف مرقع ہیں۔ کہیں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ ایک شخص راگ رنگ کا لطف اُٹھا رہا ہے۔ کوئی اولاد اور خاندان کی مسرتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اور کسی کا مایہ سرور صرف شراب کباب اور معشوق چہاردہ سالہ ہے۔ اور ایک طرف بچوں کی ایک جماعت ہے۔ جو کھیل کود اور باہم جنگ جدال میں مصروف ہے۔ غرض

کوئی مال مست کوئی حال مست

کا نظارہ اور ہر کس بخیال خویش خبطے دارد کا مرقع ہے لیکن یہ حقیقی خوشی نہیں۔ انتہائی خوشی کے یہ اقسام اور تخیلات ہیں۔ اسی طرح دوسری

وِل پاور کا کرشمہ

جگہ وِل پاور کا ایک کرشمہ دکھایا گیا ہے۔ جس میں ایک شخص کو دنیا کی دلچسپیاں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہیں لیکن وہ اپنی قلبی قوت کو اس قدر زبردست پاتا ہے کہ وہ کسی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

میں نے اسکو دیکھا اور انسان کی خلافت کے سامنے دنیا کی طاقتوں کو ہیچ پایا۔ قرآن مجید نے اسے خلیفۃ اللہ کہا۔ اور اس کا مقام کائنات میں یہی ہے۔ کہ وہ اسپر حکومت کرتا ہے پس میں نے غور کیا۔ کہ وہ انسان جو ایک وقت میں عناصر پر حکومت کرتا ہے بجلی اس کے قابو میں ہے۔ ہوا پر وہ تیرتا اور اڑتا ہے۔ پانیوں پر وہ حکومت کرتا ہے۔ اور اپنے بنائے ہوئے جہازوں کے ذریعہ اسکا سینہ چیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ وہ دنیوی خواہشات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ اور عیسائی جو کہتے ہیں کہ شریعت لعنت ہے۔ اور وہ گناہ سے بچ نہیں سکتا۔ یہ جھوٹ اور سراسر جھوٹ ہے۔ یہ تصویر عیسائیوں پر کم از کم وینس کے رہنے والوں پر ثبت ہے۔

غرض میں نے اس نظارہ کو نہایت شوق سے دیکھا۔ اور ازاں بعد اس باغ عامہ کے قہوہ خانہ میں بیٹھ کر چار کا لطف اڑایا میں ہی جانتا ہوں کہ اس قدر پھرنے اور تھکنے کے بعد باغ عامہ کی پہاڑی کے قہوہ خانہ میں مجھے کیسا سکون اور آرام ملا۔ میرے قہوہ خانہ میں جانے سے ایک جمگھٹا وہاں ہو گیا مجھے اگر زبان آتی۔ تو میں یقیناً قہوہ خانہ کے مالک سے کہتا کہ

میں تمہارے قہوہ خانہ کیلئے بہترین اشتہار ہوں

میں اب اس قدر تھک چکا تھا کہ کسی اور جگہ جانا میرے لئے آسان نہ تھا۔ اسلئے میں یہاں سے اٹھ کر باغ کے ایک گوشہ میں جا بیٹھا۔ مجھے خلوت نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت جاذب الانظار بنا ہوا تھا۔ عورتیں اور مرد۔ بچے اور جوان میرے گرد جمع ہوتے تھے۔ ایک نوجوان میرے پاس آ بیٹھے۔ اور میں نے اپنی ڈکشنری کی مدد سے اس سے دو تین باتیں کیں۔ جنکو یہاں بھی لکھ دیتا ہوں۔

عرفانی۔ تمہارا وینس بہت خوبصورت ہے۔

نوجوان۔ تم اسکو پسند کرتے ہو۔

عرفانی۔ خوبصورتی کسی چیز میں ہو دلکش ہوتی ہے۔

نوجوان۔ وینس میں تم کو کیا پسند ہے۔

عرفانی۔ مجھے وینس کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔

میرے اس کہنے پر سب حاضرین بہت خوش ہو گئے۔ اور میں سلام کر کے چلتا بنا۔

وینس کے ایک اخبار کے دفتر میں | میں نے GAZZETTINO اخبار کے دفتر میں جانے کا

انتظام کرلیا تھا صبح ہی اس کا نمایندہ جو انگریزی جانتا ہے میرے ہوٹل میں آیا۔ تاکہ وہ مجھے اپنے ساتھ لیجائے۔ یہ ایک نوجوان ہے اخبار نویسی کے میدان میں اُسکی امنگیں بہت بڑہی ہوئی ہیں۔ اگرچہ میں تیار ہی تھا لیکن اس کے آجانے پر میں نے مناسب سمجھا کہ چند منٹ اور ٹھہر جائیں۔ اور اسے چاء پیش کروں مگر اسنے شکریہ سے انکار کر دیا۔ اور خواہش کی کہ مجھ سے ہندوستانی صحافت کے متعلق کچھ گفتگو کرے میرے لئے یہ مرحلہ بہت ہی مشکل تھا۔ اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ ہندوستانی صحافت کی کیا حالت ہے۔ تاہم میرے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ میں اسے مایوس کروں۔ میرے اور اس کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

نمایندہ اخبار۔ ہندوستان کے اخبارات کا پبلک پر کیا اثر ہے؟

عرفانی۔ اخبارات کا اثر کم و بیش ہر ملک میں یکساں ہے۔ ہندوستان کی اخبار نویسی کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ اُسی حیثیت سے اسکا اثر ہے۔

نمایندہ اخبار۔ اخبارات کے چھاپنے کے لئے آجکل کی مشینیں استعمال کیجاتی ہیں۔

عرفانی۔ ہاں اسکا رواج ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی دیسی مشینیں بھی ہیں۔ جو ہاتھ سے چلائی جاتی ہیں (میری مراد دیسی پریس سے تھی)

نمایندہ اخبار۔ اخبارات کی اشاعت کا کیا حال ہے؟

عرفانی۔ یہ سوال میرے لئے بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ مگر میں نے اس کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا۔ اور کہا کہ ہر ملک کے اخبارات کی اشاعت حالات کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی ہے۔ مثلاً اگر اٹلی کے اخبارات کا لنڈن سے مقابلہ کریں تو شاید اس کے بیان کرنے میں بھی تامل ہو یا وہ بہت کم معلوم ہو۔ اسی طرح ہندوستان کا اٹلی یا دوسرے یورپین ممالک سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہندوستان کے لحاظ سے اخبارات یوماً فیوماً ترقی کر رہے ہیں۔ اور اشاعت بڑھ رہی ہے۔

نمایندہ اخبار۔ ہندوستان کے اخبار کس قسم کی خبریں زیادہ تر چھاپتے ہیں۔

عرفانی۔ یہ ہر اخبار کے موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ عموماً ہر ایک قسم کی خبریں وہ چھاپتے ہیں جیسے ہر ملک کا دستور ہے۔

نمایندہ اخبار۔ ہر اخبار رپورٹروں کا کافی سٹاف رکھتا ہے۔

عرفانی۔ ہاں اپنی ضرورت کے موافق ہر اخبار رکھ لیتا ہے۔ ہندوستان میں نامہ نگار بہت مل جاتے ہیں۔

نمایندہ اخبار۔ کیا ان نامہ نگاروں کو معقول معاوضہ ملتا ہے!

عرفانی۔ ہندوستانی نامہ نگار جو بطور پیشہ یہ کام نہیں کرتے اپنے مضامین کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔

نمایندہ اخبار۔ یہ بہت عمدہ بات ہے۔ شاید وہ دولت مند لوگ ہوتے ہوں گے۔

عرفانی۔ امیری یا غریبی کا سوال نہیں ہے۔ یہ صرف ملک کے عام رواج کی وجہ ہے۔

نمایندہ اخبار۔ اخبارات کی قیمت زیادہ ہوتی ہے یا کم۔

عرفانی قیمت کا سوال بھی حالات کیساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور کمی بیشی کا سوال ملک کے اپنے حالات پر موقوف ہے۔ بہت ممکن ہے ہندوستانی اخبار کی قیمت یہاں کے اخبارات کی قیمت کے لحاظ سے بہت ہی کم ہو مگر وہ ہندوستان میں زیادہ سمجھی جاوے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اس مضمون کو اب بدل دوں۔ اس لئے میں نے اس کو کہا کہ میں تیار ہوں اگر آپ پسند کریں تو چلیں۔ چنانچہ ہم دونوں وہاں سے اس اخبار کے دفتر میں پہنچے۔ روانگی سے پہلے اس نے ہوٹل سے ٹیلیفون کیا۔ اخبار کے دفتر پر سب ایڈیٹر صاحب نے مجھے ریسیو کیا۔ اور ہم سیدھے ایڈیٹر کے دفتر میں پہنچے۔ جس کے ساتھ سب ایڈیٹروں کی ایک بڑی جماعت کام کر رہی تھی۔

اس اخبار کا مالک ۸۰ سالہ بڈھا مالک ہے مگر اس کے قویٰ اس عمر میں بھی اچھے ہیں۔ یہ اخبار صبح کا اخبار ہے اور ۴۵ سال ہوئے جبکہ جاری ہوا تھا۔ شروع ہی سے یہ روزانہ اخبار ہے۔ روزانہ اشاعت آٹھ لاکھ ہے۔ اور آٹھ مختلف اڈیشن نکلتے ہیں۔

ایک اور اخبار بھی نکلتا ہے۔ جسکا نام گزٹ دی وینشیا ہے (وینس گزٹ) اخبار کے چھاپنے کے لئے تمام مشینیں اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔ خبر رسانی کیلئے تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعہ آنے والے پیغامات کے علاوہ لاسلکی کے ذریعہ بھی خبریں آتی ہیں۔ اور دفتر کی سب سے اوپر کی منزل میں لاسلکی کا دفتر ہے۔ چھاپنے کا کارخانہ بھی میں نے دیکھا۔ جہاں دیو ہیکل مشینیں اخبار چھاپ رہی تھیں۔ میں جس کمرہ میں جاتا تھا وہاں کے کارکن اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ صرف ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھ لیتے تھے۔ اور بعض یہ بھی نہیں کرتے

تھے۔ ایڈیٹوریل سٹاف دو گنا ہے۔ ایک وہ جو رات کو کام کرتا ہے۔ اور ایک وہ جو دن کو کام کرتا ہے۔ اور کل کو شائع ہونیوالے اخبار کے لئے تمام میٹیریل جمع کرتا رہتا ہے۔ شام کو رات کا عملہ آکر اسے اپنے رنگ میں ترتیب دیتا ہے۔ اور رات کے ۱۲ بجے تک برابر ترتیب کا کام ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک بجے کے قریب پریس اپنا کام شروع کرتا ہے۔ اور اس طرح پر مختلف ایڈیشن اس کے نکلتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی اخبار نویسی کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ میں ایک سرسری معائنہ کر چکنے کے بعد پھر ایڈیٹر صاحب کے دفتر میں آیا۔ اور اسنے مجھ سے حسب ذیل گفتگو کی۔

ایڈیٹر صاحب۔ آپ کا کیا یہ پہلا سفر ہے!

عرفانی۔ میں دوسری مرتبہ آیا ہوں۔ گذشتہ سال بھی آیا تھا۔ اور واپسی پر آپ کے شہر میں بھی ایک رات قیام کیا تھا۔

ایڈیٹر۔ آپ کے سفر کی غرض کیا ہے؟

عرفانی۔ جو ایک اخبار نویس کی ہونی چاہئے۔ (مینے ہنسکر جواب دیا)

ایڈیٹر۔ ایک اخبار نویس کے مختلف اغراض ہوسکتے ہیں۔ کیا آپ سیاسی اغراض رکھتے ہیں۔

عرفانی۔ میں تو مذہبی آدمی ہوں اور میرا اخبار بھی مذہبی پرچہ ہے۔ میری سیاست بھی میرا مذہب ہے۔ یہی میرے سفر کی غرض آپ سمجھ سکتے ہیں۔

ایڈیٹر۔ یورپ میں کیا آپ مذہب کو تلاش کرنے آئے ہیں۔ (مجھے اس سوال کیلئے معاف فرمائیں)

عرفانی۔ آپ کی کیا مراد ہے۔ یورپ کیا مذہب کی منڈی ہے۔

ایڈیٹر۔ ہر ملک اجنبی کیلئے مذہبی نکتۂ خیال سے مذہب کی منڈی ہوسکتا ہے۔

عرفانی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر یہ کہنے کی جرأت کروں۔ کہ یورپ کی منڈی مذہب کے لحاظ سے سرد ہو چکی ہے۔

میرے اس کہنے پر ایڈیٹر صاحب اور اسکے رفقا بے اختیار ہنس پڑے مگر ایڈیٹر صاحب نے جھٹ کہا۔ کہ ایسے بازار میں مذہب کی نئی جنس کیلئے بھی جگہ نہیں ہوسکتی۔

عرفانی۔ میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے مذہب کے لئے ہر مارکیٹ میں گنجایش اور ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اور وہ ہندوستان کی ملکی حالت کے متعلق سوالات کرتا رہا جیسے گاندھی موومنٹ۔ ہندو مسلم اتحاد وغیرہ کے سائل تھے۔ اور میں ان کا قریباً وہی جواب دیتا رہا۔ جو پہلے ایک جرنلسٹ کے انٹرویو میں دے چکا ہوں مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی۔ کہ عام طور پر لوگ ٹیگور کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اور انکی ادبی خدمات کے لحاظ سے ہندوستانی عظمت کے قائل ہیں میں نے تمام سٹاف کا شکریہ ادا کیا۔ اور اجازت چاہی۔ اسلئے کہ میں آج شیشہ سازی کے بعض کارخانوں کو دیکھنے کے لئے پروگرام تجویز کر چکا تھا۔

کتوں کا عجیب انتظام

وینس کے بازاروں اور پبلک مقامات پر پھرتے ہوئے ایک چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور وہ کتوں کا عجیب انتظام تھا۔ یورپ میں سگ پرستی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ ہر شخص خصوصاً عورتیں کتّے ضرور رکھتی ہیں۔ اور اب تو کتوں کی دوڑیں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ اور کتے دوڑ کی مقبولیّت اس قدر بڑھ رہی ہے کہ بہت ممکن ہے۔ یہ گھوڑ دوڑ پر بھی سبقت لے جائے۔

القصّہ کتوں کے پالنے اور رکھنے کا شوق یورپ میں عالمگیر ہے۔ مگر وینس میں یہ انتظام ہے کہ کوئی کتّا باہر نہیں نکل سکتا۔ جب تک مالک اس کے منہ پر ایک چھکا جو چمڑے کا مضبوط اور خوبصورت بنا ہوا ہوتا ہے۔ نہ باندھ دے۔ اس سے کتے کا منہ نہیں کھل سکتا۔ سانس وغیرہ کی لیے وقت نہیں ہوتی۔ اس چھکّے کا سارا زور اس کے جبڑوں پر ہوتا ہے۔ اس انتظام سے کسی کتے کے کاٹنے کا خطرہ قطعاً نہیں رہتا۔ اور عام شاہراہوں پر سگ گزیدگی کی کوئی واردات نہیں ہوسکتی یہ انتظام میں نے صرف یہاں ہی دیکھا کسی دوسری جگہ مجھے نظر نہیں آیا ممکن ہے ہو مگر میرے علم سے باہر ہے۔ اگر کوئی شخص کھلے منہ کا کتا باہر لے آئے تو وہ قانوناً مستوجب سزا ہوتا ہے میری رائے میں ہر جگہ اس قسم کا انتظام خانگی کتوں کیلئے ہونا ضروری ہے۔ اس سے یہی نہیں کہ سگ گزیدگی کی وارداتوں کا خطرہ نہیں رہتا۔ ویسے بھی کتّے خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک فائدہ اس سے یہ بھی ہے کہ وہ کسی دوکان پر منہ نہیں مار سکتے۔ بلکہ وہ عادی ہو جاتے ہیں کہ باہر نکلیں تو سوائے چلے جانے کے اور کسی طرف توجہ ہی نہ کریں۔ یہ چھکّے نہایت خوبصورت اور مختلف رنگوں اور طرزوں کے بنائے جاتے ہیں۔

شیشہ کا کارخانہ

میں نے ایک موٹر لانچ کرایہ پر لیا۔ اور ہم چند آدمی اسمیں سوار ہو کر عام سیر کیلئے نکلے۔ اور یہ بھی خواہش تھی کہ شیشہ سازی کے کارخانوں کا بھی ایک نظارہ کریں۔ موٹر لانچ کے ذریعہ سیر کا منظر قدرتی طور پر دلفریب تھا۔ اسلئے کہ مختلف چھوٹے چھوٹے جزائر کے دیہات وہاں کی مختلف قسم کی عمارتیں اور باغات کے سلسلے بہت خوش کن تھے۔ اس قسم کے باغات اور عمارتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ سمندر میں جو نئی زمین بنائی جا رہی تھی۔ یا نکل رہی تھی۔ اسکے مناظر بھی دلکش تھے۔ ہم مرانو ایک مقام پر گئے۔ جہاں علی العموم شیشے کے کارخانے ہیں۔ آج ہم نے ایک گائڈ بھی لے لیا تھا۔ وہ شیشہ کے اس کارخانہ میں لیگیا شیشہ کا کام ہاتھ سے تیار کیا جاتا تھا۔ بھٹی میں شیشہ گلا کر اور پھونک لگا کر ہر قسم کی چیزیں تیار کیجاتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ رنگ بھی دیا جاتا تھا۔ بظاہر یہ کام چنداں مشکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا۔ کہ عام طور پر بیرونی ممالک سے لوگ آکر یہاں نہیں سیکھتے۔

اس جگہ سب کے سب شیشہ ہی کے کارخانہ ہیں۔ اور ہر قسم کی اشیا ان میں تیار ہوتی ہیں۔ سادی بھی اور نقش و نگار والی بھی۔ ایک آن کی آن میں تیار ہو جاتی ہے۔ میں اور میرے ساتھی دیر تک اس کارخانہ کو دیکھتے رہے۔

ایک سبق آموز نظارہ

جبکہ میں ان شیشہ کی مختلف قسم کی اشیار کو بنتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے خیال آیا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا المومن مراۃ المؤمن یعنے مومن مومن کیلئے شیشہ ہوتا ہے۔ جس طرح پر انسان شیشہ میں اپنے نقائص اور خوبیوں کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ مومن کی زندگی میں اپنے نقائص و کمزوریوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ شیشہ گری کی صنعت ایمانی رنگ میں کیونکر پیدا ہو۔ میں نے دیکھا کہ آگ کی بھٹیاں ہیں جنمیں بڑی بڑی لمبی سلاخوں کے ذریعہ مواد کو پگھلا لیا جاتا ہے۔ پس مومن بھی جب تک ایک بھٹی میں سے گذر نہیں لیتا۔ اسمیں وہ لطافت شیشہ گری پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسی خیال میں تھا۔ کہ میرے دل میں قرآن مجید کی یہ آیت گذری۔

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون

یعنے کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے۔ کہ وہ صرف اتنا ہی کہنے پر چھوڑ دئے جاویں کہ ہم ایمان لائے

اور وہ بھٹی میں نہ ڈالے جاویں۔ قرب الٰہی کے منازل اور سلوک کے مراتب محض مومن کہلانے سے طے نہیں ہو جاتے۔ اور نہ ان اعلےٰ مدارج کو ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں مومن آئینہ ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے مختلف قسم کے ابتلاؤں اور امتحانوں سے اسے گذرنا لازمی ہوتا ہے۔ یہاں فتنہ کا لفظ ہے جسکے لغوی معنے زر و ربوتہ نہادن ہے۔ جیسے سونے کو کندن بنانے کے لئے گوٹھالی میں جانا پڑتا ہے اسی طرح مومن کامل کیلئے ایک آگ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس جگہ تفصیل بیان کی جا سکتی۔ اس قدر اشارہ ہی کافی ہے۔

میں نے اس شیشہ کو پگھلتے دیکھا۔ اور پھر اسکی آخری اور مکمل صورت کو دیکھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ مومن کو مراۃ المومن بننے کے لئے اسی طرح آگ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اسکی میل کچیل اور ہر قسم کے گندوں اور کمزوریوں کو دور کر کے پاک صاف کر دے۔ میں اس مضمون میں دور تک نکلگیا۔ کبھی فلسفہ نماز میں صلوٰۃ کا لفظ میرے سامنے آتا تھا۔ کہ صلے۔ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو آگ میں ڈال کر سیدھی کی جاتی ہے۔ کبھی خشوع خضوع کا مضمون سوچتا تھا۔ آخر میں اس نتیجہ پر آیا کہ میرے لئے یہ ایک درس عبرت ہے۔

موزیک پھر میں نے موزیک کا کام بنتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس میں پہلے شیشہ کو مختلف رنگوں میں ڈھالتے ہیں۔ اور پھر اسکے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ لیتے ہیں۔ اور پھر انکو ایک فریم میں جسمیں مختلف قسم کے ایسے مصالحہ جات پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انکو جوڑنے میں مدد دیں۔ اور کاریگر ایسے انداز سے انکو جوڑتے ہیں۔ کہ نہایت خوبصورت تصویر بن جاتی ہے۔ ہر قسم کی تصویریں اسطریق سے بنتی ہیں۔ وہ کانات ہیں جو شیشہ کے مختلف قسم کے کام کے نمونوں کی فروخت کی ہیں دیکھ کر اتنی حیرت نہیں ہوتی۔ جس قدر انکو بنتے ہوئے دیکھنا ہے۔

شیشے کے کاموں کی یہاں ہی حد نہیں ہو جاتی۔ بلکہ شیشے کے سوت کو اگر دیکھیں تو اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ کہ کسطرح پر ریشم کیطرح باریک سوت شیشے کا بنایا جاتا ہے۔ اور پھر اس سے ٹوکریاں کھلونے اور بہت سی کارآمد چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ غرض یہ نہایت قیمتی اور مفید صنعت ہے۔ اگرچہ میں یہ کہونگا کہ یہ صنعت ملک کی ضرورت کیلئے نہیں۔ بلکہ ایک قسم کے تعیش کا سامان ہے۔ تاہم یہ ایسی صنعت ضرور ہے کہ ہندوستانی اگر اسے سیکھ لیں اور اپنے ملک میں جاری کریں تو کم از کم بہت فائدہ ہو سکتا ہے

کپڑے عورتیں دہوتی ہیں

میں نے یہاں شہروں کے مختلف حصّوں میں دیکھا کہ عام طور پر کپڑے عورتیں دہوتی ہیں۔ وہ اسی طرح پتھر یا لکڑی کے پٹڑے پر دہو رہی تہیں جیسے ہندوستان میں دہوبی دہوتا ہے۔ یہ خصوصیت چین کی ہی نہیں بلکہ تمام یورپ میں کپڑے دہونے کے فرائض عورت سے مخصوص ہیں۔ اگرچہ دوسرے شہروں میں میں نے ہندستانی طرز پر پٹڑے پر ماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بلکہ وہاں مختلف قسم کی مشینیں طیار ہو چکی ہیں۔ جو ہر ایک گھر میں بھی لگجاتی ہیں۔ بہر حال یہ عورتوں ہی کے فرائض میں ہے۔ کہ وہ کپڑوں کو دہوئیں۔ انکو دہونا استری کرنا۔ یہ سب ایسی عمدگی سے کرتی ہیں۔ کہ ہمارے دہوبی کیا کر سکیں گے؟

میرے خیال میں ہندوستان کی عورتوں میں یہ رواج عام ہونا چاہئے۔ اس سے انکی ایک قسم کی ورزش اور کسرت بھی ہو جاتی ہے۔ اور خانہ داری کے فرائض میں ایسی ضروری چیز کو داخل کر دینے سے اس کے اپنے ہی ذریعہ آمدنی میں شغل و شغل ترقی ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ اسے سرسری نظر سے پڑہا جاوے۔ اگرچہ اب بھی چھوٹے چھوٹے بچّوں کے کپڑے عورتیں گھروں میں دہو لیتی ہیں۔ اور اپنے دوپٹے اور کرتوں کو بھی دہو کر رنگ لیتی ہیں۔ تاہم بہت بڑی رقم سال میں اس کام کے لئے ہر گھر سے نکل جاتی ہے۔ پنجاب کے بعض اضلاع راولپنڈی۔ جہلم وغیرہ کے دیہات میں میں نے دیکھا ہے کہ عورتوں کے فرائض میں یہ امر داخل ہے۔ اور اس کا اثر انکی صحت اور مالی حالت پر لازمی ہے۔ بڑے گھروں میں اور امرا کے ہاں اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔ کہ عورت کوئی کام کرے۔ خصوصًا اس قسم کے کام۔ امارت کا دوسرا نام انکی عملی زبان میں نکما اور بیکار رہنا۔ خدا تعالیٰ رحم کرے۔

لیس کے ایک کارخانہ میں

یہاں سے نکل کر ہم ایک گاؤں میں گئے۔ اگرچہ یہ گاؤں تو ضرور ہے۔ مگر ہمارے ملک کی عام دیہاتیت اس میں نہیں ہے۔ سڑکیں مصفّا اور پختہ اور مکانات بھی عام طور پر پختہ۔ مگر باشندوں کے چہروں سے وہ عورت ہوں یا مرد۔ بچّے ہوں یا بوڑھے تموّل اور فارغ البالی کی شان نمایاں نہیں۔ بلکہ مفلسی اور مفلوک الحالی سی ظاہر ہوتی تھی۔ باایں لباس خواہ پھٹا پرانا ہو۔ مگر صاف ضرور تھا۔ بچوں کے غول اسی طرح پھرتے تھے جیسے ہمارے ہاں دستور ہے۔ بعض کوچے تنگ تھے۔ اور مکانات بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک بڑا بازار نہایت اچھی سڑک پر تھا۔ اور اسمیں ضروریات کی تمام چیزیں تھیں۔ یہاں تک کہ تھیٹر اور سینما بھی

اور وہ بھٹی میں نہ ڈالے جاویں۔ قرب الٰہی کے منازل اور سلوک کے مراتب محض مومن کہلانے سے طے نہیں ہو جاتے۔ اور نہ ان اعلےٰ مدارج کو ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں مومن آئینہ ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے مختلف قسم کے ابتلاؤں اور امتحانوں سے اسے گذرنا لازمی ہوتا ہے۔ یہاں فتنہ کا لفظ ہے جسکے لغوی معنے زر و رپو تہ نہادن ہے۔ جیسے سونے کو کندن بنانے کے لئے کوٹھالی میں جانا پڑتا ہے اسی طرح مومن کامل کیلئے ایک آگ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس جگہ تفصیل نہیں کی جاسکتی۔ اس قدر اشارہ ہی کافی ہے۔

میں نے اس شیشہ کو پگھلتے دیکھا۔ اور پھر اسکی آخری اور مکمل صورت کو دیکھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ مومن کو مراۃ المومن بننے کے لئے اسی طرح آگ میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اسکی میل کچیل اور ہر قسم کے گندوں اور کمزوریوں کو دُور کر کے پاک صاف کر دے میں اس مضمون میں دور تک نکلگیا۔ کبھی فلسفہ نماز میں صلوٰۃ کا لفظ میرے سامنے آتا تھا۔ کہ صلے۔ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو آگ میں ڈال کر سیدھی کی جاتی ہے کبھی خشوع خضوع کا مضمون سوچتا تھا۔ آخر میں اس نتیجہ پر آیا کہ میرے لئے یہ ایک درس عبرت ہے۔

موزیک پھر میں نے موزیک کا کام بنتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس میں پہلے شیشہ کو مختلف رنگوں میں ڈھالتے ہیں۔ اور پھر اسکے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ لیتے ہیں۔ اور پھر انکو ایک فریم میں جس میں مختلف قسم کے لیسے مصالحہ جات پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انکو جوڑنے میں مدد دیں۔ اور کاریگر ایسے انداز سے انکو جوڑتے ہیں۔ کہ نہایت خوبصورت تصویر بن جاتی ہے۔ ہر قسم کی تصویریں اسطریق سے بنتی ہیں۔ دوکانات ہیں جو شیشہ کے مختلف قسم کے کام کے نمونوں کی فروخت کی ہیں دیکھ کر اتنی حیرت نہیں ہوتی۔ جس قدر انکو بنتے ہوئے دیکھنا ہے۔

شیشے سے کاموں کی یہاں ہی حد نہیں ہو جاتی۔ بلکہ شیشے کے سوت کو اگر دیکھیں تو اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ کہ کسطرح پر ریشم کیطرح باریک سوت شیشے کا بنایا جاتا ہے۔ اور پھر اس سے ٹوکریاں کھلونے اور بہت سی کارآمد چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ غرض یہ نہایت قیمتی اور مفید صنعت ہے۔ اگرچہ میں یہ کہونگا کہ یہ صنعت ملک کی ضرورت کیلئے نہیں۔ بلکہ ایک قسم کے تعیش کا سامان ہے۔ تاہم یہ ایسی صنعت ضرور ہے کہ ہندوستانی اگر اسے سیکھ لیں اور اپنے ملک میں جاری کریں تو کم از کم بہت فائدہ ہو سکتا ہے

کپڑے عورتیں دہوتی ہیں

میں نے یہاں وئنیس کے مختلف حصوں میں دیکھا کہ عام طور پر کپڑے عورتیں ہی دہوتی ہیں۔ وہ اسی طرح پتھر یا لکڑی کے پٹڑے پر دہو رہی تہیں جیسے ہندوستان میں دہوبی دہوتا ہے۔ یہ خصوصیت وئنیس کی ہی نہیں بلکہ تمام یورپ میں کپڑے دہونے کے فرائض عورت سے مخصوص ہیں۔ اگرچہ دوسرے شہروں میں میں نے ہندستانی طرز پر پٹڑے پر مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بلکہ وہاں مختلف قسم کی مشینیں طیار ہو چکی ہیں۔ جو ہر ایک گھر میں بھی لگجاتی ہیں۔ بہرحال یہ عورتوں ہی کے فرائض میں ہے۔ کہ وہ کپڑوں کو دہوئیں۔ انکو دہونا استری کرنا۔ یہ سب ایسی عمدگی سے کرتی ہیں۔ کہ ہمارے دہوبی کیا کرسکیں گے؟

میرے خیال میں ہندوستان کی عورتوں میں یہ رواج عام ہونا چاہیئے۔ اس سے انکی ایک قسم کی ورزش اور کسرت بہی ہو جاتی ہے۔ اور خانہ داری کے فرائض میں ایسی ضروری چیز کو داخل کر دینے سے اس کے اپنے ہی ذریعہ آمدنی میں غل وغش ترقی ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ اسے سرسری نظر سے پڑہا جائے۔ اگرچہ اب بہی چھوٹے چھوٹے بچوں کے کپڑے عورتیں گھروں میں دہو لیتی ہیں۔ اور اپنے دوپٹے اور کرتوں کو بہی دہو کر رنگ لیتی ہیں۔ تاہم بہت بڑی رقم سال میں اس کام کے لئے ہر گھر سے نکل جاتی ہے۔ پنجاب کے بعض اضلاع راولپنڈی۔ جہلم وغیرہ کے دیہات میں میں نے دیکھا ہے کہ عورتوں کے فرائض میں یہ امر داخل ہے۔ اور اس کا اثر انکی صحت اور مالی حالت پر لازمی ہے۔ بڑے گھروں میں اور امرا کے ہاں اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔ کہ عورت کوئی کام کرے۔ خصوصاً اس قسم کے کام۔ امارت کا دوسرا نام انکی عملی زبان میں نکما اور بیکار رہنا۔ خدا تعالیٰ رحم کرے۔

لیس کے ایک کارخانہ میں

یہاں سے نکل کر ہم ایک گاؤں میں گئے۔ اگرچہ یہ گاؤں تو ضرور ہے۔ مگر ہمارے ملک کی عام دیہاتیت اس میں نہیں ہے۔ سڑکیں مصفا اور پختہ اور مکانات بہی عام طور پر پختہ۔ مگر باشندوں کے چہروں سے وہ عورت ہوں یا مرد۔ بچے ہوں یا بوڑھے تمول اور فارغ البالی کی شان نمایاں نہیں۔ بلکہ مفلسی اور مفلوک الحالی سی ظاہر ہوتی تہی۔ با ایں لباس خواہ پھٹا پرانا ہو۔ مگر صاف ضرور تہا۔ بچوں کے غول اسی طرح پھرتے تھے جیسے ہمارے ہاں دستور ہے۔ بعض کوچے تنگ تھے۔ اور مکانات بہی چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک بڑا بازار نہایت ہلکی سڑک پر تہا۔ اور اسمیں ضروریات کی تمام چیزیں تہیں۔ یہاں تک کہ تھیٹر اور سینما بھی

سکول بھی ہے۔ اور ایک سوزن کاری کا سکول خاص لڑکیوں کا ہے۔ اس گاؤں کی عام صنعت ہی لیس اور فیتے بنانا ہے۔ اور یہ سب کام ہاتھ سے بنایا جاتا ہے۔ میں نے کسی جگہ مشینوں پر کام ہوتے نہیں دیکھا۔

ایک غور طلب مسئلہ عہد حاضرہ کا

اگرچہ اس مقام کے ساتھ کوئی خصوصی تعلق اس امر کا نہیں۔ اور نہ میرے سیاحت نامہ کی غرض پولیٹیکل مباحثہ میں جانا ہے۔ مگر یہاں چونکہ ایک ذکر آگیا ہے۔ اسلئے میں سرسری نظر سے گذرنا ہی نہیں چاہتا۔ سرمایہ داری اور مزدوری کے سوال کیطرح بیکاری کا ایک سوال بھی عالمگیر ہے۔ اور یورپ میں تو اسپر بڑی بحث ہوتی ہے۔ بیکاری کے اسباب میں مشینوں کا وجود بھی ہے۔ کہ جوں جوں مشینوں کے ذریعہ کام ہونے لگا ہے۔ لوگ بیکار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ امر واقعہ بھی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں لیس اور سوزن کاری کے اس کارخانہ میں یہ دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا کہ اس راز کو سمجھ لیا گیا ہے۔ غرض تمام گاؤں اسی صنعت پر آباد ہے۔ مرد عموماً کشتی رانی۔ ماہی گیری یا اور اسی قسم کے کام کرتے ہیں۔ اور عورتیں تمام تر اس صنعت میں مصروف ہیں۔ اس سکول کی مہتمہ نے بڑی مہربانی سے مجھے کام کے نمونے دکھائے۔ ایک حصہ میں ۶۰ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی قسم کا نقص کسی عضو میں رکھتی تھیں۔ مثلاً لنگڑی تھیں۔ سوئی کے ساتھ ہی وہ اعلےٰ درجہ کی تصاویر رومالوں اور میز پوشوں پر نکالتی تھیں۔ اور نہایت خوبصورت فقرے اپنی زبان میں لکھتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ تمام گاؤں محنت کرتا ہے۔ اور کوئی بیکار مجھے نظر نہیں آیا۔ یہاں عورتوں کے لباس میں فرنچ فیشن کی تراش خراش اور ان کے بالوں میں عہد حاضرہ کی آراستگی اور بال تراشنے کے طریقوں کو میں نے مفقود پایا۔

بھیک مانگنے والے

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ باوجودیکہ گداگری یہاں ممنوع ہے لیکن پھر بھی بھیک مانگنے والے موجود ہیں۔ اس گاؤں میں تو خصوصیت سے میں نے دیکھا۔ کہ چھوٹے بچے اور بعض بوڑھی عورتیں کھلم کھلا بھیک مانگ رہی تھیں۔ اور لوگ دے بھی دیتے تھے خدا تعالیٰ نے مجھے جو توفیق دی میں نے بھی اس کے دینے میں مضائقہ نہ کیا۔ مگر میں سوچنے لگا کہ اسکی وجہ کیا ہے؟ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ چونکہ ایسی جگہ عام طور پر سیاح اور دوسرے لوگ آتے رہتے ہیں اسلئے بچوں اور بوڑھی عورتوں کو تجربہ کے طور پر مانگنے کی عادت ہوگئی ہے۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے صرف

ہاتھ پساری کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان بھیک مانگنے والوں میں ایک چیز میں نے دیکھی۔ کہ کوئی مرد نہ تھا عام طور پر چھوٹے بچے تھے۔ اور یا بعض بوڑھی عورتیں۔

مورانو اور بورانو یہ دو جزیرے ہیں۔ جنمیں سے اول الذکر میں شیشہ کے کارخانہ ہیں۔ اور دوسرے میں لیس کے۔

مورانو میں شیشہ سازی کا کام بارہویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ مارکو پولو نے اس کو اس جزیرہ سے نکال کر دنیا میں شہرت دی۔ اور سولہویں صدی تک اس صنعت کی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی لیکن جمہوریت کے زوال کے ساتھ اس میں بھی زوال آ گیا۔ لیکن ۱۸۶۶ء میں ایک کمپنی وینشا مورانو کے نام سے قائم ہوئی۔ اور اس نے اس مرتی ہوئی صنعت کو پھر زندہ کر دیا۔ اور اب اس کمپنی کے ذریعہ انتہائی ترقی ہوئی ہے۔ پہلے تو صرف منکے تیار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب شیشہ کا ہر قسم کا کام سادہ اور پھولدار نہایت اعلےٰ پیمانہ پر ہوتا ہے۔ میں نے جس کارخانہ کے دیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسی کمپنی کا کارخانہ تھا۔ اس قصبہ کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے۔ اور پانچہزار کی آبادی ہے۔

بورانو۔ ایک دوسرا جزیرہ ہے۔ جو لیس کے کام کیلئے مشہور ہے۔ اسکی آبادی آٹھ ہزار کی ہے اسمیں میں نے لیس اور سوزن کاری کے اس سکول کو دیکھا جس کا ذکر پہلے کیا ہے۔ جیسے مورانو کی صنعت شیشہ گری کو زوال جمہوریت کے ساتھ نقصان پہونچا تھا۔ یہاں کی لیس سازی کی صنعت بھی اس موقعہ پر تباہ ہو گئی تھی مگر اب یہ صنعت پھر ترقی کر رہی ہے۔ جس سکول کا میں نے معائنہ کیا تھا۔ اسمیں ایکہزار لڑکیاں اور عورتیں کام کرتی ہیں۔ اس جزیرہ کی آبادی آٹھ ہزار ہے۔ اور اسے بھی حکومت خود اختیاری کے حقوق حاصل ہیں۔

ایک یہ قومیں ہیں جو چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی حکومت خود اختیاری رکھتی ہیں۔ اور آپ اپنی حکومت کے ذریعہ اپنے قصبات کو ترقی دیتی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ اتنے بڑے ملک میں بھی اس حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھ رہے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجاست

یہاں سے ہم ایک اور بہت پرانے گرجہ کو دیکھنے گئے۔ اور اسمیں پرانی اشیا ملاحظہ کرکے چلے آئے۔ اس کے ساتھ ایک مختصر سا یتیم خانہ بھی تھا۔

تفرج گاہ لیڈو لیڈو بجائے خود ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ جو نواح وینس اور بحیرہ ایڈریاٹک کے بیچ

واقعہ ہے۔ اس نے سمندر کو یہاں سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور اس درمیانی حصّہ میں یہ ایک سدّ سمندری کے طور پر واقع ہے۔ جو سمندری افواج کے تھپیڑوں سے اس طرف کے جزائر کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک ریگ زار واقعہ ہے۔ اور اس ریگ زار نے لیڈو کی خوشنمائی اور دلچسپی کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اور اب یہ براعظم یورپ اور امریکہ کے سیاحوں کو کھینچنے کے لئے بے انتہا قوت رکھتا ہے۔ یہاں کے ہوٹلوں میں جگہ ہی مشکل ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ بعض امراض سے شفا پانے کے لئے اور آفتابی شعاعوں سے صحت افزا اجزا حاصل کرنے کیلئے یہاں آتے ہیں۔ اس مقام پر قدیم زمانہ میں

سمندری شادی

کا عجیب و غریب تہوار منایا جاتا تھا جیسے مصر میں عروس النیل کی ایک پرانی تقریب چلی آتی تھی اسی طرح سے یہاں اس تہوار پر مسرت و شادمانی کا سمندر موجیں مارتا تھا۔ مگر اب بیسویں صدی میں لیڈو کی شان ہی نرالی ہے۔ یہ جگہ جو ابتداً محض ایک بیگیاہ ٹکڑا زمین کا تھا۔ آج وہ گلزار ہے۔ شاندار ہوٹل اور فلک نما عمارات نہایت وسیع اور پررونق بازارات کے علاوہ کنارہ سمندر پر سمندری غسل کے اہتمام نے اس کی کشش و رونق کو دوبالا کر دیا ہے۔ لیڈو اور وینس کے درمیان جہاز رانی ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جہاز ہر پانچ منٹ کے بعد مسافروں کو لاتے اور لیجاتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں یہاں ٹرام دوڑتی ہے۔ اور اس کے علاوہ موٹریں۔ اور گھوڑا گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔ اور سواری کا لطف اٹھایا جاتا ہے۔ لیڈو کی کشش یہاں کا سمندری غسل ہے۔ میں بھی اس غسل کیلئے لیڈو گیا۔

دور دور تک اس ریت کے میدان میں سمندری کنارے کے ساتھ غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں لوگ جا کر سمندری اور آفتابی غسل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ بغیر کسی ضرورت کے خوشی سے اس جگہ تفریحی غسل کیلئے جاتے ہیں۔ مگر اکثر طبّی مشورے کے ماتحت بھی آتے ہیں۔ میں تو تفریحاً ہی غسل کیلئے گیا تھا تاکہ اس مقام کی دلچسپیوں کا نظارہ کر سکوں۔

غسل کیلئے جانے سے پہلے ایک بہت بڑے شیشے کی چھت کی ڈیوڑھی میں سے گذرنا ہوتا ہے اس میں داخلہ کیلئے ہی آپکو ٹکٹ لینا پڑے گا۔ جب اس ڈیوڑھی میں داخل ہوں گے۔ تو اس کے دونوں طرف ہر قسم کی دوکانیں ہیں اور انمیں زیادہ تر سامان اس مقام کے مناسب حال ملتا ہے۔ ہر قسم کے کھیلوں کا سامان اور دوسری ضروری چیزیں ملتی ہیں۔ نہانے کے لئے اڑھائی لیرا دیکر ٹکٹ ملتا ہے پھر آپ کو اس حصّہ میں جانا

ہو گا جہاں غسل خانوں کے متعلق جگہ ہے۔ ایک جگہ آپ اپنی ضروری چیزیں اور نقدی امانت رکھوائیں گے جو شخص اس کام پر مامور ہے وہ آپ کی نقدی اور قیمتی اشیاء کو لیکر ایک لفافہ میں بند کر کے الماری کے ایک خانہ میں رکھکر چابی آپ کو دیدیگا۔ اور ہدایت کرے گا کہ اس چابی کو سنبھال کر رکھنا۔ اس کے سامنے ہی آپ کو غسل کرنے کے لئے ایک جانگیہ دیدیگا۔ اور تولیہ وغیرہ۔ پھر آپ ایک کمرہ میں جاکر اپنے کپڑے اتار کر جانگیہ پہن کر غسل کیلئے تیار ہو جائیں۔ اس حجرہ کو بند کر کے قفل لگا دیں۔ اور چابی اپنے پاس رکھ لیں۔ اب دونوں چابیوں کو سنبھال کر رکھئے اور سمندر کے کنارے پر چلے جایئے اور اس میں جاکر غسل کریں۔

آفتابی اور سمندری غسل کے مناظر

آپ کو اسی ریت پر سینکڑوں مرد و عورت بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے اور دوڑتے کودتے پھاندتے ہوئے ملیں گے۔ جو اس آفتابی اور سمندری غسل کا لطف اٹھانے کیلئے جمع ہوئے ہیں بعض دھوپ سینکتے ہیں۔ یہ غسل آفتابی ہے کسی نے چھتری کا سایہ کیا ہوا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی سب کی یہی حالت ہے۔ ایک ہی لباس میں ملبوس ہیں۔ یہ جانگئے علے العموم سیاہ ہوتے ہیں۔ مگر انسانی جسم کے ابھار ان سے نظر آتے ہیں کسی قسم کا حیا و شرم نہیں ہے۔ سمندر میں نہانے کا تو اور بھی ابتر حال ہے۔ ایک ہندوستانی اس نظارہ کو

حیا سوز کہے گا

اور مشرقی تہذیب اس پر ماتم کرے گی۔ عورتیں اور مرد اکٹھے نہا رہے ہیں۔ اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کیساتھ سمندر میں کھیل کود میں مصروف ہیں۔ ہندوستان کو تو اس طرح پر اس لباس میں عورت کو نہاتے دیکھنا ہی مشکل ہے۔ چہ جائیکہ وہ ان کے ساتھ اس قسم کی قلابازیاں کھاتا پھرے میں اس نظارہ کو دیکھتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ ؎

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے ؏
نہ وہ جو مردوں میں ڈنڈ پیلے

یورپ کی تہذیب کا معیار دوسرا اور وہاں کے اخلاقیات کا اصول بالکل جدا ہے۔ تم ایک عورت کے سامنے ننگے پاؤں نہیں جاسکتے۔ بغیر کوٹ پہنے نہیں جاسکتے۔ لباس شب میں بغیر ڈریسنگ گون پہنے جانا اخلاقی جرم ہے مگر سمندر میں نہانے کیوقت تم دونوں لنگوٹ باندھ کر ایک دوسرے کو کھلا اور نہلا سکتے ہو۔ اور اب وہ ساری تہذیب جو ایک گھنٹہ پیشتر ستر پوشی میں تھی۔

عُریانی سے تبدیل ہو جاتی ہے

میں ذاتی طور پر پبلک میں عام طور پر بھی نہانے کا بچپن سے عادی نہیں ہوں۔ اور اب تو مجھے مردوں اور عورتوں کے جمگھٹ میں جبکہ وہ کلیلیں کر رہے تھے نہانا پڑا۔ میں دیکھتا تھا کہ کوئی محفوظ سی خلوت گاہ میسر آ جائے۔ وہ یہاں معدوم تھی۔ اور میری غریب الوطنی اور اجنبیت اور بھی حیا ذب تھی۔ میں یہاں آنے پر پچھتاتا تھا۔ لیکن آخر میں نے سوچا

ہر چہ آید بر سرِ فرزندِ آدم بگذرد

اب تو تامل اور تردد فضول ہے۔ آخر میں ایک جگہ جہاں ایک نوجوان نہا رہا تھا۔ چلا گیا۔ اور میری خوش قسمتی میں کیا شبہ ہے کہ وہ نوجوان وہی امریکن تھا۔ جو اگلے روز اپنے دادا کے ہمراہ میرا رفیق سیر تھا۔ مجھے اسکو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور میں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔ کہ کس طرح پر یہ مرد و عورت ملکر نہاتے ہیں۔ اسنے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ یہاں صحت اور تفریح کیلئے لوگ آتے ہیں اور انکو یکساں حق حاصل ہے۔ کہ مرد اور عورت ملکر نہائیں۔ غرض طوعاً و کرہاً میں نے اس غسل سے فراغت پائی۔ میرا امریکن رفیق ہر چند مجھے مشورہ دیتا رہا۔ کہ چلو دھوپ میں چلکر بیٹھیں گے۔ میں نے کہا کہ

میرے ملک میں دھوپ عام اور دماغ سوز ہوتی ہے

میں اسکا بہت شوقین نہیں ہوں۔ اس نے کہا کہ لنڈن جاکر اس دھوپ کو نہ پاؤ گے۔ اور کسی قیمت پر میسر نہ آئے گی۔ میں وہاں سے نکلکر پھر میٹھے پانی کے غسل خانہ میں آیا۔ جہاں اوپر سے فوارہ پڑتا تھا۔ میں نے تولیہ سے بدن صاف کیا۔ اپنے حجرہ میں آکر کپڑے بدلے اور اس امتحان سے نجات پائی۔ اور وہاں سے نکلکر اپنی امانت لی۔ اور پھر وہاں کے شاندار ریسٹارنٹ میں جہاں ہزاروں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بیٹھ کر چاء پی۔ رات کو میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ اور معدہ میں کچھ خرابی محسوس کرتا تھا۔ اس غسل کے بعد میں نے کسی قدر آرام محسوس کیا۔ اور چاء پی کر کچھ عرصہ تک وہاں بیٹھا رہا۔ اور سمندر اور یہاں آنے والے شوقینوں کی سیر کرتا رہا۔

فطرتِ انسانی کا ایک مشترک نقشہ

انسانی فطرت ہر جگہ یکساں ہے۔ اس کے ظہور کے طریق مختلف ہوں تو ہوں۔ لیکن عملی طور پر ہر جگہ ایک ہی بات ہے۔ میں جب یہاں کے پبلک گارڈن میں پھر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بچوں کی دنیا ہر جگہ یکساں ہے۔ بچوں کے ایک غول کو میں نے دیکھا جو باغ کے ایک

حصہ میں مٹی سے کھیل رہے تھے بچپن کی سادگی بچپن کا استغنار۔ اور معصومیت بہت ہی دلکش چیزیں ہیں لیکن جوں جوں انسان بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ اس کی طبیعت میں نرالی قسم کا ارتقا شروع ہو جاتا ہے۔ طبعی قوتیں یا تو اخلاق فاضلہ بجاتی ہیں یا انسان انکے ناجائز استعمال سے رذائل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بچوں کے اس نظارہ کو میں نے دیکھا۔ اور کہا کہ

تمام دُنیا کے بچے ایک ہی قسم کے ہیں

وہی لکڑی کے گھوڑے یا دوسرے بچوں کو گھوڑے بناکر گاڑی چلانا وغیرہ قسم کی کھیلیں کھیل رہے تھے۔

ہوٹل میں ذبح مرغ کا ایک نظارہ

میری طبیعت کچھ ناساز ہوگئی۔ مجھے پیچش کی شکایت ہوئی۔ اور وہ بڑھتی گئی میں نے اپنے سیر و سیاحت کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا۔ ایکدن طبیعت میں ضعف بھی تھا میں نے چاہا کہ چوزہ کی یخنی پیوں پیچش کیلئے وہ مفید تھی یا مضر میں نے اسکی پرواہ نہیں کی۔ اس کے لئے میں نے ہوٹل والوں کو کہا۔ کہ ایک مرغ کا چھوٹا بچہ منگوا دو۔ میں خود ذبح کروں گا۔ اس کی یخنی تیار کردو۔

مرغ لایا گیا اور مجھے اس کے ذبح کرنے کیلئے اطلاع دی گئی۔ جب میں ذبح کرنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باورچیخانہ میں اچھا خاصہ مجمع ہوٹل کے ملازموں اور مہمانوں کا ہے۔ مجھے تعجب سا ہوا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے بھی عجائبات سے سمجھا تھا۔ چونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ میں ان کا ذبح کیا ہوا نہیں کھاتا۔ اسلئے انہیں طبعاً مجھے ذبح کرتے دیکھنے کا شوق تھا۔ میں گیا اور چھری لیکر اُسے اسلامی طریق پر ذبح کیا۔ بعض نے اس طریق ذبح کی تعریف کی۔ اور بعض نے کہا کہ یہ ظلم ہے۔ میں نے کہا کہ گلا گھونٹنا ہی بدترین ظلم ہوگا۔

میری طبیعت چونکہ پیچش کیوجہ سے خراب ہو رہی تھی اسلئے میں نے جلد جانے کا عزم کر لیا۔ اگرچہ میں کچھ روز اور ٹھہرنا چاہتا تھا میرے دوست اور احباب جانتے ہیں کہ بیماری میں مجھے اضطراب بہت ہوتا ہے ایسی حالت میں کہ میں وطن سے دور تھا۔ اضطراب لازمی تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ یہاں کوئی واقف حال نہیں پڑا رہنا۔ پہلے خیال ہوا کہ محمود احمد کو مصر تار دوں۔ یا درد صاحب کو پھر میں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ خود ہی لنڈن چلے جانا چاہیئے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے طامس کک کے دفتر میں جاکر لنڈن کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ پانچ پونڈ پر خرید لیا۔

سرسری نظر مجھ کو اس عرصہ میں جس قدر دیکھ سکتا تھا۔ اچھی طرح دیکھا۔ پھر میں نے چاہا کہ سرسری نظر سے ہی بعض مقامات میں سے گذر جاؤں۔ اور اپنے نقطۂ خیال سے کچھ نہ کچھ چن لوں۔

باشندوں کے چہروں سے تمول کے آثار نمایاں نہیں۔ بلکہ بعض حالتوں میں فلاکت اور مفلسی کے آثار دیکھے گئے۔ ایک بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں مختلف جہازات آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایسے مقامات کا اخلاقی معیار اونچا نہیں ہوتا۔

باشندوں میں عام طور پر ملنساری پائی جاتی ہے۔ اور وہ طبعاً اجنبیوں سے محبت کرتے ہیں۔ انکی زبان میں نرمی اور طبیعت میں خوش مزاجی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

گرجے یہاں بہت ہیں۔ وینس اور اس کے ملحقہ جزائر میں کم و بیش ۷۰ گرجے ہیں۔ وینس کے صوبہ کی آبادی پانچ لاکھ اور خاص وینس کی دو لاکھ ہے۔ وینس خاص میں گویا ہر دو ہزار آدمی کیلئے ایک گرجہ موجود ہے۔ انمیں بعض بہت بڑے بڑے گرجے ہیں۔ جنمیں سے ایک سینٹ مرقس کے گرجہ کا ذکر میں کرچکا ہوں۔ دوسرا بہت بڑا گرجہ جو سترہویں صدی کی عمارات کی بہترین یادگار ہے۔ امان **مریم کا گرجہ** ہے۔ اس گرجہ کی تعمیر بطور اظہار امتنان ہوئی تھی۔

وینس میں ایک خطرناک **طاعون** نمودار ہوئی جسے طاعون جارف کہنا چاہیئے۔ جب اس سے نجات ہوئی تو یہاں کی سینٹ نے یہ گرجا بطور اظہار شکریہ امان مریم تیار کیا ۱۶۳۱ء میں شروع ہوا اور ۱۶۸۷ء میں اسکی تعمیر ہوگئی۔ اس کے گنبد کا قطر ۶۰ گز ہے۔ اس سے عمارت کی عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے میں اس گرجہ کو بھی دیکھنے گیا۔ اور سرسری نظر سے دیکھ کر چلا آیا۔ اور بھی بہت سی عمارات قابل دید تھیں مگر میری بیچینی نے دل برداشتہ کردیا۔ اور میں نے سفر کا عزم کرلیا۔

عام یادداشت کی باتیں

(۱) یہاں وقت کا شمار تو حسب معمول رات کے ایک بجے سے ہوتا ہے یعنی تاریخ تبدیل ہوجاتی ہے مگر یہاں کی گھڑیوں میں ۱۲ نہیں ۲۴ حصے ہوتے ہیں۔ اور یہ نہایت آسان طریق ہے۔ رات کو ایک بجے گھنٹہ کی سوئی ایک پر ہوگی لیکن دن کو ایک بجے ۱۳ پر۔ اس طرح پر ٹائم ٹیبل وغیرہ دیکھنے میں آسانی ہوتی ہے اور رات اور دن کے گھنٹوں کا بآسانی امتیاز ہوجاتا ہے۔

(۲) گنڈولہ میں سواری کیلئے ۲ آدمیوں کی اجازت ہوتی ہے بڑی کشتی میں آٹھ کی۔ اور گنڈولہ کا کرایہ مقامات کے لحاظ سے مقرر ہوتا ہے۔ اور یہ مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی گنڈولہ والا زیادہ نہیں لے سکتا یورپ کے ملکوں میں یہ عام بات ہے کہ گاڑیوں، موٹروں یا گنڈولوں اور کشتیوں کا کرایہ کوئی شخص مقررہ کرایہ سے زیادہ نہیں لے سکتا۔

(۳) حمّال یا قلی مقرر ہیں۔ میونسپلٹی انکو ایک نشان دیتی ہے۔ جو ان کا فرض ہوتا ہے کہ لگائے رکھیں اس پر ان کا نمبر بھی ہوتا ہے۔ انکی مزدوری کی شرح بھی مقرر ہوتی ہے کشتی سے ریلوے سٹیشن تک یا کشتی سے ہوٹل تک فی بنڈل ۲ لیرا ہوتا ہے۔ پانچ اور دس علٰے ہذالقیاس لیرا کے نوٹ ملتے ہیں۔ اور نرخ تبادلہ بدلتا رہتا ہے۔ جب میں یہاں تھا۔ تو ۱۳۲ اور ۱۳۵ فی پونڈ تھا۔

وینس سے روانگی

میں ٹکٹ خرید چکا تھا۔ گاڑی شام کو جاتی تھی میں نے ۲ بجے تک ہوٹل کے بل ادا کئے اور خادموں کو مناسب بخشش دیکر تیاری کرلی۔ یورپ میں ٹپ کا رواج عام ہے۔ اس کے متعلق مختلف قسم کی کہانیاں اور روایتیں میں نے سنی اور پڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اب ہوٹلوں میں تو یہ انتظام ہے کہ وہ دس یا ۱۵ فیصدی اصل بل پر ٹپ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ اور مسافروں کو اس طرح پر ٹپ کے مشکلات سے نجات ہو جاتی ہے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ باوجود اس کے بھی ٹپ دینی ہی پڑتی ہے۔ اور میرے خیال میں یہاں کے رواج کے مطابق کچھ نہ کچھ دینا ہی چاہئے۔ اگر آپ زیادہ آرام سے رہنا چاہتے ہیں۔ گو ملازم نہ تو زیادہ تنگ کرتے ہیں۔ نہ اصرار سے مانگتے ہیں۔ بلکہ وہ صرف امیدوار رہتے ہیں۔

وینس کا ریلوے سٹیشن وینس کا ریلوے سٹیشن بعض گرجوں کو گرا کر بنایا گیا ہے۔ اور میں بغیر کسی قسم کے مذہبی تعصب کے یہ کہتا ہوں کہ گرجوں کی بجائے ریلوے سٹیشن بنا دیا گیا اچھا ہوا ورنہ گرجے تو عام طور پر چنداں مفید نہیں ہے۔ ان گرجوں کی یادگار کیلئے ایک تختہ لٹکا دیا گیا ہے۔ گرانڈ کنال یعنی نہر اعظم میں سے میں موٹر لانچ پر ریلوے سٹیشن کو چلا گیا۔ میرے خواب آلود رفیق مقرر پہلے ہی دی آنا کو روانہ ہو چکے تھے۔ میں جب وینس میں داخل ہوا تھا اس وقت بھی شدید بارش ہو رہی تھی۔ اور جب میں سٹیشن پر پہنچا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

کُک کا ایجنٹ اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُنکی موجودگی سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور میں فرانس کو جانے والی گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اور ایڈریاٹک کے پانی کے اس خوبصورت شہر کو

خدا حافظ کہا

وینس سے پیرس تک

میں جب روانہ ہوا تو بارش کا بہت زور تھا مگر تھوڑی دیر کے بعد تھم گئی۔ اور سورج نکل آیا۔ کچھ دُور تک دونوں طرف سمندر کا عجیب نظارہ ہے۔ اور ریلوے لائن نہایت خوشنما منظر پیش کرتی ہوئی چلی گئی ہے۔ رفتہ رفتہ سمندر دیوتا کو ہم نے چھوڑ دیا۔ اور اب بالکل خشکی ہی خشکی ہے۔

یورپ اور ہندوستان کی ریل گاڑیاں دلچسپ مقابلہ

یہ گاڑیاں نہایت آرام دہ ہیں۔ مگر ان میں سونے کیلئے جگہ نہیں ہوتی۔ اس کے واسطے آپکو الگ سلیپنگ کار میں انتظام کرنا ہوگا میں درجہ دوم کی گاڑی میں سوار تھا جو ہندوستان کے درجہ اوّل سے کم نہ تھی مگر ہندوستان کی گاڑی کو میں ترجیح دیتا ہوں۔ اسلیئے کہ اسمیں سیٹ ریزرو کرنے سے رات کو سونے کیلیئے پورا آرام ملتا ہے۔ اور یوں بھی رات کے سفر میں سونے کے لیئے موقعہ نکل آتا ہے۔ مگر یہاں بہت مشکل ہے ہر ایک خانہ میں جسقدر نشستیں ہوں۔ انپر نمبر ہوتے ہیں۔ اور لوگ آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ کمرے اچھے خاصے ہوتے ہیں۔ اور دروازے بند کر کے آپ نہایت آرام سے بیٹھ جاویں گے۔ انکو سٹیم کے ذریعہ گرم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کپڑا کم ہو تو بھی فکر نہیں۔ جس حد تک اپنے کمرہ کو آپ گرم کرنا چاہیں کر لیجئے۔ کمرے کے آگے سر لبر تمام گاڑی میں ایک برآمدہ ہے۔ جو بڑے بڑے آئینے کے دروازوں سے بند ہے اور آپ سردی ہو یا بارش ہوا کی زحمت کے بغیر باہر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ مقررہ تعداد سے زیادہ بیٹھنے کی لوگ نہ کوشش کرتے ہیں اور نہ کوئی شخص محض اخلاق سے کسی کو جگہ نہ ہونیکی صورت میں بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے جو لوگ پیچھے آتے ہیں وہ برآمدے میں کھڑے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ گاڑی میں لڑنے جھگڑنے کی بداخلاقی کے نظارے نہیں ہوتے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر آرام اور اطمینان سے بیٹھا ہے۔ اسے خطرہ ہی نہیں کہ آدمیوں کا کوئی ریلا آکر اسے تنگ کرے گا۔ یہ لوگ سفر میں بہت ہی کم اسباب ساتھ رکھتے ہیں۔ عام طور پر صرف ایک ہینڈ بیگ ہوتا ہے۔ اور گاڑی میں سامان کھنے کی اس سے زیادہ کے لئے جگہ بھی نہیں ہوتی۔ اور زیادہ سامان کی حاجت ہی نہیں۔ اس لئے کہ سونے کی تو جگہ ہے نہیں۔ جو بستر کی حاجت ہو اور

منزل مقصود پر آپ کسی ہوٹل میں جب کمرہ قیام کریں گے۔ وہاں بستر لازماً موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح نہ کھانے پینے کا بہت بڑا سامان لینا پڑتا ہے۔ اوّل تو گاڑی میں ڈائننگ کار ہوتی ہے۔ دوسرے ہر بڑے سٹیشن پر ریسٹارنٹ بھی ملتے ہیں۔ اور جو لوگ ساتھ کھانا لیتے ہیں۔ وہ نہایت عمدگی سے رکھتے ہوئے کھاتے ہیں یہ نہیں کہ گاڑی میں کھانا کھاتے وقت ساری سیٹ پر داغ دھبے پڑیں۔ شوربا گرتا ہے۔ یا چاول بکھرتے ہیں کہیں پھلوں کے چھلکے اور بیج ہیں۔ کہیں پانی سے گاڑی خراب ہو رہی ہے۔ غرض صفائی کا از بس خیال ہر شخص رکھتا ہے۔

ہندوستان کے درجہ اوّل و دوم کی ریل گاڑیوں کو میں یورپ کی ریل گاڑیوں کے مقابلہ میں ایک اور پہلو سے بھی بہتر سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں گاڑی کے ہر کمرہ میں بیت الخلا اور آب خانہ ہوتا ہے جس میں مسافروں کو بیحد آرام ملتا ہے۔ اور یہ فراخ اور کشادہ ہوتا ہے۔ مگر یورپ میں تمام گاڑی میں اس کے دونوں کونوں پر ہوتا ہے۔ اور ایسی ضرورت پر کمرہ سے نکلکر باہر آنا پڑتا ہے۔ اور جگہ بھی تنگ ہوتی ہے۔ میں ہندوستان کے ریلوے اتھارٹیز کو اس موقعہ پر مبارکباد دیتا ہوں اگر ہندوستانی ریلوں میں مقررہ تعداد سے زیادہ بٹھانے یا بیٹھنے کی اجازت دینے کا سوال حل ہو جائے۔ اور کسی صورت میں مقررہ تعداد سے زیادہ آدمی نہ بیٹھنے پائیں تو

ہندوستان کی ریلیں یورپ سے بہتر ہو جائیں

میں نے یورپ کے مختلف ملکوں میں مختلف درجوں میں سفر کیا ہے اور میری یہ رائے ایک تجربہ کار مبصر کی حیثیت سے ہے۔

یورپ کے ریلوے سفر کے متعلق مشورہ

جن لوگوں کو یورپ جانے کا اتفاق ہو ہمیں وہاں کے ریلوے سفر کے متعلق ان امور کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگرچہ گاڑیوں کی کیفیت کے بیان سے اکثر متعلق کچھ علم ہو جاتا ہے مگر میں خصوصیت سے بھی بعض باتوں کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ اسباب ساتھ لیتے وقت یہ غور کر لینا چاہیے۔ کہ اسکی کیا ضرورت ہے۔ حتی الوسع صرف ایک ہینڈ بیگ یا سوٹ کیس ساتھ لو۔ باقی اسباب براہ راست طامس کک کی معرفت لنڈن بھیجدو۔ اس میں راستہ کے قلیوں کی تکلیف یا ایسے مختلف سٹیشنوں پر بک کرنے کا خطرہ نہ رہیگا۔ یورپ میں اسباب کے ٹکٹ کرانے کو اسباب رجسٹرڈ کرانا کہتے ہیں۔ اور اسپر کافی کرایہ لگ جاتا ہے۔ جو براہ راست بھیجنے پر کم پڑتا ہے۔

۲- چونکہ ریل کے راستہ ولایت جاتے ہوئے مختلف ملکوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر ملک کی سرحد پر کسٹم والے اور وہاں کی پولیس پاسپورٹ اور سامان کو دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کا برتاؤ نہایت شریفانہ ہوتا ہے لیکن فرض آخر فرض ہے۔ اسباب مختصر ہو تو اس سے بھی نجات ہو جاتی ہے۔ عام طور پر وہ تمباکو پوچھتے ہیں۔ جو لوگ سگریٹ یا سگار پیتے ہوں۔ وہ صرف اپنے استعمال کیلئے تھوڑی مقدار رکھیں۔ عام طور پر کسٹم والے آپ پر اعتماد کریں گے۔ اور آپ کے یہ کہدینے پر کہ کوئی چیز قابل محصول نہیں۔ وہ آپ کے اسباب پر نشان کر دیں گے بلکہ میں بڑے زور سے کہوں گا۔ کہ اس اعتماد کو صحیح معنوں میں قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔

۳- مختلف راستوں سے مختلف شہروں کو جا سکتے ہیں۔ اسلئے روانگی سے پہلے اس کے متعلق صحیح علم اور واقفیت پیدا کر لو۔ اپنی ضروریات کے لحاظ سے ہر بات کے متعلق دریافت کر لو۔ اس غرض کیلئے یورپ میں ہر شہر میں مسافروں کا انتظام کرنے والی کمپنیاں ہیں۔ ان کے ذریعہ بہت بڑا آرام ملتا ہے

گونگوں کی رفاقت

خوبئی قسمت کو دیکھو کہ میں جس کمرہ میں سوار ہوا اسمیں ایک شخص بھی انگریزی جاننے یا بولنے والا نہ تھا۔ اور میں انکی زبان سے ناآشنا اور کورا میرے رفیق سفر میلان جا رہے ہیں۔ جہاں سے میں گذشتہ سال واپسی کیوقت گذرا تھا۔ اور اس سٹیشن پر اُتر کر میں نے سٹیشن کے قریب کی بعض جگہوں کا معائنہ کر لیا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح سے اسی سٹیشن پر ایک اخبار کوریرادی لاسرا نامی کے نامہ نگار نے آکر انٹرویو کیا تھا جسکو میں نے سٹیشن کے ٹیلیفون سے اطلاع دی تھی۔ کہ تمہارے سٹیشن پر ہندوستان کا بہت بڑا مذہبی لیڈر موجود ہے۔

منہ میں زبان رکھتے ہوئے گونگے پن کا نظارہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ اور ہر شخص باوجود یہ جاننے کے کہ دوسرا انکی زبان نہیں جانتا اپنی زبان میں مختلف باتیں کہتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے خیال سے بھی یہ بات نکلجاتی ہے کہ یہ زبان سے ناواقف ہے۔ غرض انہوں نے کچھ سلسلہ کلام چھیڑا میں نے طبعاً سمجھ لیا کہ یہ پوچھتے ہیں۔ کہاں سے آیا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں۔ اسلئے میں نے کہدیا کہ انڈیا۔ پیرس۔ یہ لوگ پیرس کو پاریج بولتے ہیں۔ میں نے اس موقعہ پر لطف اُٹھانے کیلئے اپنی پنجابی زبان میں کہا۔ جوان تُوں کتھے چلیاں ای (آپ کہاں جا رہے ہیں) انہوں نے بھی خیال سے ہی سمجھ لیا۔ کہ شاید یہی مطلب ہوگا۔ کہ کہاں جا رہے ہو۔ کہدیا میلانو ایچی میلانو۔ اس کے بعد میں ریل کے کنارے کی سیر میں مصروف ہو گیا۔

سرسبز علاقہ میں سے گذر

گاڑی کے دونوں طرف نہایت ہی خوشنما سبزہ زار ہے۔ جسے دیکھ کر آنکھ ٹھنڈی اور دل مسرور ہوتا تھا۔ اور یہ سلسلہ برابر چلا جاتا ہے کھیت بھی تو بے ترتیب اور بدنما نہیں ہیں جی چاہتا تھا کہ ان پر لطف نظاروں کو دیکھنے کے لئے ریل سے اتر پڑوں۔ اور پیدل سفر کروں۔ مگر اب اور کبھی یہ بس کی بات نہیں ہے۔

یہاں کا کاشتکار

میں مختصر طور پر یورپ کے کاشتکار کا ذکر شاید کسی اور جگہ کروں۔ یہاں صرف ایک موقعہ کی مناسبت سے ذکر کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہاں کے کھیتوں کا نظارہ ہے کھیت ایسے خوبصورت اور دلربا ہیں گویا انکو نہایت قابلیت کے ساتھ علمی اصول سے تیار کیا گیا ہے۔ یہاں کا کاشتکار اپنے کھیت میں کیارہ سازی نہیں کرتا۔ اور کیارے بنانے میں اپنے وقت اور زمین کو ضائع نہیں کرتا اس کا کل کھیت گویا ایک ہی کیارہ ہے۔ البتہ جہاں مختلف ملکیتوں کا موقعہ آگیا ہے۔ تو درختوں کی ایک لائن کے ذریعہ حد فاصل بنا دی گئی ہے۔ ہندوستانی دہقان اپنے کھیت کا بڑا حصہ کیاروں میں ہی ضائع نہیں کرتا بلکہ ملحقہ کھیتوں میں حد فاصل کیلئے بنہ بناتا ہے۔ اور بنہ شکنی کے مقدمات آئے دن غریب کاشتکار کا خون چوسنے کا ذریعہ ہو جاتے ہیں مجھے ان تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں میرے زمیندار اور دوسرے احباب ان حالات سے خوب واقف ہیں۔ یورپ کا دہقان تو میرے سامنے تھا۔ مگر ہندوستانی دہقان عالم تصور میں میرے سامنے آیا۔ اور میں نے اسکی حالت کو دیکھ کر افسوس کیا۔ اور اسے کہا کہ

یورپ کے دہقان سے سبق سیکھ

غرض کھیتوں کو نہایت عمدگی سے کاشت کیا ہوا ہے۔ اور جو فصل بھی ہے وہ نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ اور کہیں بھی بے ترتیب نہیں ہے درخت جو حد بندی کیلئے لگائے گئے ہیں۔ وہ بھی علم فلاحت کے اصول پر ہیں۔ ہر سال انکی شاخ تراشی ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ شاخ تراشی بھی ایسے اصول پر کہ خوبصورتی میں فرق نہ آوے۔ ہمارے ملک کی طرح نہیں۔ کہ یا تو بالکل ٹنڈ منڈ اور یا اسے بالکل ناقابل گذر جھاڑی بنا دیا جاوے۔ اس طرح شاخ تراشی سے نہ خوبصورتی میں فرق آتا ہے۔ نہ ان کے نمو پر اثر پڑتا ہے اور نہ ان کے سایہ سے فصل کو نقصان پہنچتا ہے۔

غرض یہ خوبصورت منظر اور دلفریب سبزہ زار ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اور شام کی تاریکی میرے اور میرے رفقاء کے لطف پر حملہ کر رہی تھی۔

وَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا پر ذوقی کیفیت

آخر تاریکی نے ہمیں اس نظارہ سے محروم کر دیا۔ اور ہم مجبور ہو کر حجرہ نشین بنگئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں فریضہ نماز سے فراغت کر لوں۔ چنانچہ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے بلا لحاظ سمت فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ پر عمل کر کے نماز شروع کر دی۔ میرے رفقاء کو قدرتی طور پر تعجب ہوا کہ میں یہ کیا کرنے لگ گیا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے چاہا کہ کچھ ناشتہ کر لوں۔ کیونکہ میرے رفقاء سفر میں سے بعض نے اپنے ہینڈ بیگ کھول کر کاغذوں میں لپٹا ہوا کھانا نکال کر کھانا شروع کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی شراب کی بوتلوں کو بھی منہ لگا کر آبنوشی کا قائمقام بنایا۔ چونکہ یہاں انگور بہت ہوتا ہے۔ ہر شخص کثرت سے انگوری شراب پیتا ہے۔ جسکو وینو کہتے ہیں۔ ایک نے مجھے آفر کی میں نے سلام کر کے انکار کر دیا۔ ان کے لئے قدرتاً اور طبعاً تعجب خیز امر تھا کہ میں نہ شراب پیتا ہوں اور نہ سگریٹ اور سگار کا شوق کرتا ہوں۔ پھر زندہ کیسے ہوں؟

غرض میں نے اپنے اذوقہ کو نکالا جو بسکٹوں اور پھلوں پر مشتمل تھا میں نے کچھ پھل لیڈو سے خرید کئے تھے۔ اور انہیں سے کچھ حصہ لیڈو سے وینس آتے ہوئے جہاز پر امریکن سیاح کے پوتے کو دیا تھا۔ اور اب کچھ ان رفقائے سفر میں تقسیم کیا۔ جب میں تقسیم کر رہا تھا۔ تو مجھ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور خدا تعالیٰ کے ارشاد وَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْرًا کی تفسیر پر غور کرنے لگا۔ کہاں امریکہ۔ کہاں انڈیا۔ اور کہاں لیڈو۔ اور اٹلی کے یہ پھل میں نے خرید کر امریکن سیاح اور ان میلانی مسافروں کو دینے تھے۔ اس تقسیم کے ذوق نے خدا کی تقدیر اس کے علم اور ارادہ پر مجھے ایک مزید ایمان عطا فرمایا۔ اور دیر تک میں اس کیفیت کا مزا لیتا رہا۔ میں نے کچھ تھوڑے سے پھل کھائے۔ اور پھر میں نے مناسب سمجھا کہ کھانا ڈائننگ کار میں جا کر کھاؤں گا اور بسکٹ اور باقی پھل کل کسی وقت استعمال کروں گا۔ چنانچہ جب ڈائننگ کار کا ملازم آیا تو میں نے بھی آرڈر دیدیا۔ اور پادوسٹیشن سے آگے کھانے کی گاڑی میں چلا گیا۔

کھانے کی گاڑی میں

چونکہ گاڑیوں میں آنے جانے کیلئے برابر رستہ ہوتا ہے۔ اس لئے کھانا کھانے کے لئے کسی سٹیشن پر اتر کر کھانے کی گاڑی میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنی میز پر اکیلا ہی تھا۔ میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو ایک دوسرے میز پر بیٹھی ہوئی تھی اٹھ کر میرے میز پر آگئی۔ وہ انگریزی جانتی تھی۔ مجھے اس سے معلوم ہوا کہ وہ صرف اسلئے اٹھ کر آگئی ہے۔ کہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ مجھے صرف ہندوستانی سمجھ کر الگ میز پر بٹھایا گیا ہے۔ مجھے اس کے

اس جذبہ سے بہت خوشی ہوئی۔ اور میں نے کسی قدر سر کو جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ میں کبھی یہ خیال نہ کرتا تھا۔ کہ میں اسلئے اکیلا ہوں کہ میں اٹالین زبان کے مینو (کھانوں کی تفصیل کا نقشہ) کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے یہاں آجانے سے مجھے یہ بھی فائدہ پہنچا۔ میں نے پھر خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میری مدد کیلئے اس کے دل میں یہ تحریک پیدا کر دی۔ کہ وہ میرے پاس آجائے۔ اس سے میں نے پوچھا کہ کیا کیا کھانا ہے۔ اور میں نے اسکو بتا دیا کہ میں صرف سبزی اور انڈوں کا خاگینہ کھاؤں گا اور کسی قسم کا گوشت یا گوشت سے بنی ہوئی چیز نہیں کھاتا۔ چنانچہ اس نے ویٹر کو ہدایت کر دی اور کھانا شروع ہوا۔ ہم دونوں کھانا کھاتے جاتے تھے۔ اور مکالمہ کا لطف اٹھاتے تھے۔

میں اپنے اس سیاحت نامہ میں کسی بات کو حتی الوسع چھوڑنا نہیں چاہتا۔ طبعاً لوگوں کی توجہ ہماری طرف تھی۔ وہ میری کشش اور جذب کے قائل معلوم ہوتے تھے۔ میں نہیں جانتا وہ سمجھتے ہونگے لیکن میں خدا کا شکر کرتا تھا۔ کہ

اس اجنبی ملک میں بھی مجھے ایک بات کرنیوالا رفیق اُسنے دیدیا

ابتدائی گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خاتون پیرس جا رہی ہے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس سے مجھے آرام ملیگا۔ اور ہم میں مندرجہ ذیل گفتگو میز پر ہوئی۔

خاتون۔ کیا آپ بدھ ہیں؟

عرفانی۔ اگر آپ لٹریری معنوں کے لحاظ سے کہتی ہیں۔ تو میں بدھ ہوں۔ اسلئے کہ میرا نام عرفانی ہے۔ اور عرفانی کے معنی بُدھ ہی ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ میں بدھ مذہب کا پیرو ہوں تو میرا جواب ہے کہ میں مسلم ہوں۔

خاتون۔ نہیں نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ آپ گوشت وغیرہ نہیں کھاتے۔ آپ کا مذہب منع کرتا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ بدھ نہیں کھاتے۔

عرفانی۔ میرا مذہب گوشت کو منع نہیں کرتا۔ البتہ بعض خاص گوشت کی اجازت نہیں دیتا جو طبّی یا اخلاقی یا روحانی طور پر برا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور بدھ مذہب کے ماننے والے گوشت کھاتے ہیں۔ ایک اور قوم جنکو ہندو کہتے ہیں وہ نہیں کھاتے۔ اور اب تو یورپ میں بھی بہت سے ویجی ٹیرین ہیں جو گوشت نہیں کھاتے۔

خاتون۔ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ سبزی اچھی ہے۔
عرفانی۔ بیشک، ڈاکٹر یہ بھی تو کہتے ہیں کہ گوشت اچھا اور بعض حالتوں میں ضروری ہے۔
خاتون۔ بیشک یہ بھی درست ہے۔ پھر آپ کیا کھاتے ہیں۔
عرفانی۔ میں گوشت اور سبزی دونوں کھاتا ہوں کیونکہ دونوں ضروری ہیں۔
خاتون۔ مگر اب آپ نے کہا کہ میں گوشت یا گوشت کی کوئی چیز نہیں کھاتا۔ اسکی کیا وجہ؟
عرفانی۔ میں نے اس گوشت کے متعلق کہا ہے۔ اسلئے کہ طبی طور پر یہ مضر ہوتا ہے۔
خاتون۔ کیا سچ مچ ایسا ہے۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں۔ ہم لوگ تو ہمیشہ یہی گوشت کھاتے ہیں اور ڈاکٹر منع نہیں کرتے۔
عرفانی۔ میں تو ڈاکٹر نہیں مگر آپ لوگوں کے ہاں ذبح کا طریق اچھا نہیں۔ خون پورے طور پر نہیں نکلتا۔ اور خون کی زہریلی کچھ اثر باقی رہجاتا ہے۔
خاتون۔ شاید ایسا ہو میں نہیں کہہ سکتی۔

اس کے بعد بعض اور ادہر ادہر کی باتیں ہندوستان کی آب ہوا اور باشندوں کے حالات کے متعلق ہوتی رہیں۔ ہماری گفتگو کو لوگ دلچسپ سمجھتے تہے مگر کن آنکھوں سے دیکھتے تہے۔ اسلئے کہ انکی آداب مجلس کے خلاف ہے۔ کہ جو دو شخص باتیں کر رہے ہوں۔ تو اپنے کسی فعل یا حرکت سے ان کیطرف زیادہ توجہ کرنے یا اشارہ کرنے یا کان رکھنے کا اظہار کریں۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے بل ادا کیا اور اس خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ اسنے میری مدد کی۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں یورپ کے آداب مجلس سے واقف نہیں۔ اور ہر قوم اور ملک کے اپنے اخلاق جدا ہوتے ہیں اسی ناواقفی کیوجہ سے بعض وقت ایک دوسرے کو بداخلاق یا غیر مہذب سمجھتا ہے۔ مگر یہ بات نہیں ہوتی۔ انہیں سے ایک عورتوں کے ساتھ ہاتھ ملانے کا طریق ہے۔ ہمارے ہاں عورتوں کے ساتھ مرد کا ہاتھ ملانا اخلاق کے خلاف ہے۔ عورت کی غیرت اسی میں ہے کہ غیر مرد سے ہاتھ نہ ملائے۔ اور یورپ میں یہ بداخلاقی ہے۔ کہ ہاتھ نہ ملائے۔ اسپر اُسے تعجب ہونا قدرتی بات تہی۔ اور یہ سنکر اُسے ہاتھ ملانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس سے خوش ہی کی کہ وہ میری سیٹ دیکھ لے تاکہ پھر ملنے میں ایک طرف تو اُسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا تہا کہ زبانِ دانی کیوجہ سے آرام ملیگا۔ دوسری طرف مجھے یہ بھی خیال تہا۔ کہ عورت ذات سے یورپ میں

خصوصاً محتاط اور ہوشیار رہنا چاہئے۔ تاہم میں اس سے انکار نہ کر سکا۔ اور وہ میرے ساتھ کمرے تک آئی۔ اور میں نے اسے وہاں پہنچتے ہی گڈنائٹ کہہ کر رخصت کر دیا میلان تک تو اس کمرہ میں کسی کے آنے یا اترنے کی توقع نہ تھی۔ اسلئے رات کو اس سے زیادہ جگہ تو نہیں ملسکتی تھی کہ اپنی ہی جگہ پر اونگھ لوں۔ نیند کا بھی کمال ہے۔ اور شہور ہے کہ تلوار کی دھار پر بھی آجاتی ہے اس لئے نیند آتی تھی اور کچھ دیر تک مجھے اس عالم سے غافل کر دیتی۔ اور میں پھر چونک پڑتا میرے ساتھیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور ایک تکلیف یہ تھی کہ پاؤں اٹھا کر تختہ پر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

ہر دو کے ملک کی سرحد پر جب ہم پہنچتے تو کسٹم والے قابل محصول چیز کی پڑتال اور دیکھ بھال کیلئے اور پولیس والے پاسپورٹ دیکھنے کیلئے آ داخل ہوتے۔ نگران کا سلوک نہایت شریفانہ اور قابل قدر ہے۔ وہ صرف سوال کرتے اور اگر تم کہہ دو کہ قابل محصول چیز نہیں تو علے العموم اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ بہت ہی کم اسباب کھول کر دیکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ رات گذر گئی اور متعدد ٹنل ہمارے راستے میں آئے۔ پہاڑی علاقہ میں سے گذرتے ہوئے صبح ۶ بجے ہم لوزان پہنچے۔ جو سوئٹزرلینڈ میں واقع ہے۔ اب ہم سوئٹزرلینڈ سے گذر رہے تھے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدرتی مناظر دلکش اور اس کا ہر حصہ زمین۔ کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است کا مصداق ہے۔

کچھ سوئٹزرلینڈ کے متعلق

سوئٹزرلینڈ کے شاداب سبزہ زاروں سے اب میں تیسری مرتبہ گذر رہا یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ قدرت نے جو خوبصورتی اس ملک کو دی ہے یورپ کے کسی ملک کو بلحاظ قدرتی مناظر کے حاصل نہیں۔ یوں تو ہر ملک میں قدرتی مناظر دلفریب ہیں لیکن یہ ملک اپنے خوشنما پہاڑوں سرسبز وادیوں اور دلفریب جھیلوں اور صحت افزا مقامات کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور ہر سال نہ صرف یورپ کے مختلف حصوں سے بلکہ دنیا کے تمام حصوں سے لوگ یہاں آتے ہیں اور اگر سچ پوچھو تو ان باہر سے آنیوالوں پر ہی اس ملک کے گذارہ کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اسلئے کہ اس ملک کی کوئی ذاتی پیداوار سوائے بعض پھلوں اور سبزیوں کے اور کچھ نہیں۔ ہاں سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی کثرت کے باعث یہاں دودھیلی گائیاں بہت ہوتی ہیں۔ ان کے بڑے بڑے ریوڑ نظر آتے ہیں۔ اور بہت خوبصورت ہیں۔ سوئٹزرلینڈ سے ڈبوں میں بند ہو کر دودھ اور پنیر تمام دنیا میں جاتا ہے جس ملک میں چاہو

سوئزرلینڈ کا دورہ آپکو مل جاوے گا۔ اس تجارت سے بھی اہل ملک کو بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے دوسرا ذریعہ آمدنی یہاں کی گھڑیاں ہیں۔ جس کثرت کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں تمام دنیا میں جاتی ہیں اس قدر ابھی تک کسی اور ملک سے جانے نہیں لگیں۔ اور اس تجارت میں سوئیزرلینڈ کا کوئی ملک مقابلہ نہیں کرسکتا۔

والئے برما

میں جب سوئیزرلینڈ کے مرغزاروں میں سے گذرا کشمیر کی وادیاں میری نظر کے سامنے تھیں جن کے دیکھنے کا بھی خداتعالیٰ نے مجھے موقعہ دیا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ کشمیر اپنی تجارت کو دنیا میں ایک وسیع پیمانہ پر تو درکنار معمولی حیثیت میں بھی نہیں پھیلا سکتا۔ کشمیر کے میوہ جات وہیں سڑگل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر ان پھلوں کو یورپ بھیجنے کا انتظام کیا جاوے تازہ نہ بھیجے جائیں تو خشک اور مربوں کی شکل میں بھی بہت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے میں اس موضوع پر دوسرے مقام پر انشاءاللہ وضاحت سے لکھوں گا۔

سوئیزرلینڈ کی وادیوں اور مرغزاروں کے مقابلہ میں کشمیر زیادہ دلفریب اور عطیات قدرت سے مالا مال ہے مگر کشمیر ہندوستان میں واقع ہے۔ جہاں قدرت کی دلچسپیوں سے لطف اُٹھانے کا مذاق شاید نہیں۔

سوٹزرلینڈ اور ہندوستان کی پہاڑی زندگی

سوٹزرلینڈ اور ہندوستان کی پہاڑی زندگی کا مقابلہ ایک دفتر اور تفصیل چاہتا ہے۔ میں صرف چند باتوں کا ذکر کرونگا کشمیر کی وادی سوئیزرلینڈ سے بدرجہا بہتر ہے۔ مگر باشندوں میں بعض حرفتی مناسبتیں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح پر کشمیر میں لکڑی پر نقش ونگار کا کام اعلےٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اسی قسم کا یہاں بھی ہوتا ہے۔ کہ باشندے اپنی طباعی اور ذہانت میں کشمیریوں سے یا کشمیری سوٹزرلینڈیوں سے کم نہیں۔ کشمیر کو طبعی طور پر بعض فضیلتیں حاصل ہیں۔ کاشتکاری کیلئے بھی موقعے ہیں مگر کشمیر کی مفلسی اور قلاشی تکلیف دہ ہے۔ برخلاف اس کے سوٹزرلینڈ کے لوگ آسودہ حال اور فارغ البال ہیں۔ دیہاتی مکانات بھی لکڑی ہی کے بنائے جاتے ہیں۔

سامان وغیرہ اُٹھانے کا طریق بھی علے العموم پہاڑی قوموں کی طرح کمر پر ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ عورتوں نے کمر پر ٹوکرے یا پٹھو باندھے ہوئے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ تعلیم ایک تبدیلی کردیتی ہے

موسم سرما کی مصروفیت اور کھیلیں

موسم سرما میں یہاں برف پر مختلف قسم کی کھیلیں ہوتی ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ کے مختلف حصص سے خوش فکرے اس زندگی کا لطف اٹھانے کیلئے آتے ہیں۔ بعض مقامات پر انتہائی سردی ہوتی ہے۔ اور بعض مقامات اتنے سرد نہیں ہوتے۔ اور وہ سینی ٹوریم ہیں لوگ بحالی صحت کیلئے آجاتے ہیں۔ اور اس سے باشندے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ان مقامات کو ہر دلعزیز اور مشہور بنانے کیلئے باقاعدہ انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ جو ان کے لئے اشتہار دیتی رہتی ہیں۔ اشتہار ایسے دلکش اور جاذب ہوتے ہیں۔ کہ پڑھ لینے کے بعد بے اختیار کشش پیدا ہوتی ہے میں نے غلط کہا اشتہار دیکھ لینے کے بعد ہی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔ کہ

اس مقام پر تو ابھی پہونچنا چاہیئے

تمام پہاڑوں پر ریلوے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بارہ ہزار فیٹ کی بلندی تک ریلوے چلی گئی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ آبشار بہت ہیں بجلی ان آبشاروں کے پانی کی طاقت سے لے لی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہی ریلوں کو چلایا گیا ہے۔ کسی پہاڑ پر کوئی موقع ایسا ہو جہاں سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہو۔ اُسے چھوڑا نہیں گیا۔

قرآن مجید کی عظمت

میں نے پہاڑوں کے ان کوائف اور حالات کو ایک سرسری نظر سے دیکھا اور قرآن مجید کی عظمت کے سامنے درود شریف پڑھتے ہوئے سر جھکا دیا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے کیا نعمت لیکر آئے۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر جبال کا ذکر آیا ہے۔ اور مختلف باتیں ان سے بیان کی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے کہ پہاڑوں میں کھود کر گھر بناتے ہیں۔ پہاڑی زندگی کے تمام آرام اور سہولتوں اور بے تکلف راحتوں کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے قرآن مجید صرف ایک اشارہ کرتا ہے جس قدر سائنس اور علوم جدیدہ اس بارے میں ترقی کریں گے اور پہاڑی زندگی کے تکلفات اور تعیشات پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ سب اس میں آتے جائیں گے اسی طرح کہیں فرمایا کہ پہاڑ زمین کیلئے لنگر اور اسکے استحکام کا موجب ہیں۔ اس میں بھی پہاڑی منافع اور ان امور کیطرف توجہ دلائی ہے۔ جتنے ہم متمتع ہو سکتے ہیں۔ غرض پہاڑوں کے علم پر جس جس قدر توجہ ہوگی۔ اور جو جو ترقیات ہوں گی۔ وہ قرآن کریم کی عظمت اور جلال کو ظاہر کریں گی۔ ہم ان آبشاروں

پہاڑی بوٹیوں۔ اور ناقابل گذر دروں۔ اور راستوں کو اپنے لئے کوئی مفید نہیں سمجھتے تھے۔ گو قرآن مجید حضرت داؤد کیلئے پہاڑوں کی تسخیر کا انعام ذکر کر کے اس کے منافع کیطرف توجہ دلاتا تھا۔ اب یورپ اور مغرب نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان پہاڑوں سے کس قدر متمتع ہوتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ہی کے پہاڑوں کو دیکھو۔ کہ کس طرح دنیا وہاں کھچی چلی جاتی ہے۔ اور اپنے ملک کا کس قدر روپیہ یہاں کے رہنے والوں کو گھر آ کر دے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں پہاڑوں کا فلسفہ اور پہاڑی زندگی کے عجائبات بجائے خود ایک سائنس اور علم ہے۔ میں مشاہدات کے پڑھنے والوں کو توجہ دلاتا ہوں۔ کہ وہ قرآن مجید کے ان تمام مقامات کو جہاں پہاڑوں کا ایک یا دوسرے رنگ میں ذکر آتا ہے۔ علوم جدیدہ کی روشنی اور یورپ کی تجارب و مشاہدات کو مدنظر رکھ کر مطالعہ کریں۔ تو انکو ایک لذیذ بصیرت حاصل ہوگی

ہندوستانی سبق لیں

ہندوستانی ان باتوں سے سبق لیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے لوگ یورپ جاتے ہیں۔ وہ ان ملکوں میں پھرتے اور اپنی زندگی کا لطف اٹھا کر واپس آ جاتے ہیں۔ اور اپنے اہل ملک کیلئے کسی مفید کام کا اجرا نہیں کرتے۔ ضرورت ہے۔ کہ ہندوستان کے صحت افزا مقامات کو دنیا میں مشتہر کرنے کے لئے کوئی کمیٹی قائم ہو۔ اور ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر اسی طرح کا انتظام کریں۔ پھر دیکھیں کہ امریکہ اور یورپ کی دولت کس طرح اس ملک میں چلی آتی ہے۔ اور وہ بھی ان چیزوں کیلئے جنکو ہم محض بیکار سمجھتے ہیں۔ میں یہاں صرف اشارہ کرتا ہوں تفصیل کے ساتھ دوسرے مقامات پر انشاء اللہ لکھوں گا۔

غرض

ان پر لطف پہاڑوں اور سرنگوں سے گذرتا ہوا نکلگیا۔ تمام راستہ نہایت سرسبز شاداب اور دلکش سبزہ زار ہے۔ میں نے جب درختان چنار کو دیکھا۔ تو بے اختیار میرے منہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ شعر نکلگیا ؎

رات جو رکھتے تھے پوشاکیں برنگ یاسمن
صبح کرنے گی انہیں مثل درختانِ چنار

درختان چنار | دیر تک اس پیشگوئی کا لطف اٹھاتا رہا۔ اور خدا تعالیٰ کے جلال و جبروت اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت و عظمت پر غور کرتا رہا۔ اب میں دیکھتا تھا۔ کہ ہر گھڑی اور ہر سانس

مجھے اس شہر کے قریب کر رہا تھا۔ جو عروس دنیا کے نام سے مشہور ہے یعنی پیرس۔ چنانچہ پونے تین بجے میں پیرس پہنچ گیا۔

ورودِ پیرس

پیرس کا سٹیشن بہت بڑا ہے۔ میں یہاں آج تیسری مرتبہ آتا ہوں۔ سال گذشتہ لنڈن جاتے ہوئے تو ٹھہرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ واپسی پر چند روز یہاں ٹھہرنے کا موقعہ ملا تھا۔ اور میں نے اس وقت بطور خود پیرس کی سیر بھی کی تھی۔ جو کام میرے سپرد حضرت خلیفۃ المسیح نے فرمایا تھا۔ میں اسے سرانجام دینے کے بعد جو وقت ملتا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اور کبھی تنہا اور کبھی مکرمی ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب کے ساتھ اور کبھی چوہدری محمد شریف صاحب کے ساتھ چلا جاتا۔ اور اپنی طبیعت و مذاق کے موافق کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے اپنے دماغ و نوٹ بک میں جمع کرتا رہتا تھا۔ غرض میں پیرس پہنچا۔

پہلا اثر اختلاف زبان سے

میں اسوقت تک مختلف ملکوں سے گذر آیا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ میں مختلف زبانیں سنتا اور بعض ان میں سے خود بھی بولتا تھا لیکن کسی مقام پر مجھے

زبانوں کے مختلف نظارہ پر

غور کرنے کی تحریک نہیں ہوئی لیکن پیرس کے سٹیشن پر جب میں نے دیکھا۔ کہ سب کچھ غت بود ہو گیا ہے۔ اور اب ایک لفظ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ تب اختلاف السنہ کے متعلق ایک لذیذ خیال دماغ میں گذرا۔ کہ

خدا تعالےٰ نے اختلاف السنہ کو ایک نشان قرار دیا ہے

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ اس نے مجھے محض سماعی ایمان کے درجہ تک نہیں رکھا۔ بلکہ موقعہ دیا کہ میں خود مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں میں سے گذروں اور ان میں قیام کروں اور

خدا تعالیٰ کے عجائبات قدرت کا مشاہدہ کروں

اختلاف السنہ ایک نشان ہے

اس اختلاف کا خیال آتے ہی میں قرآن مجید کے اس مقام کیطرف متوجہ ہوا جہاں اختلاف السنہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک نشان اپنی معرفت

اور ہستی کا نشان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

من آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم و
الوانکم ان فی ذالک لآیات للعلمین (سورۃ روم)

یعنی اللہ تعالیٰ کے آیات میں سے آسمان اور زمین کی تخلیق ایک نشان ہے۔ اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا تفرقہ بھی ایک نشان اور آیت ہے۔ بیشک ان امور میں ان لوگوں کیلئے آیات ہیں۔ جو عالم ہیں۔ اس آیۃ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ لسان اختلاف السنۃ اور رام السنہ کے فلسفہ کیطرف یہ عملی طور پر توجہ دلائی ہے۔ قرآن مجید کی علمی بلند پروازیاں اور کمالات ایک مستقل مضمون ہے۔ مگر یہاں سے یہ پایا جاتا ہے کہ کس طرح ہر ایک مسلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف زبانوں کو پڑھے۔ اور فلالوجی کی باریکیوں اور مختلف زبانوں کے باہم رشتوں پر عالمانہ غور کرے۔ تاکہ وہ خدا تعالیٰ کے ان آیات کی حقیقت کو علے وجہ البصیرۃ یقین کر سکے۔

اس وقت تو میں نے اپنی نوٹ بک میں فلسفہ اختلاف السنہ کا بھی نوٹ لکھا۔ مگر اسی وقت میں خدا کے فضل سے دور تک اس مضمون کی تہ میں چلا گیا۔ اور یہ تحریک مجھے پورٹر سے گفتگو کرنے پر ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں میں سے گذرا اور انہیں رہا۔ اور کہیں ان کی زبان بولتا اور کہیں اشاروں سے کام لیتا تھا۔ یہاں پہنچکر رفقائے سفر اتر کر جھٹ ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور میں کھڑا منہ تکتا رہ گیا۔ پورٹر صاحب میری زبان نہیں سمجھتے۔ میں انکی زبان سے بے بہرہ۔

یہ میرا خیال تھا کہ سٹیشن پر کُک کا آدمی موجود ہوگا۔ وہ موجود بھی تھا لیکن میری نظر اس پر نہ پڑی اور وہ دوسرے مسافروں کے آرام و انتظام میں مصروف ہو گیا۔ غرض میں پورٹر صاحب کو لیکر نکلا کہ کُک کے آدمی کو تلاش کروں۔ میرا کُک کہدینا کافی تھا پورٹر بھی اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور آخر وہ اس کے پاس مجھے لیگیا۔ میں نے اسکو کہا کہ میں کوچہ روسیو میں ہوٹل برطانیہ میں جانا چاہتا ہوں۔ اسنے موٹر والے کو بلا کر کچھ کہا۔ اور اُسے غلط فہمی ہوئی۔ وہ مجھے پیرس کے دوسرے سٹیشن نو۔ ڈ یعنی شمالی پیرس پر لے گیا۔ جہاں سے لنڈن کو گاڑیاں چلتی ہیں۔

دراصل یہ غلطی اسوجہ سے ہوئی کہ کُک کے آدمی نے میرا ٹکٹ دیکھا تھا۔ اور اسے خیال ہوا کہ میں لنڈن جا رہا ہوں۔ اور میرے مقام پیرس کا خیال اُس کے دماغ سے نکل گیا۔ موٹر والا اسٹیشن پر لایا تو اسے کہتا ہوں ہوٹل برطانیہ اور وہ مجھے پلیٹ فارم دکھاتا ہے۔ آخر میں نے سمجھا کہ جو کچھ ہوا مشیت ایزدی کے ماتحت

ہوا میں وہاں سے بھی ہوٹل کو جا سکتا تھا۔ لیکن میں نے اب یہی مناسب سمجھا کہ فوکسٹن جا کر ٹھیروں گا۔ اور چونکہ اس جمیعت میں کچھ دیر بھی ہوگئی تھی۔ گاڑی کا وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ اُتر کر سوار ہونے کی کوشش کی۔ اور افراتفری میں میرا مشہور و معروف لٹھہ جو سالہا سال کا رفیق اور ہزاروں میلوں کے سفر کا تجربہ کار تھا۔ موٹر میں رہگیا۔ اور وہ پیرس میں اور میں پیرس سے لنڈن کو چلا گیا۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ کہ گذشتہ سال میں نے پیرس کے دیکھنے کا موقعہ پالیا تھا۔ گو میں اب بھی زیادہ دیر یہاں ٹہرنا چاہتا تھا کیونکہ میرا پروگرام واپسی پیین اور مراکو کی طرف سے تھا۔ اسلئے مجھے آج اس جلدی سے چلے جانیکا افسوس بھی نہ تھا۔ میں جس راستے سے روانہ ہوا یہ براہ

فوکسٹن

کہلاتا ہے۔ میں اپنے قیام پیرس کے گذشتہ تجربات کو سردست یہاں دیدینا چاہتا تھا۔ لیکن قبل اسکے کہ میں انکو لکھوں میں لنڈن پہنچ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہاں سے روانہ ہو کر ہم چینل پر پہنچے۔ وہاں جہاز تیار ہوتا ہے۔ گاڑی سے اتر کر فورًا سوار ہوگئے۔

میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہوا تھا کہ میں فوکسٹن جا کر ٹھہروں گا۔ رود بار کو عبور کرتے وقت عمومًا سمندر متلاطم ہوتا ہے۔ اور بہت ہی کم لوگ بچتے ہیں جو قے نہ کریں۔ مگر خدا کے فضل سے میں گذشتہ سال بھی محفوظ رہا تھا۔ اور اب بھی اس عبور کو میں خوشگوار سمجھتا ہوں۔ جہاں دوسرے لوگ قے کر رہے تھے۔ میں اس نظارہ کو دیکھ کر شکر کرنے والوں میں سے تھا۔ آخر یہ منزل بھی ختم ہوئی۔ اور میں ساحل انگلستان پر پہونچگیا۔ الحمد للہ اب میں نے ارادہ کیا کہ یہاں ٹھہر جاؤں۔ مگر میرے پورٹر صاحب نے کہا۔ کہ گاڑی تیار ہے۔ لنڈن ہی جا کر ٹھہریئے۔ اور مشورہ دینے کے ساتھ ہی گاڑی رجو پاس ہی کھڑی تھی، پر میرا اسباب رکھدیا میں پھر

عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا

ورود لنڈن

میں نے درد صاحب کو لکھا تھا کہ میں روانگی کا تار دوں گا۔ مگر میرا خیال تھا کہ پیرس ٹھہروں گا۔ اسلئے تار نہ دیا۔ اور فوکسٹن ٹھہرنے کا خیال تھا۔ اس وجہ سے یہاں سے بھی تار نہ دے سکا۔ گاڑی رات کو ۱۱ بجے کے بعد پہونچتی تھی۔ اس خیال سے بھی تار نہ

نہ دیا۔ کہ بیوقت جاکر تکلیف دینا کیا ضرورت۔ رات کو کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ اور صبح
ہی مسجد میں جا پہونچوں گا۔ مگر خدا تعالیٰ کے علم میں مجھے اسی روز اپنے گھر میں بآرام پہونچ جانا تھا
چنانچہ میں وکٹوریہ سٹیشن پر ۱۱ بجے رات کو اترا۔ اور قلی کو لیکر قریب کے
ہوٹلوں میں گیا۔ مگر سب ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ اب بجز اس کے
چارہ نہ تھا۔ کہ گھر پہنچوں۔ چنانچہ اسباب سٹیشن پر رکھا اور وہاں سے
ریلوے پر سوار ہوکر ٹبن پہنچا۔ اور دروازے پر جا دستک
دی۔ درد صاحب اپنے کام میں اس وقت تک کہ بارہ بج
چکے تھے۔ مصروف تھے۔ وہ نیچے اترے۔ مجھے دیکھ
کر انکو اور انکو دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔
میں بیان نہیں کرسکتا۔ تعجب اور محبت کے
جذبات سے ہم نے ایکدوسرے سے
مصافحہ اور معانقہ کیا۔ اور
قریباً ایک گھنٹہ تک چار
نوشی اور باتوں میں
گذار کر ہم
سو گئے

الحمد للہ علےٰ ذالک

طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری

اب دوسری جلد میں انشاء اللہ العزیز عروس البلاد پیرس کے مشاہدات اور پیرس سے لنڈن
تک کے حالات تفصیلی ذکر کرونگا۔ وباللہ التوفیق

خاکسار عرفانی

نوٹ:۔ کاتب دوسری جلد انشاء اللہ العزیز جلد سے جلد شروع کر دیگا (عرفانی)

حضرت مسیح موعودؑ کی سیرت اور سوانح حیات

سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اولیات کی جب تاریخ لکھی جائیگی تو خدا تعالیٰ کے فضل و رحم سے خاکسار عرفانی کیلئے بھی اسمیں ضرور جگہ ہوگی۔ حضرت مسیح موعودؑ کے سوانح حیات اور سیرۃ کا کام بھی اسی نے سب سے پہلے شروع کیا۔ مینے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں جس کام کو شروع کرتا ہوں وہ پورا بھی ہو جائیگا۔ اسکا آغاز اور اختتام خدا تعالیٰ ہی کے فضل پر موقوف ہے۔ ہاں مجھے یہ افسوس ہی کہ آجتک حضرت مسیح موعودؑ کی وفات پر بیس سال گذرنے کو آئے ہم ایک مکمل لائف بھی شائع نہ کر سکے۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ اور نہ ہی اگر مجھے دوسرے دہندوں سے فرصت میسر آگئی ہوتی۔ تو کچھ مشکل نہ تھا۔ کہ میں آجتک اس کام کو خدا کے فضل سے ختم کر دیتا۔ باوجود ان مشکلات اور دوسری قسم کی مصروفیتوں کے سوانح مسیح موعود میں دو جلدیں اور آپکے شمائل و اخلاق میں تین جلدیں ابتک میں شائع کر چکا ہوں۔ اگر احباب اب بھی اس کام کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اور اس سلسلہ تصنیف کی پوری طرح سرپرستی فرمائیں۔ تو میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور توفیق سے ایک دو سال کے اندر یہ سلسلہ مکمل ہو جاوے۔ میں دراصل سیرۃ کا بہت سا حصہ میں مکمل کر چکا ہوں۔ حضرت مسیح موعودؑ کے مکتوبات کی سات جلدیں جدا شائع ہو چکی ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ تین جلدیں اور ہونگی۔ جنکو میں انشاء اللہ العزیز اگلے سال مکمل کر دینے کی امید رکھتا ہوں۔ شمائل و اخلاق کی ۴ جلدیں اور ہونگی۔ اور سوانح حیات کی دو جلدیں۔

مجھے افسوس ہے۔ کہ باوجودیکہ بہت تھوڑی تعداد میں یہ کتابیں چھپتی ہیں۔ پھر بھی بہت تھوڑی کاپیاں نکلتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کام جلد کیونکر پورا ہو۔ میں پانچسو ایسے احباب کو پکارتا ہوں۔ جو سیرۃ مسیح موعودؑ کی ہر جلد مطبع سے نکلتے ہی خرید لیا کریں۔ تاکہ اطمینان کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہ سکے۔ اب اس سلسلہ میں فروری ۱۹۲۸ء کے آخر میں انشاء اللہ نئی جلد کی اشاعت ہوگی۔ احباب درخواستیں بھیجدیں۔ مندرجہ ذیل جلدیں بغرض فروخت موجود ہیں۔

حیات النبی جلد اوّل عہ۔ حیات النبی جلد دوم عہ۔ شمائل و اخلاق جلد اوّل عہ۔ حصہ دوم عہ۔ حصہ سوم عہ۔ کل مجموعہ خریدار سے بشرطیکہ وہ تکمیل کتاب تک کیلئے خریدار ہو صرف چھ روپیہ علاوہ محصولڈاک۔

تمام درخواستیں خاکسار ابوالخیر محمود احمد (مجاہد مصری) ناظم انوار احمدیہ بکڈپو قادیان کے نام آنی چاہئیں

انوار احمدیہ بک ڈپو قادیان

دفتر الحکم کے ساتھ ایک بک ڈپو بھی عرصہ دراز سے قائم تھا۔ لیکن اب اس صیغہ کو کلیتہً دفتر الحکم و قادیان سے
علیحدہ کرکے حضرت والد صاحب قبلہ نے میرے سپرد کر دیا ہے۔ اور میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم پر بھروسہ کرکے الحکم
کے سرپرستوں اور احباب قدیم کی توجہ اور سرپرستی کی توقع کے ساتھ اس صیغہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کا تہیہ کیا ہے۔
میں نہیں جانتا کہ میری محنت اور سعی کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے کہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے ملتی ہے۔ اور اسی کے باب العزت پر
میں کھٹکھٹانا چاہتا ہوں۔ اس صیغہ میں کارخانہ الحکم کی تمام قدیم کتب کے علاوہ حضرت والد صاحب کی ناتمام اور جدید تالیفات
شائع کی جائینگی۔ اور اس دائرہ تالیف کا مرکزی نقطہ حضرت مسیح موعودؑ کی اچھوتی اور غیر مطبوعہ تحریریں، تقریریں آپ کے
مکتوبات۔ سیرۃ تاریخ سلسلہ اور اصحاب مسیح موعودؑ کی سیرۃ ہوگا۔

جان پدر شائع ہو چکی ہے۔ اور حیات ناصر جو اصحاب حضرت مسیح موعودؑ کے سلسلہ کا پہلا نمبر ہے شائع ہو رہا ہے۔ سیرۃ مسیح
موعودؑ کے شمائل و اخلاق کی تیسری جلد بھی شائع ہو چکی ہے۔ **مشاہدات عرفانی** کی جلد اول بھی خدا کے فضل سے شائع
ہو رہی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ تصانیف اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے جاری ہو چکا ہے۔ اگر احباب نے توجہ کی اور اس کی
سرپرستی کیلئے پانچسو معدود مخلص ایسے نکل آئے۔ جو ہر کتاب کی ایک یا ایک سے زیادہ جلدیں خرید لیا کریں۔ تو میں امید کرتا
ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک سال کے اندر اندر انوار احمدیہ بک ڈپو بہت سی ضروری اور لطیف تصانیف احمدی جماعت
کے لٹریچر میں اضافہ کر سکے گا۔ و باللہ التوفیق۔ **آئندہ جو کتابیں** زیر تالیف ہیں۔ مکتوبات احمدیہ جلد ہفتم جو چوہدری
رستم علی خانصاحب کے نام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مکتوبات معہ سوانح حیات چوہدری صاحب موصوف۔ مکتوبات احمدیہ جلد ہشتم حضرت حکیم الامۃ
رضی اللہ عنہ کے نام کے مکتوبات۔ (۳) اصحاب مسیح موعود علیہ السلام کا دوسرا نمبر۔

غرض یہ ایک مستقل صیغہ ہوگا۔ جو بزرگ پہلے سے دفتر الحکم کی کتابوں کے مستقل خریدار ہیں۔ انہیں یاد رہے کہ آئندہ
انکے نام ہر جدید کتاب بذریعہ وی پی دفتر انوار احمدیہ بک ڈپو سے ارسال ہوگی۔ اور ہر درخواست خریداری بنام خادم
کے نام ہو۔ اس اعلان کے ساتھ اور جان پدر کی اشاعت کے ساتھ میں جدید انتظام کے ماتحت آغاز کار کرتا
ہوں۔ اللہ تعالیٰ توفیق روزی کرے۔ آمین:-

خادم:- ابوالخیر محمود احمدؒ (مجاہد مصری)، ڈائرکٹر انوار احمدیہ بک ڈپو قادیان

محمود منزل الحکم سٹریٹ قادیان